ادبی صحافت

(آزادی کے بعد)

عبدالحئی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ادبی صحافت

(آزادی کے بعد)

عبدالحی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نام کتاب	:	ادبی صحافت : آزادی کے بعد
مصنف	:	عبدالحی
اشاعت	:	2014
تعداد	:	500
قیمت	:	...... روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	

ADABI SAHAFAT : AZADI KE BAAD
By : **Abdul Hai**

پیش لفظ

فہرست

- پہلا لفظ xi
- ہندوستان میں اردو کی ادبی صحافت 1
  - ادبی صحافت! تعارف و تاریخ 2
  - آغاز و ارتقا 6
    - دہلی اردو اخبار 7
  - دیگر اخبارات و رسائل 9
  - اردو کے اہم ادبی رسائل و جرائد (ابتدا سے 1900 تک) 18
    - خیرخواہِ ہند 19
    - قران السعدین 20
    - فوائد الناظرین 20
    - محبّ ہند 20
    - کریم الاخبار وگل رعنا 21
    - مفید ہند 21

- معیار الشعرا 21
- ہمائے بے بہا 21
- معلم العملہ 21
- خورشید پنجاب ومفید خلائق 22

❖ کچھ اہم رسائل 22

- انسٹی ٹیوٹ گزٹ، رسالہ تہذیب الاخلاق 23
- انجمن مناظرہ، مراسلہ کشمیر 24
- مرقع تہذیب 25

❖ کچھ اہم رسائل 25

❖ اردو کے اہم ادبی رسائل (1901 سے 1947 تک) 31

- مخزن 33
- زمانہ 34
- اردوئے معلیٰ 36
- عصمت 39
- فانوس خیال، معارف 40
- نگار، رسالہ اردو 41
- ہمایوں، رسالہ جامعہ 43
- نیرنگِ خیال 47
- بہارستان 48
- ساقی 49
- شاعر 50
- ندیم، ادبِ لطیف 62
- سب رس 63

- سہیل 68
- نن پرون (آجکل) 70
- سویرا 73
- ❖ کچھ اور اہم مجلّے 74

- ○ آزادی کے بعد اردو کے رسائل و جرائد (تحقیقی وتنقیدی جائزہ) 81
- ❖ آزادی کے بعد ہندستان کا بدلتا منظر نامہ 84
- ❖ اردو کے اہم رسائل و جرائد (1947 سے 2000 تک) 94
- آجکل 94
- رسالہ نوائے ادب 103
- ❖ دیگر اہم مجلّے 105
- کریسنٹ، شعلہ وشبنم 105
- کاروانِ ادب 106
- اردو ادب 106
- تحریک 119
- نیا دور 120
- سوغات 135
- فکر ونظر 137
- کتاب نما 139
- شیرازہ 155
- کتاب 157
- ماہنامہ کتاب کی کچھ اشاعتیں 160
- شب خون 162

- گفتگو 172
- شعر و حکمت 173
- عصری ادب 175
- فن اور شخصیت 177
- ادبی چوپال 177
- جواز، سہ ماہی معیار 178
- تناظر 180
- عصری آگہی 181
- نقد و نظر 182
- عالمی اردو ادب 183
- ایوانِ اردو 183
- تکمیل 188
- پیش رَو 189
- ذہنِ جدید 190
- فکر و تحقیق، اردو دنیا، بچوں کی دنیا 194
- پاپولر ادب (ڈائجسٹ) 196

❖ ہندوستان میں رسائل وجرائد کی ادبی حیثیت 197

○ اردو کے اہم رسائل و جرائد کا فنّی جائزہ 209

❖ اداریہ: تعریف و تاریخ 209

❖ اردو اداریوں کا ارتقا 214

❖ ادبی رسائل کی اداریہ نویسی 222

- شاعر 222

- سب رَس 235
- آجکل 238
- اردو ادب 249
- نیا دور 256
- کتاب نما 265
- شب خون 273
- ایوانِ اردو 277
- ذہنِ جدید 282

❖ ادبی رسائل کی خبریں 290

❖ ترتیب، تزئین و آرائش 297

❖ اشاعت کا وقفہ 299

○ عہد حاضر کے اہم رسائل و جرائد 305

❖ کچھ رسائل کے خصوصی نمبر 305

❖ اکیسویں صدی کے اہم رسائل و جرائد 308

- نعرۂ تکبیر، مژگاں 309
- مجلّہ اردو کونسل پمپری (چنچوڑ)، نقوش عالم، کل اور آج کے فن کار 310
- رنگ و بو، تحقیقاتِ اسلامی، اسباق، طوبیٰ، ادب ساز 311
- گل بوٹے، یوجنا اردو 312
- جہانِ کتب 313
- بزمِ ادب، جہانِ غالب، نئی کتاب 314
- جہانِ اردو، ترجمانِ اسمبلی، نوائے ادب 315
- ظرافت، ذکریٰ جدید، احوال و آثار 316

- شگوفہ 317
- امکان، شاندار 318
- کچھ اور اہم رسائل 319
- انشا 319
- ہندوستانی زبان، گلبن 322
- ترسیل، بین الاقوامی صدا، یہ صبح 323
- استعارہ 324
- مباحثہ 325
- سبق اردو 327
- ادبی رسائل کی ضرورت و اہمیت 328
- موضوع اور زبان 333
- ادبی قدر و قیمت 340

- مسائل و امکانات 349
- پریس ایکٹ اور ادبی صحافت 354
- ادبی صحافت کے امکانات 363
- حاصل مطالعہ 391
- ضمیمہ: (اردو کے اہم رسائل و جرائد: آغاز سے موجودہ دور تک) 397
- کتابیات 407

پہلا لفظ

ایک مہذب معاشرے کو بہتر اور بے مثال بنانے میں صحافت کا اہم رول ہوتا ہے۔ ہم بھلے ہی بدلتے وقت اور عصری تقاضوں کے مدنظر نئی دریافتوں اور ایجادات کو اپنائیں لیکن ماضی کی اعلیٰ و ارفع صحافتی روایات کا بھی پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے پاس ماضی کا ایسا قیمتی سرمایہ موجود ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔صحافت کی دنیا میں ہم بھلے ہی نت نئی ترقیوں سے ہم آہنگ ہوں لیکن ہماری صحافت کو ماضی کی عظیم روایات کا پاسدار ہونا بھی ضروری ہے۔صحافت کی تاریخ گواہ رہی ہے کہ ہمارے اسلاف نے اپنی بے مثال صحافتی اقدار و روایات سے علم و ادب کے گہواروں کو روشن کیا ہے۔ موجودہ صحافت کی روشن خیالی ماضی کی صحافتی فکر کی ہی مرہون منت ہے۔ ملک کی تقسیم اور ہندوستان کی آزادی سے قبل اردو صحافت کو مولوی محمد باقر، سرسید احمد خاں، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر،مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسی قابل قدر علمی و ادبی شخصیات نے آگہی بخشی۔ملک کی آزادی کے بعد حیات اللہ انصاری، مولانا عبدالوحید صدیقی، عشرت علی صدیقی،عبدالحمید انصاری،خواجہ احمد عباس،مولانا محمد عثمان فارقلیط،محمد عتیق صدیقی اور موہن چراغی جیسے صحافیوں نے اردو صحافت کو نئی بلندیوں سے روشناس کرایا۔

صحافت کو ایک عظیم اور مقدس پیشہ کہا گیا ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اس زمین پر ابتدائے آفرینش سے ہی ترسیل و ابلاغ کے نقوش ملنے شروع ہوجاتے ہیں۔ ترسیل و ابلاغ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی ہوتی گئی اور یہ کئی حصوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔صحافت ترسیل و ابلاغ کا ایک اہم جز ہے۔ صحافت نے تعلیمی، مذہبی، ادبی، اصلاحی، سماجی، سیاسی، معاشرتی، صنعتی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر خدمات انجام دی ہے۔ بالخصوص اردو صحافت نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور ہندوستان کی آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے۔اردوصحافت نے آغاز سے ہی رائے عامہ کو ہموار کرنے، عوام کو ایک نئی فکر دینے اور ملک کی سیاست کا رخ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں اخباری صحافت کے ساتھ ساتھ اردو رسائل کا بھی اہم رول رہا ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادبی تحریکات کو جلا بخشنے میں اردو رسائل کی خدمات سے انکارنہیں کیا جاسکتا ہے۔علی گڑھ تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کو کامیاب بنانے اور ان تحریکوں کی ایک سمت متعین کرنے میں اردو کے رسائل ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی سے 1947 تک ملک کے مختلف حصوں سے سیکڑوں کی تعداد میں رسائل جاری ہوئے جن میں خالص ادبی رسالوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایسے رسالے بھی شائع کیے گئے جن میں علمی، سیاسی، معاشی، تہذیبی، تاریخی، صنعتی، طبی، تفریحی، سائنسی، تجارتی اور زراعتی معاملات و مسائل پر بھی خصوصی توجہ دی گئی اور ان موضوعات پر اعلیٰ درجے کے مضامین شائع ہوئے۔ان کے علاوہ کچھ رسائل ایسے تھے جن میں خبروں کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ کو موضوع بنایا گیا۔کچھ رسائل کو خصوصاً اصلاحی اور دعوتی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا گیا۔

صحافت کا پیشہ آج بھلے ہی تعریف وتحسین کا ذریعہ اور ایک منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کر گیا ہو لیکن اپنے ابتدائی دور اور بیسویں صدی کے آغاز میں پوری طرح گھاٹے کا سودا رہا ہے۔صحافیوں کو ہمیشہ عوام کے ایک طبقے کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا ہے۔

ان سب کے باوجود اردو کے جیالے ادیبوں و قلمکاروں نے اردو زبان و ادب اور صحافت کو نیا افق مہیا کرانے اور اردو جاننے والوں کی اصلاح اور ان کی تعلیم کے مقصد کو سامنے رکھ کر نئے اخبارات و رسائل جاری کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

اردو رسائل نے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے، سماجی اصلاح کرنے، علمی تحریکوں کو رفتار عطا کرنے اور عوام میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کی سعی کی۔ رسائل کی بدولت لوگوں میں تعلیم سے دلچسپی بڑھی۔علمی بحث و مباحثے کا ایک دور شروع ہوا۔ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ جدید رجحانات نے عوام میں جگہ بنانی شروع کی۔

ہندوستان کی آزادی سے قبل ہی ملک کی صورتحال دگرگوں ہونے لگی تھی۔ انگریزی سامراج نے اپنا تخت بچانے کے لیے عوام میں نفرت کا بیج بو دیا تھا، جس کے نتیجے میں ملک میں فسادات اور نظریاتی کشمکش کا دور شروع ہوگیا۔ آزادی کے ساتھ ساتھ ملک کی تقسیم بھی ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔ اس نے جہاں اردو صحافت کو ایک بڑا صدمہ پہنچایا وہیں ادیبوں کو لکھنے کے لیے ایک بڑا موضوع بھی مل گیا۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد مغربی ادب کی تقلید اور مغربی قدروں کو اپنانے میں بھی اردو کے ادیب پیش پیش رہے۔ادب میں عقلیت پسندی، فلسفے اور سائنسی رجحان کا دور شروع ہوا اور بہت ساری نئی اصناف مثلاً رپورتاژ، آزاد نظم، سانیٹ، انشائیہ، ناولٹ وغیرہ ادب میں باضابطہ طور سے شامل کر لی گئیں۔ مغربی ادب کی پیروی نے جہاں نئی اصناف کے لیے در وا کیے وہیں نئی ادبی تحریکات و نئے موضوعات بھی ادب کا حصہ بننے لگے۔ادب کی ان نئی تحریکوں کو پروان چڑھانے کے لیے ایسے رسائل کی ضرورت تھی جو اس نئے ادبی منظرنامے کو قبول کر سکیں اور عوام کی رائے کو ایک نیا رخ دے سکیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں ان تحریکوں اور رجحانات کو ایک نئی سمت دینے کے لیے ہی بڑی تعداد میں نئے رسائل جاری ہوئے جن میں زبان، مخزن، عصمت، ادیب، ساقی، کلیم، اردو، چمنستان، زمانہ، شاعر، سب رس اور آجکل کا نام لیا جاسکتا ہے۔ان رسائل میں اردو ادب کی تمام اصناف کا احاطہ کیا گیا اور سرکردہ ادیبوں و شاعروں کی اعلیٰ پایے کی تحریریں شائع کی گئیں جنھوں نے ہندوستان میں زبان و ادب کی

تعمیر و ترقی کے ساتھ ساتھ ایک نیا شعور عطا کیا۔ جن کی اہمیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

1947 کے بعد کی صحافت اس معنیٰ میں اہمیت کی حامل ہے کہ اس دور کی صحافت جدید تقاضوں اور عصری ضروریات سے روشناس ہوئی۔ اردو صحافت میں خصوصاً ملک کی دوسری زبانوں کی صحافت کی طرح نئے نئے تجربات کیے گئے۔ 15اگست 1947 کو ملک کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم ہونا پڑا۔تقسیم کے نتیجے میں دونوں ملکوں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو ترک وطن کر کے اِدھر سے اُدھر جانا پڑا۔ جس کے سبب اخبارات کا بھی تبادلہ ہوا۔ آزادی کے بعد ادبی صحافت نے ایک نئی کروٹ لی اور عصری موضوعات سے متعلق جریدوں کی شروعات کی گئی۔

اردو کی ادبی صحافت میں نئے نئے تجربات بھی ہو رہے ہیں۔ ادبی رسائل کے علاوہ عصری، سیاسی اور سماجی رسائل کی بھی بڑی تعداد ہے جن میں افکار ملی، عالمی سہارا، دی سنڈے انڈین، صداقت، گواہ، نئی دنیا وغیرہ اہم ہیں۔ ان رسائل میں رنگین تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں اور خبروں کے تفصیلی تجزیے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ رسائل کی صحافت اس معاملے میں بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اخبارات پڑھنے والے لوگ تو رسائل پڑھتے ہی ہیں ساتھ ہی رسائل کے قارئین کا اپنا الگ حلقہ بھی ہے۔ رسائل میں شامل کیے جانے والے مضامین میں قارئین کی پسند کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور باضابطہ ایک کالم آپ کے خطوط یا قارئین کا ردعمل کے عنوان سے ہوتا ہے جس میں قارئین اس رسالے کے تعلق سے اپنی دلچسپی، پسند ناپسند کا اظہار کرتے ہیں۔ موجودہ دور رسائل و جرائد کی صحافت کا زریں دور ہے۔

اردو کی ادبی صحافت اردو کی اخباری صحافت کی طرح ہی قابل قدر اور اہم ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ کے تعلق سے کئی کتابیں نظر آتی ہیں۔ ان کتابوں میں ادبی صحافت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور رسائل و جرائد کا ذکر بھی ملتا ہے۔لیکن یہ کتابیں1947 تک کی صحافت کا مطالعہ پیش کرتی ہیں اور ان میں بھی رسائل کی صحافت کے تعلق سے کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ان میں ایک اہم کتاب مولانا امداد صابری کی 'تاریخ صحافت اردو' ہے جو پانچ

جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ 'ہندوستانی اخبارنویسی، کمپنی کے عہد میں' 1857 تک کی صحافت پر مبنی ہے۔ نادر علی خاں کی کتاب 'اردو صحافت کی تاریخ' میں 1947 سے پہلے تک کے اخبارات اور رسائل کا ذکر ملتا ہے۔ عبدالسلام خورشید کی کتاب 'صحافت پاکستان و ہند' میں 1947 سے پہلے تک کی ادبی صحافت پر مختصر گفتگو کی گئی ہے۔ روشن آرا راؤ کی 'مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل' میں پاکستان میں مجلّاتی صحافت کو درپیش مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 1947 کے بعد ادبی صحافت اور رسائل کی صحافت کے تعلق سے کوئی کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ محمد شعیب رضا خان کی کتاب 'آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ' میں صرف دہلی سے جاری ہونے والے رسائل و جرائد کا ذکر موجود ہے۔

اردو کے اہم ادیبوں اور شاعروں کو رسائل نے ایک زمین مہیا کی اور ان کی نگارشات شامل اشاعت ہوکر لوگوں تک پہنچی۔ ابھی تک اردو صحافت کے تعلق سے جو کام ہوئے ہیں وہ زیادہ تر اس کی تاریخ پر ہوئے ہیں اور ان میں بھی 1947 کے بعد کی صحافت کا ذکر نہیں ہے خصوصاً ادبی صحافت کا گوشہ بالکل تشنہ ہے۔ اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے اپنی اس کتاب میں یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ ادبی صحافت بالخصوص رسائل و جرائد کی صحافت کا اس وقت کیا معیار تھا اور موجودہ دور میں اس سمت میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ادبی صحافت کے موضوعات کیا رہے ہیں، ان سے ادب اور زبان کو کیا فائدہ پہنچا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر سیاسی، سماجی اور اقتصادی موضوعات پر بھی مضامین شائع ہوئے ہیں اور ان کی سماجی افادیت، گیٹ اپ اور اشاعت وغیرہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو کی ادبی صحافت میں کی گئی تبدیلیوں، ادب وصحافت میں رسائل کا مقام، رسائل میں عصری تقاضوں کی عکاسی بھی اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔ اردو کے اہم رسائل وجرائد نے اردو صحافت کی تعمیر وترقی میں مثبت کردار ادا کیا اور ان رسائل وجرائد کا ادب وصحافت کے فروغ میں اہم حصہ رہا ہے۔ اردو کی ادبی صحافت بھی اخباری صحافت کی طرح ہی قابل قدر اور اہم ہے۔ یہ تصنیف آزادی کے بعد کی ادبی صحافت خصوصاً رسائل کی

صحافت پر محیط ہے اور اس میں پورے ہندستان سے نکلنے والے نمائندہ رسالوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ممکن ہے کچھ اہم رسائل کا تذکرہ رہ گیا ہو۔طوالت کے خوف سے میں نے منتخب رسائل کو ہی موضوع بحث بنایا ہے۔ کتاب کی تیاری میں بنیادی طور پر رسائل کی مختلف فائلوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

موضوع گرچہ کافی وسیع تھا تاہم اس کے باوجود میں نے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ رسائل و جرائد کی صحافت کے آغاز و ارتقا سے لے کر ان کی خدمات اور زبان و ادب پر پڑنے والے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اہم رسائل کی تاریخ اور اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے رسائل کی تفصیلات پر روشنی ڈالی ہے۔میں نے اس کتاب کی تکمیل کے لیے رسائل کی زیادہ سے زیادہ فائلوں تک رسائی کی کوشش کی اور ان کے مدیروں سے ملاقاتیں اور ان سے تفصیلی گفتگو کی۔ ہزار کوششوں کے باوجود بہت ساری فائلوں تک میری رسائی نہیں ہوسکی۔تاہم جتنی بھی فائلیں مجھے دستیاب ہوسکیں، میں نے ان کو سامنے رکھ کر یہ تحقیقی کام انجام دیا ہے۔مجھے اپنی کم مائیگی کا اعتراف ہے کہ اس پر جتنی محنت کرنی چاہیے تھی وہ میں نہیں کرسکا۔ابھی بھی اس موضوع پر مزید تحقیق کی گنجائش رہ جاتی ہے۔

کتاب کی تیاری میں پروفیسر محمد شاہد حسین کے قیمتی مشوروں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ موصوف نے اپنے وسیع علمی تجربے سے ضروری نکات پر روشنی ڈالی اور کتاب سے متعلق مختلف موضوعات پر میرا مطمح نظر واضح کرنے میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ان کی شفقتوں اور عنایتوں کے لیے میں ان کا سپاس گزار ہوں۔ پروفیسر انوار عالم پاشا، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر مظہر مہدی اور ڈاکٹر آصف زہری کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مختلف اوقات میں مجھے اس کتاب کے تعلق سے مفید مشوروں سے نوازا۔ میرے تحقیقی ذوق و شوق کو پروان چڑھانے میں پروفیسر شہزاد انجم کا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی اور اہم مواد بھی فراہم کیے۔ ان کی حوصلہ افزائی نے مجھے اس کتاب کو جلد پورا کرنے کی توانائی بخشی۔

میں برادرم ڈاکٹر غضنفر اقبال صاحب (گلبرگہ) کا صمیم قلب سے شکریہ ادا نہ کروں تو

ناسپاسی ہوگی۔ انھوں نے میرے لیے کافی مواد اکٹھا کیے اور مدیر 'شاعر' افتخار امام صدیقی سے اس کتاب کے متعلق تفصیلی گفتگو کی اور مجھے 'شاعر' کی فائلیں مہیا کروائیں۔ محبی اطہر مسعود خاں (رامپور) کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔انھوں نے مجھے کئی نادر و نایاب فائلیں بھیجیں اور مدیر 'نیا دور' سے میرا تعارف بھی کروایا۔ ہر قدم پر ان کی حوصلہ افزائی میرے شامل حال رہی ہے۔

سابق مدیر 'آجکل' خورشید اکرم اورعابد کرہانی، سابق مدیر 'کتاب نما' شاہد علی خاں، مدیر 'ذہن جدید'، زبیر رضوی، مدیر 'اردو بک ریویو' عارف اقبال صاحب، ڈاکٹر فاروق احمد 'این سی ای آر ٹی' سید احمد قادری 'مرزا غالب کالج، گیا'، ڈاکٹر شاہد اختر 'گیا'، جناب سہیل انجم (دہلی) نے مجھے رسائل کی فائلیں مہیا کرانے میں خصوصی تعاون دیا اور اہم نکات واضح کیے۔ مدیر 'نیا دور' ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی صاحب کا میں از حد مشکور ہوں، انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے مجھے نیا دور کے کئی اہم خصوصی نمبرات عطا کیے اوراپنی رہائش گاہ پر مجھ سے تفصیلی گفتگو کے لیے وقت نکالا۔ سید خالد احمد، سب ایڈیٹر 'نیا دور' نے بھی قیمتی مشورے دیے۔ امین اختر فاروقی نے شب خون کے شروعاتی دور کے تمام شمارے مہیا کرائے اور شمس الرحمٰن فاروقی کی ذاتی لائبریری سے استفادے کا موقع فراہم کیا۔ ڈاکٹر سید شمیم احمد گوہر، سجادہ نشیں خانقاہ ابو العلائیہ (الہ آباد) نے قیمتی وقت عطا کیا اور شمس الرحمٰن فاروقی کی رہائش گاہ تک میری رہنمائی کی۔ ڈاکٹر شعیب رضا وارثی نے بھی میرے موضوع کے حوالے سے کافی تفصیلی گفتگو کی۔

اپنے والدین کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھے ہر طرح کی ذمے داریوں سے آزاد رکھا اور میرے لیے ہر لمحہ خلوص و محبت کا پیکر بنے رہے۔ میری امی میری کامیابی کا خواب دیکھتے دیکھتے اللہ کو پیاری ہوگئیں اور آخری لمحات میں بھی اپنی خدمت اور تیمارداری کا موقع نہیں دیا۔ یہ کتاب ان ہی کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ اللہ ان کی لحد پر شبنم افشانی اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین) میرے والد صاحب نے ہر ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور میری ہر جائز ضرورتوں کو پورا کیا اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

میری یہ کتاب جب تکمیل کے آخری مراحل میں تھی اور پریس میں جانے والی تھی تو مجھے اچانک ایک اندوہناک حادثے سے گزرنا پڑا۔ میرے والد محترم حافظ محمد یٰسین خاں مختصر علالت کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ماں کے بعد والد کا شفقت بھرا سایہ اٹھ جانا کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے اس سے ہم سبھی واقف ہیں۔ میں کئی دنوں تک غم سے نڈھال بے شمار یادوں کو سینے سے لگائے خاموشی سے آنسو بہاتا رہا اور رب العالمین کی بارگاہ میں ان کے لیے مغفرت کی دعائیں کرتا رہا۔ اللہ ہمیشہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی صبر آتا گیا اور میں اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ کتاب پریس کو جائے اور میں اس کی آخری تیاری میں جٹ گیا۔ اس موقعے پر مجھے اپنی والدہ کے ساتھ ساتھ اپنے والد محترم کی بے حد یاد آرہی ہے۔ میری اس کتاب کو شائع شدہ حالت میں دیکھ کر وہ کس قدر خوش ہوتے مجھے اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ والدہ اور والد کی قبروں کو نور سے بھر دے اور ان کی مغفرت فرمائے، بس یہی میری دعا ہے۔

اس موقعے پر بہن عارفہ تبسم اور بہنوئی احسان احمد کا بھی شکریہ واجب ہے کہ ان دونوں نے میرے کئی کاموں کو انجام دیا اور ہر پریشانی اور مشکل وقت میں پوری طرح ساتھ دیا۔ پیاری بھانجیوں حرا اور سماویہ کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں نکلتی ہیں کہ ان کی کلکاریوں اور شوخیوں نے میرے بوجھل لمحات میں اکسیر کا کام کیا۔ اہلیہ خوشبو زیب کا شکریہ بھی واجب ہے کہ انھوں نے مجھے اس کام کو انجام تک پہنچانے میں ہر ممکن مدد دی۔

اس سلسلے میں کچھ اہم نام پاکستان کے عزیز کرم فرماؤں کے بھی ہیں جن میں محترمہ سماویہ طاہر، محترمہ اقرا سعید، محترمہ مریم جبیں اور محترم ڈاکٹر غلام عباس صاحب خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے مختلف اوقات میں مجھے تعاون دیا اور کتاب کو پورا کرنے کی ترغیب دی۔

ان کے علاوہ دوستوں و ہمنواؤں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے مجھے کتاب کی تکمیل میں تعاون دیا ہے۔ ان میں حافظ محمد عمران، انور احمد، خالد رضا خاں، شاہجہاں، ڈاکٹر محمد امان اللہ، محمد فاروق، جاوید اختر، محفوظ الرحمٰن، امتیاز عالم، ڈاکٹر ہادی سرمدی،

ڈاکٹر احمد کفیل، ڈاکٹر مخمور صدری، مشکور عالم خاں، ڈاکٹر محمد نثار الدین، عارف محمد خاں، محمد جسیم الدین، محمد انصر، ارشد جمال، ڈاکٹر مظہر حسنین وغیرہ نے مجھے مواد کی فراہمی اور کتاب کی تکمیل میں ہر ممکن مدد دی۔ ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی نے کتاب کا فائنل پروف دیکھا اور کئی اہم مشورے بھی دیے، ان کا بے حد شکرگزار ہوں۔ میری آڑی ترچھی تحریروں کو برادرم تعمیر حسین نے کمپوز کرکے خوبصورت بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا شکریہ بھی واجب ہے۔ کتاب کی تکمیل کے آخری مراحل میں جناب محمد اکرام نے تکنیکی طور پر کافی مدد فراہم کی، جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں!

کتاب کی تکمیل میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد کی لائبریریوں سے خصوصی مدد لی گئی۔ اردو اکادمی دہلی کی لائبریری، دہلی پبلک لائبریری، انجمن ترقی اردو کی لائبریری سے مجھے رسائل کی کافی فائلیں دستیاب ہوئیں۔ ان کے علاوہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، نظام ٹرسٹ اردو لائبریری، ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) کی لائبریریوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ رضا لائبریری رامپور، خدابخش لائبریری پٹنہ اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ سے رسائل کی کچھ اہم فائلیں حاصل ہوئیں۔ ان لائبریریوں کے عہدیداران اور کارکنان کا بے حد مشکور وممنون ہوں۔

عبدالحی

ہندوستان میں اردو کی ادبی صحافت

صحافت آغاز سے ہی انسان کی بنیادی ضرورتوں میں شامل رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ صحافت کا دائرہ کافی وسیع ہوتا گیا۔ آج معاشرے کو بہتر بنانے میں صحافت کا اہم کردار رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ صحافت کے زمرے میں ماہنامے، پندرہ روزہ، ہفتہ وار اور روزناموں کے علاوہ گلدستے یا نوٹس یا اس قسم کی دوسری تحریریں شامل کی جاسکتی ہیں۔ لیکن آج کے ارتقائی دور میں صحافت کی حدود کافی وسیع ہو چکی ہیں اور اس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے ذرائع ابلاغ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ صحافت نے ہر عہد میں معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ حکومت اور عوام کے درمیان ایک رابطے کا کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے اس کا ایک تہذیبی رشتہ جڑا رہا ہے جو ہمیشہ سے مضبوط رہا ہے۔ مطبوعہ صحافت کے شروع ہونے سے قبل مختلف قسم کے صحافتی طریقے اور قلمی پیغامات بھیجنے کے ذرائع مروّج رہے۔ سب سے پہلے چین میں کاغذ کی ایجاد ہوئی اور چین میں ہی پہلی مطبوعہ کتاب منظر عام پر آئی۔ جیسا کہ عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

> چین کے صوبہ کانسو میں دنیا کی قدیم ترین کتاب دریافت ہوئی۔ اس میں

لکھا تھا کہ اس کتاب کو وانگ چی لانے 11 مئی868 کو مفت تقسیم کرنے
کے لیے چھاپا تھا۔ تا کہ اس کے والدین کی یاد کو دوام ہو۔ (1)

چین کے بعد دوسرے ملکوں میں بھی باضابطہ صحافت کا آغاز ہوا۔ سولھویں صدی میں انگلینڈ میں صحافت کی شروعات ہوئی اور وہاں لندن ڈیلی کورانٹ کے نام سے ایک اخبار شروع کیا گیا۔ انگلینڈ کے بعد جرمنی اور پھر امریکہ میں صحافت کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں صحافت کی شروعات اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ بنگال گزٹ، انڈین گزٹ اور بمبئی ہیرالڈ ایک کے بعد ایک اُسی دور میں شروع ہوئے تھے۔ فارسی کے بعد اردو میں بھی صحافت کا آغاز ہوا اور بہت جلد اردو صحافت نے بھی ایک مستقل صنف کے طور پر خود کو منوا لیا۔ اردو میں صحافت کا آغاز 1822 میں ہوا اور سب سے پہلے جام جہاں نما کے نام سے ایک اخبار منظر عام پر آیا۔ اور بعد میں یکے بعد دیگرے کئی اخبارات جاری ہوئے اور آج اردو صحافت ملک کے طول و عرض میں اپنی کامیابی کا علم بلند کیا ہے اور ترقی کی راہ پر رواں دواں ہے۔

ادبی صحافت! تعارف و تاریخ

اردو صحافت کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اخبارات ورسائل نے اپنی خبروں، مضامین اور اداریوں سے صحافت کو ایک نئی سمت دی اور اردو صحافت بھی دوسری زبانوں کی صحافت کی طرح کامیابی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ جس طرح اخبارات نے اردو صحافت کو شہرت دوام دلوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اُسی طرح رسائل نے اردو صحافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ صحافت کے فنی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اردو صحافت کی اہم خصوصیات کو اجاگر کیا اور لوگ بڑی تعداد میں اردو زبان اور ادب سے واقف ہوئے۔ اخبارات کا بنیادی کام حالات حاضرہ سے لوگوں کو واقف کرانا ہوتا ہے۔ روز مرّہ کی خبریں پہنچانا ہوتا ہے۔ دنیا کے طول و عرض میں ہونے والی اُتھل پُتھل کو سماج اور عوام الناس تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اخبارات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں

خبریں ہوتی ہیں اداریے ہوتے ہیں، کچھ کالم ہوتے ہیں، تجزیے یا دوسری دلچسپی کی چیزیں بہت کم ہوتی ہیں۔ جبکہ رسائل میں تجزیاتی مضامین یا زندگی سے جڑے دوسرے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

مجلّہ یا رسالہ ایک مقررہ مدت یا وقفے کے بعد شائع ہونے والے مجموعے کو کہیں گے۔ یہ شائع شدہ اوراق کی ایسی قسم ہے جو وقفے وقفے سے شائع ہوتی ہے۔ رسالہ یا مجلّہ ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہانہ، سہ ماہی، شش ماہی یا سالانہ بھی ہوسکتا ہے۔ اخبار اور رسائل یا مجلّے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اخبارات میں خبروں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے لوگوں کو واقف کرایا جاتا ہے۔ اخبارات کا مقصد موجودہ منظر نامے پر روشنی ڈالنا ہوتا ہے۔ جبکہ رسائل میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ اس میں مختلف ادبی، سماجی، سیاسی و معاشی مواد کو شامل کیا جاتا ہے۔ یہ مضامین نہ صرف وقتی دلچسپی سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان کا مقصد معاشرے کو، قارئین کو مختلف موضوعات کے تعلق سے تفصیلی معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ رسائل عوام کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی پر اثر ڈالتے ہیں۔ رسائل کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ رسائل و جرائد میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو الفاظ کا روپ دے کر پیش کیا جاتا ہے۔ رسائل میں علاقائی یا مقامی سطح کی باتوں پر کم زور دیا جاتا ہے اور قومی سطح کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ رسائل کی تعریف کرتے ہوئے معروف محقق و نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں :

> رسالہ یا جریدہ آج کل یہ دونوں لفظ اس اعتبار سے ہم معنی ہیں کہ دونوں سے ہم ایسا اخبار یا کتاب مراد لیتے ہیں جس میں مختلف اصناف پر مبنی تحریریں ہوں اور جو کسی مقررہ وقفے سے نکلتا ہو۔ جریدہ اب ذرا کم سنائی دیتا ہے۔ رسالہ کے اور بھی معنی ہیں۔ مثلاً فوجیوں کا دستہ یا کوئی مختصر کتاب جو ایک ہی موضوع پر ہو۔ جریدہ کے اصل معنی تنہا ہیں۔ چونکہ اخبار یا رسالہ کا بھی ایک ایک شمارہ مقررہ وقت پر نکلتا ہے اس لیے رسالہ سے اخبار کے معنی بھی پیدا ہوگئے۔ جریدہ بہ معنی تنہا اب بہت کم سننے میں

> آتا ہے۔صفحہ کے معنی میں اورفوجی دستہ کے معنی میں بھی جریدہ پہلے بولا جاتا تھا۔ اب جریدہ عالم کی ایک ترکیب (غالبًا حافظ کے ایک شعر کی وجہ سے)ہی مستعمل نظرآتی ہے۔ اکیلے جریدہ بمعنی صفحہ شاذ ہے اوربمعنی فوجی دستہ بالکل مستعمل نہیں۔ (2)

جناب فاروقی صاحب کی مندرجہ بالا تعریف سے رسالے کی جوتعریف سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رسالہ یا جریدہ ایک ایسی کتاب یا اخبار ہے جس میں کسی بھی زبان کی مختلف اصناف پرمبنی تحریروں کومقررہ مدت کے وقفے سے شائع کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ کبھی کبھی کسی ایک موضوع پربھی کوئی رسالہ شائع کیا جاسکتا ہے۔

رسائل عام طور سے ہفتے میں ایک بار سے زیادہ شائع نہیں ہوتے۔ اگر ہم سرسری نگاہ سے دیکھیں تو ہمیں ماہانہ رسائل زیادہ نظرآئیں گے، جہاں اخبارات میں کم سے کم سطور کے ذریعے لوگوں تک حالات و واقعات کی خبریں پہنچا دی جاتی ہیں وہیں رسائل یا جرائد کے پاس کافی وقت ہوتا ہے اور یہ کسی بھی موضوع پرتفصیلی معلومات مہیا کراتے ہیں۔

رسائل و جرائد مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔انھیں موضوعات کے مطابق تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً خبری رسالے، ادبی رسالے، کاروباری رسالے، سائنسی رسالے، سیاسی رسالے، ڈائجسٹ، باتصویر رسالے، خواتین کے رسالے، بچوں کے رسالے، کیریئر سے متعلق جرائد، اصلاحی رسالے یا مذہبی رسالے۔ رسائل کی ان اقسام سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسائل مختلف موضوعات سے متعلق ہوتے ہیں اور ان میں تفریح طبع کا سامان ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ رسائل عوام کوخبروں اور حالات سے آگاہ کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں لیکن خبروں کے ساتھ ساتھ ان کی توجیہ، ان کی تفصیلات اور اس موضوع کے تمام نکات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اورتفصیلی طور پر اُس موضوع کا مکمل احاطہ کیا جاتا ہے۔ مجلّاتی صحافت یا رسائل کی صحافت پرمحترمہ روشن آرا راؤ کی اس بات سے صد فیصد اتفاق کیا جاسکتا ہے۔وہ اپنی کتاب مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل میں لکھتی ہیں:

> مجلّاتی صحافت حالات و واقعات اورنظریات کی بنیاد پر زندگی کے مختلف

> پہلو پیش کرتی ہے۔ سوچ کے خوبصورت دھاروں کو خوبصورت لفظوں میں ڈھال کر مجلّات کی زینت بنا دیاجاتا ہے۔ وہ کبھی نثری شہ پاروں کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی نظم کے پیرائے میں ڈھل کر ماضی، حال اور مستقبل کو سمیٹ لیتے ہیں۔ جریدہ قارئین کی تربیت کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ واقعات کے پس منظر اور پیش منظر سے بھی آشنا کرتا ہے۔ تفریح فراہم کرنا بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے۔ کیونکہ ہفت روزہ، پندرہ روزہ، یا ماہوار رسالوں کے پاس حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے اور ان کے اثرات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے وقت بھی ہوتا ہے پیرا یہ بیان بھی اور اسلوب بھی۔(3)

روشن آرا راؤ کی اس بات سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ مجلّات یا رسائل کو آرام و اطمینان کے ساتھ قارئین کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رسائل میں تمام اصناف کو جگہ دی جاتی ہے۔ رسائل و جرائد کے تعلق سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس کے مضامین او ر اس کی تحریروں کو کبھی بھی پڑھا جا سکتا ہے اور یہ معلومات کا ایک بہترین ذریعہ ہوتے ہیں جبکہ اخبارات میں ایسا نہیں ہے اور اخبارات کی خبریں زیادہ تر وقتی دلچسپی کی خاطر ہوتی ہیں اور کچھ وقت گزرنے کے بعد انھیں پڑھنے میں وہ دلچسپی باقی نہیں رہتی جو شروع میں ہوتی ہے۔ جس طرح اخبارات ملک کے حالات پر اپنے تجزیے پیش کرتے رہتے ہیں اسی طرح مجلّات ورسائل مختلف معاملات ومسائل اور ملکی وغیر ملکی حالات پر تفصیلی مضامین اور موضوع کے تعلق سے سبھی نکات کو شائع کر کے قارئین کو سیراب کرتے ہیں۔

اردو صحافت کی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اخبارات ورسائل نے اپنے مضامین، اداریوں اور خبروں سے صحافت کو ایک نئی سمت دی اور اردو صحافت بھی ہندوستان میں دوسری زبانوں کی صحافت کے مد مقابل سر اٹھا کر کھڑی ہوئی۔ اردو صحافت کی ترقی میں جہاں اخبارات نے اہم رول ادا کیا وہیں اردو رسائل اور مجلّات کی کوششوں کو

بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اخبارات کا بنیادی کام حالات حاضرہ سے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے وہیں مجلّات یا رسائل میں تجزیاتی مضامین یا زندگی سے جڑے دوسرے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

اردو صحافت کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے تمام بڑے مصنّفین نے اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ بھی پیش کی ہے۔ اردو صحافت میں جہاں اخبارات کا ذکر ہوتا ہے وہیں مجلّات ورسائل کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مجلّات میں قومی اور بین الاقوامی سطح کے مضامین شائع ہوتے ہیں جبکہ اخبارات میں ان موضوعات پر چھوٹی چھوٹی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اردو کی مجلّاتی صحافت کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ زندگی کے تقریباً سبھی موضوعات سے متعلق رسائل موجود ہیں اور شروعاتی دور سے ہی مختلف موضوعات پر رسائل شائع ہوتے رہے ہیں۔

آغاز وارتقا

ہندوستان میں اردو کا سب سے پہلا اخبار جامِ جہاں نما ہے جو 27 مارچ 1822 سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس اخبار کے لیے درخواست دینے والے ہری ہردت تھے اور منشی لالہ سدا سکھ اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور کلکتہ کے سرکلر روڈ سے ہر بدھ کو شائع ہوتا تھا۔ جامِ جہاں نما کے بعد کلکتہ سے ہی شمس الاخبار کے نام سے ایک اخبار جاری ہوا۔ اس کے جاری ہونے کی تاریخ مئی 1823 تھی۔ یہ اخبار بھی ہفتہ وار تھا۔ 1833 میں آگرہ سے آگرہ اخبار شروع ہوا جو اس دور کا کافی اہم اخبار تھا۔ بعد میں اس کا نام بدل کر زبدۃ الاخبار کر دیا گیا۔ اسی دور میں کلکتہ سے آئینہ سکندری شروع ہوا تھا۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا۔ اور ہر پیر کو چھپتا تھا۔ کلکتہ سے ہی ماہ عالم افروز کے نام سے ایک اخبار 23 مارچ 1833 سے شروع کیا گیا۔ لدھیانہ سے دسمبر 1834 کو لدھیانہ اخبار کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کی شروعات ہوئی۔ کلکتہ سے سلطان الاخبار کے نام سے 2اگست 1835 کو ایک اخبار شروع ہوا۔ یہ ہفتہ وار تھا اور ہر اتوار کو شائع ہوتا تھا۔ کلکتہ سے

ہی مہرِ منیر کے نام سے محلّہ کلنگہ سنہری باغ سے یکم مئی 1841 کو ایک اخبار شائع ہونا شروع ہوا جو ہفتے میں تین بار نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر محمد علی تھے۔ مرۃ الاخبار کے نام سے کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار 1847 میں منظرِ عام پر آیا۔ کلکتہ سے ہی یکم فروری 1851 کو گلشنِ نو بہار کے نام سے ایک اخبار شروع ہوا تھا۔ دہلی سے سید الاخبار کے نام سے ایک اخبار 1837 میں شروع ہوا جو ہفتہ وار تھا۔ اسے شروع کرنے والے سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں تھے۔ یہ اخبار مطبع سید الاخبار سے چھپتا تھا۔ اس اخبار کا نام سید محمد خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کے نام کی مناسبت سے رکھا تھا۔ سر سید احمد خاں کے ابتدائی مضامین بھی اسی اخبار میں شائع ہوئے تھے۔ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن بھی مطبع سید الاخبار سے ہی شائع ہوا۔ مرزا غالب بھی اس اخبار اور اس کے مالک سید محمد خاں سے کافی رغبت رکھتے تھے۔

دہلی اردو اخبار: کافی دنوں تک لوگوں نے مولانا محمد حسین آزاد کی بات کو صحیح جانا کہ دہلی اردو اخبار پہلا اردو اخبار تھا لیکن پھر بعد کی تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ دہلی اردو اخبار جس کا پہلا نام دہلی اخبار تھا پہلا نہیں بلکہ دوسرا اخبار تھا۔ یہ اخبار دہلی اور شمالی ہند کا پہلا اردو اخبار تھا۔ اس کی تاریخ اجرا میں اختلاف ہے۔ مارگریٹا بارنس نے 1838 کہا ہے۔ جبکہ محمد عتیق صدیقی کے مطابق 1837 میں جاری کیا گیا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر محمد باقر، جے نٹراجن اور قاسم علی سجن لال نے اخبار شروع ہونے کا سال 1836 بتایا ہے۔ اس بارے میں نادر علی خاں لکھتے ہیں:

> ''یہ فیصلہ کرنا کہ دہلی اردو اخبار کہاں جاری ہوا تھا آسان نہیں ہے لیکن موجودہ حالات میں جب کہ 1840 تا 1841 موجود ہیں۔ تاریخ اجرا کے تعین کے سلسلے میں انھیں 1857 کے شماروں پر یقیناً ترجیح دینی ہوگی۔ اور اسی لیے راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ اخبار فروری 1837 میں جاری کیا گیا تھا۔''(4)

اس اخبار کا نام اجرا کے وقت 'دہلی اخبار' تھا۔ اس اخبار کو مولانا محمد حسین آزاد کے

والد مولوی محمد باقر نے 1837 میں جاری کیا تھا۔

اس اخبار کا نام دو مرتبہ تبدیل کیا گیا تھا۔ اس بارے میں ڈاکٹر محمد شاہد حسین لکھتے ہیں:

''3 مئی 1840 تک اس کا نام دہلی اخبار رہا۔ پھر 10 مئی 1840 سے اس کا نام دہلی اردو اخبار ہوگیا۔ نام کی تبدیلی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ جام جہاں نما کی طرح یہ بھی ہفت روزہ تھا اور آخر تک ہفت روزہ ہی رہا... اس اخبار کی قسمت میں آخری دنوں میں نام کی ایک اور تبدیلی لکھی ہوئی تھی۔ لہٰذا 12 جولائی 1857 کو اس کا نام بدل کر 'اخبار الظفر' رکھ دیا گیا۔'' (5)

اس اخبار میں صفحہ اول پر حضور والا کے عنوان سے مغل تاجدار اور قلعہ معلیٰ کی سرگرمیاں اور صاحب کلاں کے عنوان سے کمپنی حکومت کی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ اس میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہروں سے آنے والے اخبارات کے اقتباسات ہوتے تھے۔ اس اخبار کے لیے کچھ لوگوں سے رضا کارانہ طور پر بھی کام لیا جاتا تھا۔

اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس اخبار میں سیاست کے علاوہ معاشرے اور تعلیم وتمدن، سے تعلق رکھنے والی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ خبروں کے ساتھ ساتھ خبروں کے تبصرے بھی دیے جاتے تھے۔ دہلی اردو اخبار میں شاعری پر خاصی توجہ دی جاتی تھی اور اس میں بہادر شاہ ظفر، ملکہ زینت محل، ذوق، غالب اور مومن کا کلام بھی چھپتا تھا۔ اخبار میں اداریہ نہیں ہوتا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں بھی دی جاتی تھیں۔

یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے کافی ترقی کی اور ایک لمبے عرصے تک نکلتا رہا اور اسے اردو صحافت کا پہلا اخبار کہا جاسکتا ہے۔ اور مولوی باقر کو اردو کا پہلا نڈر صحافی کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے صحافت کو ایک تحریک کی طرح استعمال کیا اور اس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی رہے:

''مولوی محمد باقر نے نہ صرف اردو زبان کے رائج الوقت اسلوب سے انحراف کیا بلکہ اپنے مقبول عام اخبار کے ذریعے دہلی کی علمی اور ادبی فضا کو عام کرنے کا بھی اہتمام کیا۔ شاعروں اور ادبی مجلس سے قطع نظر موجودہ

ممتاز شعرا کا تازہ کلام زینتِ اخبار بنتا تھا۔ اور وہ اہل ذوق جو شعری مجالس سے محروم رہتے تھے اپنے اپنے مقامات پر ذوق سلیم کی تربیت وتسکین پاتے رہتے تھے۔ چنانچہ اعلیٰ شعری ذوق کی نشو ونما اور تہذیب وتربیت میں مولوی صاحب موصوف کی خدمات کا اعتراف ناگزیر ہے اور یہ دہلی اردو اخبار کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔'' (6)

دہلی اردو اخبار جس کا نام 1857 میں اخبار الظفر کردیا گیا تھا۔ 13 ستمبر 1857 کو بند کردیا گیا اور مولوی محمد باقر کو گولی مار دی گئی۔ اس طرح مولوی محمد باقر پہلے شہید صحافی کہے جاسکتے ہیں۔

''مولوی محمد باقر کی سرگرمیوں کی پاداش میں برطانوی حکام نے انھیں 16/ستمبر کو دہلی دروازے کے باہر میدان میں گولی کا نشانہ بنادیا۔ اس شہادت نے برصغیر میں نوزائیدہ اردو صحافت کو ایک بے نظیر اولیت عطا کردی۔'' (7)

چاہے وہ ہندوستانیوں کی انگریزوں کے خلاف جنگ ہو یا ملکی یا غیرملکی سرگرمیاں ہوں ہر میدان میں صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے اور سبھی موقعوں پر گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔ مولوی محمد باقر کی صحافت اور بعد میں ان کی شہادت نے صحافت کی تحریک کو جلا بخش دی:

'' یقیناً یہ مولوی محمد باقر ہی کی شہادت تھی جس نے اردو صحافت کو آغاز سے ہی ایک وقار، عزم اور تابانی بخشی اور اسے ایک امتیاز دلایا۔''(8)

دوسرے اخبار و رسائل

سراج الاخبار کے نام سے دہلی سے ایک ہفتہ وار اخبار 1841 میں شائع ہوا۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے تعلق سے اس اخبار میں کافی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ اس اخبار کو بادشاہ کا روزنامچہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس اخبار میں بہادر شاہ ظفر کی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ جامِ جہاں نما کے نام سے ایک اور اخبار کلکتہ سے ہی 1842 میں شروع ہوا تھا۔ یہ

ہفتہ وار تھا اور ہر جمعہ کو نکلتا تھا۔ اس کے مالک منشی غلام حسین تھے۔

مولوی محمد باقر نے 1843 میں مظہر حق کے نام سے دہلی سے ایک اخبار کی شروعات کی۔ یہ شیعہ فرقے کے مذہبی نقطہ نگاہ کو عام کرنے کی غرض سے جاری کیا گیا تھا۔ صادق الاخبار کے نام سے ایک اخبار 1845 میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ دہلی سے نکلتا تھا۔ 1844 میں کلکتہ سے مخزن الادویہ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کی شروعات ہوئی۔ اس اخبار کو ایک ایرانی حاجی آقا احمد خاں شیرازی نے شروع کیا تھا۔ دہلی سے صادق الاخبار دسمبر 1855 میں جاری ہوا۔ لاہور سے 1855 میں ہی لاہور گزٹ کی شروعات ہوئی۔ بمبئی سے کشف الاخبار 1855 میں جاری ہوا تھا۔ اس اخبار کے بارے میں امداد صابری لکھتے ہیں:

> اس اخبار میں اپنے زمانے کے دستور کے مطابق خبریں تو ہوتی ہی تھیں لیکن اس کے علاوہ معلوماتی، تاریخی ادبی مضامین کے ساتھ خاص طور پر بمبئی کے مقامی حالات و واقعات پر دلچسپ اور مفید تبصرے ہوتے تھے۔ عیسائی مشنریوں کی شرارتوں کو بے باکی سے آشکارہ کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی پارسیوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتا تو مہینوں یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کالم کے کالم سیاہ ہو جاتے تھے۔ حکومت کے محکموں کی بدعنوانیوں کے خلاف بھی آواز اٹھاتا تھا۔ اس اخبار کی پالیسی آزادانہ تھی خوشامد پسند نہیں تھا۔(9)

آگرہ سے تفریح الناظرین کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار یکم جنوری 1856 کو جاری ہوا۔ اس کے مالک مرزا علی حسین تھے۔ آگرہ سے ہی سفیر آگرہ ہفتہ وار 19 جنوری 1856 کو جاری ہوا۔ خورشید پنجاب کے نام سے ماہانہ رسالہ لاہور سے جنوری 1856 میں عالم وجود میں آیا۔ پنجابی اخبار مارچ 1856 میں لاہور سے جاری ہوا۔ یہ اخبار 1861 تک جاری رہا۔ بعد میں دوبارہ یہ اخبار 1865 میں شروع ہوا اور 1890 تک چھپتا رہا۔ طلسم لکھنؤ جولائی 1856 میں لکھنؤ سے شروع ہوا جس کے مالک مولوی محمد یعقوب انصاری تھے۔ نومبر 1856 میں لکھنؤ سے سحر سامری کا آغاز ہوا۔ مفید خلائق نام کا رسالہ 23 دسمبر 1856

کو آگرہ سے شروع ہوا تھا۔ اس رسالے کو منشی شیو نارائن نے جاری کیا تھا۔ معدن القوانین آگرہ سے 1856 میں نکلنا شروع ہوا۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا۔ اس کے مالک سید حسین علوی تھے۔ 1856 میں ہی عنقائے روزگار کی شروعات ہوئی۔ نور علیٰ نور کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ سیالکوٹ سے 30 جنوری 1856 کو نکلنا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر منشی دیوان چند تھے۔

1857 کا غدر اور پہلی جنگ آزادی ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ جس نے ارباب اقتدار عوام اور سبھی چیزوں پر اثرات مرتب کیے اور ہندوستان کی اردو صحافت بھی اس سے کافی متاثر ہوئی اور غدر کے وقت اردو اخبارات بڑی تعداد میں بند ہو گئے۔ انگریزوں نے نئے قوانین بنا دیے اور سیکڑوں مطابع بند کر دیے گئے۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد لوگوں کی حالت بہت دگرگوں ہو گئی تھی اور خاص طور سے مسلمانوں کے حالات بہت ہی بدتر ہو گئے تھے ایسی حالت میں اردو اخبارات و رسائل کی شروعات کرنا ایک بہت بڑی بات تھی۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی سے پہلے تک اردو میں صرف ہفتہ وار اخبار، پندرہ روزہ یا ماہانہ رسائل ہی تھے وہ بھی غدر کے بعد شاذ و نادر ہی بچے تھے۔ لیکن غدر کے بعد یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اب روزانہ اخبار کی شروعات کی جائے تاکہ لوگوں کو ملک میں ہونے والی اُتھل پُتھل اور ہر لمحہ رنگ بدلتی انگریزوں کی سیاست اور ان کی حکومت کے تعلق سے خبریں مل سکیں۔ اردو روزنامے کی شروعات 1858 میں کلکتہ سے ہوئی۔ اردو کا پہلا روزنامہ اردو گائیڈ تھا۔ جسے مولوی کبیرالدین نے شروع کیا تھا۔ اس میں چار صفحے ہوتے تھے۔ یہ اخبار مطبع مظہر العجائب سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار میں خبروں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے امیروں، نوابوں کے حالات بھی چھپتے تھے۔ اس اخبار کی غرض و غایت کے بارے میں امداد صابری لکھتے ہیں:

> ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہندوستانی مذہبوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتابیں چھاپتے اور پمفلٹ تقسیم کرتے تھے۔ شروع میں کافی عرصے تک ہندوستان کے لوگ اُن کی حرکتوں کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا

ان حرکتوں کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہوئی۔(10)

1858 میں ہی بمبئی سے برق خاطف کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کی بھی شروعات ہوئی۔ یہ چھ اوراق پر مشتمل ہوتا تھا اور ہر بدھ کو شائع ہوتا تھا۔اس کے مالک سید مظفر حسین تھے۔

23 نومبر 1858 کو مطبع نول کشور کے قائم ہونے کے بعد 1859 میں اسی مطبع سے اودھ اخبار جاری ہوا۔ یہ اخبار لکھنؤ کے حضرت گنج سے نکلنا شروع ہوا۔ پہلے ہفتہ وار تھا بعد میں ہفتے میں دو بار پھر تین بار اور 1874 میں روزنامہ میں تبدیل ہوگیا تھا اور 1877 میں یہ روزنامہ بند ہوگیا۔شروع میں اس کے چار اوراق ہوتے تھے لیکن بعد میں 48 صفحات کا بھی شائع ہوا ہے۔ اس اخبار میں ادبی مضامین کے علاوہ تاریخی، معاشرتی اور کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔امداد صابری لکھتے ہیں:

> اس اخبار کی جتنی ذی علم اور معروف ہستیاں ایڈیٹر ہوئی ہیں۔ اردو کے کسی دوسرے اخبار کو اب تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ مذکورہ حضرات کے علاوہ ہندی اور اردو کے مشہور ادیب شیو پرشاد،سید امجد علی اشہری، مولانا عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، جالب دہلوی، یگانہ چنگیزی، شوکت تھانوی، مرزا محمد عسکری اور پیارے لال شاکر وغیرہ حضرات نے اس اخبار کو اپنے قلم کی گلفشانیوں سے چار چاند لگائے اور یہی وجہ ہے کہ اپنے دور میں کوئی اخبار اس اخبار کا ہم پلہ نہیں ہوسکا۔(11)

جولائی 1859 میں تاریخ بغاوت ہند کے نام سے ایک ماہانہ رسالے کی شروعات ہوئی۔ اس کے ایڈیٹر سرجن مکندلال تھے۔ اس میں جنگ آزادی کے حالات و واقعات ہی شائع ہوتے تھے۔ مدراس سے ہفتہ وار شمس الاخبار کی شروعات 1859 میں ہوئی تھی۔ اس کے شروع کرنے والے نصیر الدین آفندی تھے۔ 1859 ہی میں طلسم حیرت مدراس پنچ کا آغاز ہوا۔ اس کے مالک شاہ محمد صادق تھے اور ایڈیٹر غلام محی الدین حنیف تھے۔ 1859 میں ہی جونپور سے نسیم جونپور جاری ہوا۔گلدستہ شعرا 4 دسمبر 1859 کو لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ پندرہ روزہ تھا اور اس میں تازہ غزلیں اور شعری نگارشات شامل کی جاتی تھیں۔ کلکتہ

سے رفیق الحسن جنوری 1860 میں جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار تھا اور اس کے مالک بابو ہریش چندر تھے۔ منظور الاخبار سورت سے مئی 1860 میں شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی منظور تھے۔ 1861 میں منظور الاخبار کا نام بدل کر نجم الاخبار رکھ دیا گیا۔

دہلی سے سید الاخبار کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار شروع ہوا۔ یہ اردو ہندی اور انگریزی تینوں میں شائع ہوتا تھا۔ اخبار کا پہلا کالم انگریزی میں، دوسرا اردو اور تیسرا ہندی میں ہوتا تھا۔ اس کے مالک منشی مراری لال اور مہتمم وزیر علی تھے۔ لاہور سے گورنمنٹ گزٹ پنجاب کی شروعات ہوئی۔ یہ 18 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔

بیسویں صدی اردو صحافت کے لیے نئے ہنگامے اور نئے انقلابات لے کر آئی۔ بیسویں صدی کی شروعات نے نئے واقعات اور نئی ایجادات کو جنم دیا۔ دنیا کے سیاسی نقشے میں کئی ردوبدل کیے اور دنیا نے پہلی جنگ عظیم کا سامنا کیا۔ ہندوستان میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح مختلف نئی تبدیلیاں ہوئیں اور اردو صحافت بھی ان ہنگاموں اور تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بیسویں صدی کی شروعات ہوئی تو کئی نئے اخبارات ورسائل جاری ہوئے۔ کچھ رسائل و اخبارات جیسے صلح کل، پیسہ اخبار، اودھ اخبار، وکیل امرتسر، مہذب وغیرہ پہلے سے ہی نکل رہے تھے۔ بیسویں صدی کی شروعات میں لاہور سے 'پنجہ فولاد' جاری ہوا۔ یہ 1901 میں جاری ہوا تھا اور 1905 میں بند ہو گیا تھا۔ 1902 میں مولوی انشاء اللہ نے وطن لاہور کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ 1915 میں یہ روزنامہ بند ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد یہ دوبارہ ہفت روزہ ہو گیا۔ 1904 میں لالہ دینا ناتھ اور رام بھج دت نے لاہور سے 'ہندوستان' کی شروعات کی۔ اسی عرصے میں لالہ دینا ناتھ نے 'دیپک' نام کے ایک دوسرے اخبار کی بھی شروعات کی تھی۔

اس دوران نئے شروع ہونے والے رسائل میں سب سے پہلا نام مولانا حسرت موہانی کے ماہانہ رسالے 'اردوئے معلّٰی' کا لیا جا سکتا تھا۔ اس کی شروعات جولائی 1903 میں ہوئی تھی۔ اس کے ہم عصر رسالوں میں عبدالحلیم شرر کا دلگداز، عبدالقادر کا مخزن اور منشی دیانرائن نگم کا زمانہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس رسالے میں سیاسی، ادبی، تاریخی اور شاعری پر مشتمل مضامین شائع

ہوتے تھے۔ ہفت روزہ زمیندار کی شروعات مولانا ظفر علی خاں کے والد مولانا سراج الدین احمد نے جون 1903 میں کی تھی۔ اس اخبار کا مقصد دبے کچلے اور مزدور طبقہ کے حقوق کی لڑائی لڑنا تھا۔ نومبر 1909 میں مولانا سراج الدین احمد کے انتقال کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے اس کی ادارت سنبھالی۔ اس کے دفتر کو لاہور منتقل کیا گیا اور یہ اخبار ہفت روزہ سے روزنامہ ہوگیا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس نے رائٹر اور دوسری انگریزی خبر رساں ایجنسیوں سے خبریں حاصل کیں۔ اس اخبار کی متعدد بار ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ تحریک خلافت میں بھی اس اخبار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا ظفر علی خاں کے بعد ان کے بیٹے اختر علی خاں اور اُن کے پوتے منصور علی خاں نے اس اخبار کی ذمے داری سنبھالی۔ اردو کے مایہ ناز اور مشہور صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی نے بھی اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اسی اخبار سے کیا تھا۔

مولانا شبلی نعمانی نے جولائی 1904 شاہجہاں پور سے ماہنامہ الندوہ کی شروعات کی۔ یہ رسالہ بعد میں لکھنو منتقل ہوگیا۔ اس میں بلند پایہ علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔

1904 میں حیدرآباد سے علم و عمل کی شروعات ہوئی جس کے مدیر مولوی محبّ حسین تھے۔ 1906 میں منشی محمد دین نے ماہنامہ کشمیری میگزین کی شروعات کی تھی۔ 1911 میں اکبر علی کی ادارت میں صحیفہ نکلنا شروع ہوا۔ اسی سال یعنی 1911 میں ہی لکھنؤ سے روزنامہ معارف کی شروعات ہوئی۔ لکھنؤ سے ہی مولانا عبدالباری نے ہمدم گلّی کا آغاز کیا جو کافی عرصے تک جاری رہا۔

1912 میں بجنور سے مولوی عبدالمجید نے مدینہ بجنور کی شروعات کی۔ یہ اخبار کانگریس اور جمعیۃ العلما کا حامی تھا۔ یہ اخبار اردو صحافت کی تاریخ میں ایک اہم اخبار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے کلکتہ سے انگریزی زبان میں ہفتہ وار کامریڈ کی شروعات کی۔ بعد میں جب دارالسلطنت دہلی منتقل ہوا تو کامریڈ کو دہلی سے جاری کیا اور دہلی سے ہی 23 فروری 1913 کو اردو زبان میں روزنامہ ’ہمدرد‘ کی شروعات کی۔ ہمدرد شروع کرنے کا مقصد مسلمانوں کی خدمت کرنا تھا۔ خلافت تحریک اور کانگریس

کے نظریات اس اخبار میں چھائے رہتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے 13 جولائی 1912 سے ہفتہ وار الہلال کا آغاز کیا۔ مولانا آزاد الہلال کے شروع کرنے سے قبل ہی صحافت کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس سے قبل انھوں نے گلدستہ نیرنگ عالم 1899 میں جاری کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے لسان الصدق 1903-1905 جاری کیا۔ کلکتہ سے نکلنے والے احسن الاخبار سے بھی وابستہ رہے۔ تحفہ محمدیہ اور خدنگ نظر کی شروعات بھی مولانا نے ہی کی تھی۔ مولانا 'الندوہ' اور وکیل سے بھی جڑے رہے تھے۔ لیکن مولانا آزاد کی اصل صحافتی طاقت الہلال سے منظر عام پر آئی انھوں نے ہندوستانی عوام کو الہلال کے ذریعے نیند سے بیدار کیا اور برطانوی حکومت کو بھی یہ باور کرایا کہ ہندوستانی عوام اب اور زیادہ دن تک غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑے رہیں گے۔ الہلال میں مذہب وسیاست، معاشیات ونفسیات، تاریخ وجغرافیہ، ادب و حالات حاضرہ کے موضوع پر اعلیٰ قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ الہلال میں شبلی نعمانی، علامہ اقبال، حسرت موہانی اور سید سلیمان ندوی جیسے اہم اور بلند پایہ قلم کاروں کی تحریریں شامل اشاعت ہوا کرتی تھیں۔ 16 نومبر 1914 کو حکومت ہند نے الہلال پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کرلی۔ بعد میں دس ہزار کی نئی ضمانت مانگی جو منظور نہ ہونے پر الہلال پریس کو بند کر دیا گیا۔ اسی دوران البلاغ کی شروعات ہوئی لیکن مولانا کی نظر بندی کی وجہ سے جلد ہی بند ہو گیا۔ بعد میں الہلال 1927 میں جاری ہوا لیکن چھ ماہ بعد ہی بند ہو گیا۔ اردو صحافت کو انقلابی جوش اور جذبے سے مولانا ابو الکلام آزاد نے ہی روشناس کرایا:

> ''مولانا آزاد نے اردو کو صحافت کے بین الاقوامی معیار سے روشناس کرایا۔ صحافت کو جدید ترین تکنیک کا حامل بنایا اور قارئین کو اس طرح مواد فراہم کیا کہ انھیں پھر کسی زبان کے اخبار یا رسالہ پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔''(12)

مولانا آزاد کے نزدیک الہلال جاری کرنے کا مقصد تھا کہ مسلمانوں میں بیداری آئے۔ اسلامی امت میں اتحاد و اتفاق قائم ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے دعوت وخطابت

کا اسلوب و انداز اپنایا۔ تشبیہات و استعارات اور تلمیحات سے اپنی تحریروں کو آراستہ کر کے اپنے مضامین کو اتنا پراثر بنا دیا کہ اردو صحافت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ الہلال کے اسلوب کا مقابلہ اس دور کا کوئی بھی اخبار نہیں کر سکتا۔ مولانا کے اسی اسلوب نے الہلال کو دوسرے تمام رسائل و اخبارات سے ممتاز بنا دیا اور مولانا اپنی صحافت کے میدان میں یکہ و تنہا نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد کی صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کہ یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے''۔(13)

دوسری جانب مولانا حسرت موہانی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

الہلال نے قوم کو جھنجھوڑ کر غلامی کی نیند سے بیدار کیا اور برطانوی حکومت کی جڑیں ہلا ڈالیں۔ الہلال میں مذہب و سیاست، معاشیات ونفسیات، جغرافیہ وعمرانیات اور ادب و حالات حاضرہ پر بہترین مضامین شائع کیے جاتے تھے۔اس رسالے میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی اور سید سلیمان ندوی جیسے اہم اور قابل قدر اکابر و علما کی تحریریں شائع کی جاتی تھیں۔مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعے اردو صحافت کو زبان، تحریر اور انداز بیان کا ایک نیا اسلوب عطا کیا۔ ان کی صحافت نے ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ان کی صحافت ادب کا ایک قیمتی نگینہ ہے۔ آج بھی مولانا آزاد اردو صحافت کے میدان میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور ان کی تحریریں آج بھی دلوں کو منور کرتی ہیں۔

1919 میں مولانا سید حبیب نے لاہور سے روزنامہ سیاست کی شروعات کی۔ اس اخبار نے بھی ہندوستان کی قومی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اُسی دوران لاہور سے ہی مہاشے کرشن نے روزنامہ پرتاپ جاری کیا۔ یہ اخبار آج بھی جاری ہے۔

13 اپریل1923 کو مہاشے خوشحال چند نے لاہور سے روزنامہ ملاپ شروع کیا۔ یہ اخبار تقسیم ہند کے بعد دہلی سے نکلنے لگا اور آج بھی نکل رہا ہے۔ مارچ 1920 میں دہلی سے روزنامہ تیج کا آغاز ہوا۔ سوامی شردھانند نے اس اخبار کو شروع کیا تھا۔ 1925 میں جمعیۃ العلما ہند کا ترجمان اخبار الجمعیۃ شروع ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مولانا محمد عرفان تھے۔ دوسرے اہم اور نامور مدیروں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، محمد عثمان فارقلیط، خلیق صدیقی اور مولانا عبدالوحید صدیقی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ 1927 میں لاہور سے انقلاب کا آغاز ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک اس کے بانی اور مدیر تھے۔ یہ اخبار تقسیم کے بعد بند ہو گیا۔

حیات اللہ انصاری نے قومی آواز شروع کیا جو پنڈت جواہرلعل نہرو کے ایما پر شروع کیا گیا تھا۔ سید محمد جعفری نے ملت کے نام سے دہلی سے ایک روزنامہ جاری کیا تھا۔ تریاق کے نام سے ایک روزنامہ ڈاکٹر شیخ محمد عالم نے لاہور سے شروع کیا تھا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کلکتہ سے ہند نام کا روزنامہ شروع کیا تھا۔ بعد میں احمد سعید اس کے ایڈیٹر ہوئے۔ مولانا محمد علی کے بھائی شوکت علی نے بمبئی سے خلافت کی شروعات کی تھی۔ قاضی عبدالغفار نے حیدرآباد سے پیام حیدرآباد کی شروعات کی یہ روزنامہ آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔ 1918 میں انیس احمد عباسی نے روزنامہ حقیقت کی شروعات کی 1925 میں شیعہ کانفرنس نے' سرفراز' کا آغاز کیا۔ مولانا محمد اکرم نے روزنامہ' زمانہ' شروع کیا۔ حافظ علی بہادر نے بمبئی سے ہلال نو، معین الدین حارث نے اجمل کی شروعات کی۔ عبدالمجید انصاری نے 1938 میں روزنامہ 'انقلاب' جاری کیا تھا جو آج بھی جاری ہے اور بہت بڑی تعداد میں شائع ہوتا ہے اور مہاراشٹر کا سب سے مقبول اردو روزنامہ ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' اب شمالی ہند کے مختلف شہروں سے بھی بڑی تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ 1938 میں ہی حیدرآباد سے معروف محقق محی الدین قادری زور نے ماہنامہ سب رس شروع کیا تھا، جو اردو ادب اور لسانیات پر تحقیقی مواد و مضامین شائع کرتا تھا۔ یہ رسالہ اب بھی جاری ہے اور ادب کے اچھے رسائل میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ 25 نومبر 1942 سے

ماہنامہ آجکل کی شروعات ہوئی۔ یہ رسالہ حکومت ہند کے زیرنگرانی آج بھی نکل رہا ہے اور اہم رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ 1947 سے قبل شروع ہونے والے کچھ اہم ہفت روزہ اخبارات اس طرح تھے۔

دہلی میں سردار دیوان سنگھ کا ریاست، تیج ویکلی، مفتی شوکت علی فہمی کا دین دنیا، عزیز حسن بقائی کا حُریت، رضا ہمدانی بخاری کا شباب پشاور سے نکلا۔ بمبئی سے قومی جنگ، لاہور سے منشی محبوب عالم کا خیام، مولانا عبدالماجد دریابادی کا لکھنؤ سے ہفتہ وار ذوق جدید بھی اہم اخبار تھا۔ عنایت دہلوی کا کلکتہ سے ہفتہ وار چونچ نکلتا تھا جو مزاحیہ پرچہ تھا۔ لاہور سے اہم ہفتہ وار اخباروں میں لالہ کرم چند کا پارس، عطاء اللہ ہاشمی کا اداکار، سردار امر سنگھ کا 'شیر پنجاب' مولانا زکریا اسعدی کا ہفت روزہ 'بیباک' سہارنپور قابل ذکر اور اہم ہفت روزہ اخبارات تھے، ماہناموں اور رسائل میں شیخ عبدالقادر کا مخزن لاہور، سید سلیمان ندوی کا 'معارف' اعظم گڑھ، مولانا ظفر الملک کا 'الناصر' لکھنؤ، مولانا عبدالوحید صدیقی کا ماہنامہ جاوید دہلی، منشی دیانرائن نگم کا 'زمانہ' کانپور، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا رسالہ 'جامعہ'، ندوۃ المصنّفین کا برہان دہلی، میاں بشیر الدین کا لاہور سے ہمایوں، حکیم یوسف حسن کا نیرنگ خیال لاہور، حافظ محمد عالم کا عالمگیر لاہور، صلاح الدین احمد کا ادبی دنیا لاہور، انجمن ترقی اردو ہند کا رسالہ اردو 1921، علامہ راشد الخیری کا رسالہ عصمت، سید محمد کا اخبار النسا، مولوی سید ممتاز علی کا تہذیب نسواں، علامہ سیماب اکبرآبادی کا شاعر آگرہ 1930، تاجور نجیب آبادی کا شاہکار 1940، حکیم امجد شجاع کا ہزار داستان، امتیاز علی تاج کا کہکشاں لاہور، نیاز فتح پوری کا فنکار لکھنؤ، شاہد احمد دہلوی کا ساقی دہلی، اختر شیرانی کا خیالستان اور رومان لاہور، انجمن ترقی اردو کا ماہنامہ سائنس، جوش ملیح آبادی کا کلیم دہلی، خوشتر گرامی کا بیسویں صدی، سہارنپور سے ماہنامہ چاند اس دور میں نکلنے والے اہم رسائل تھے۔

اردو کے اہم ادبی رسائل و جرائد (ابتدا سے 1900 تک)

یوں تو اردو میں اخبارات کی شروعات 1822 سے ہوگئی تھی لیکن 1857 تک پہنچتے

پہنچتے اس میں کافی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں اور اردو صحافت نے کئی کروٹیں بدلیں۔ شروع سے لے کر تقریباً 15 برسوں تک اردو صحافت ہفتہ وار اخبارات پر ہی مرکوز رہی اور ایک لمبے عرصے کے بعد اردو میں رسائل کی شروعات ہوئی۔ کچھ اہم اور مشہور رسائل کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

خیرخواہ ہند: اردو میں سب سے پہلا رسالہ خیرخواہ ہند تھا، جو 1837 میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا تھا اور اس کے ایڈیٹر ایک عیسائی پادری آر سی ماتھر تھے۔ خیرخواہ ہند مرزا پور سے شائع ہوتا تھا لیکن کلکتہ کے بپٹسٹ مشن پریس سے چھپ کر آتا تھا۔ اسے پہلا رسالہ اس معنی میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں خبریں نہیں بلکہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ خیرخواہ ہند کے بارے میں مولانا امداد صابری لکھتے ہیں:

> ''یہ رسالہ بارہ صفحات پر نکلتا تھا۔ مالک پادری ایف جی برایت صاحب، ایڈیٹر پادری ماتھر صاحب مہتمم ڈاکٹر حیدر صاحب تھے۔ سالانہ چندہ تین روپیہ تھا۔ مطبع اسکول میں چھپتا تھا۔ اس رسالہ کا مقصد ہندوستانیوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔ یہ امریکن مشنری سوسائٹی کا آرگن تھا لیکن عیسائیوں کے فرقے پروٹسٹنٹ مشنریوں کے مضامین اس میں چھپتے تھے۔ اس رسالے میں معلوماتی، تاریخی، مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔'' (14)

اس رسالے کو پادری صاحب نے مذہب کی تبلیغ کے لیے شروع کیا تھا اور زیادہ تر مذہبی عقائد پر مبنی مضامین شائع ہوتے تھے لیکن اردو کا رسالہ ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہنچا۔

> ''خیرخواہ ہند کے اجرا سے عیسائیت کو کتنا نفع پہنچا یہ موضوع سے خارج ہے البتہ اس کے قیام سے نہ صرف اردو زبان کا ایک مطبع مرزاپور سے جاری ہوا بلکہ اردو زبان جو شعر و شاعری اور داستان کے آہنی پنجے میں مقید تھی اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے وسیع تر ہوگئی۔'' (15)

یہ رسالہ 1857 میں بند ہوگیا اور دوبارہ 1861 میں شروع ہوا تھا۔ اس رسالے کا

ایک انتخاب کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔

قران السعدین : یہ ہفتہ وار رسالہ دہلی سے 1845 میں شروع کیا گیا۔ اس رسالے کو دلی کالج کے پرنسپل مسٹر اشپرانگر نے شروع کیا تھا۔ اس رسالے میں خبروں کے علاوہ، مضامین، نظمیں اور غزلیں وقصیدے وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ مطبع العلوم متعلق بنارس، دہلی میں چھپتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر پنڈت دھرم نارائن تھے جو دلی کالج کے شعبہ انگریزی کے اسکالر تھے۔ اس رسالے میں مذہب، سائنس اور زبان و ادب کے موضوعات پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔

فوائد الناظرین : یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ تھا جس کی شروعات 1845 میں کی گئی تھی۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر دلی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر تھے۔ اس میں سائنسی اور تاریخی مضامین زیادہ شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے میں غیر ملکی اخبارات سے ترجمہ شدہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار 1853 میں بند ہو گیا تھا لیکن کچھ مہینوں کے بعد دوبارہ جاری ہوا تھا۔

محبّ ہند: اس رسالے کے ایڈیٹر بھی ماسٹر رام چندر تھے اور اسے یکم ستمبر 1847 میں جاری کیا گیا تھا۔ یہ خالص ادبی رسالہ تھا اور ماہانہ شائع ہوتا تھا۔ محبّ ہند کا پہلے پہل نام خیر خواہ ہند رکھا گیا تھا اور سب سے پہلا شمارہ خیر خواہ ہند کے نام سے ہی شائع ہوا تھا لیکن ماسٹر رام چندر کو جب یہ خبر ملی کہ اس نام سے پہلے ہی ایک رسالہ شائع ہو رہا ہے تو انھوں نے نام بدل کر محبّ ہند رکھ دیا۔ ملاحظہ ہو:

> ’’چونکہ ہم کو اس کی بالکل اطلاع نہ تھی کہ کوئی اخبار خیرخواہ ہند ہندوستان میں اجرا ہوتا ہے ہم نے اپنے رسالے کا نام خیرخواہ ہند رکھا تھا۔ اب ہم کو معلوم ہوا کہ اخبار مسمی خیر خواہ ہند مرزا پور سے جاری ہوتا ہے تو ہم کو مناسب نہیں کہ ہم اپنے رسالے کا نام بھی خیرخواہ ہند رکھیں۔ اس واسطے ہم نے اس رسالے کا نام تبدیل کیا اور بجائے خیرخواہ ہند کے محبّ ہند رکھا۔‘‘ (16)

کریم الاخبار وگل رعنا: مولوی کریم الدین نے 1845 میں دہلی سے ایک ماہنامہ گل رعنا اور ایک ہفتہ وار اخبار کریم الاخبار کے نام سے شروع کیا تھا۔ اس رسالے گل رعنا کو مولوی کریم الدین نے اردو صحافت کا پہلا مجلّہ کہا تھا لیکن بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ پہلا مجلّہ نہیں تھا بلکہ خیر خواہ ہند سب سے پہلا مجلّہ تھا۔ گل رعنا کو شاعری کا پہلا گلدستہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس رسالے میں مشاعروں میں پڑھے گئے کلام کو شائع کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

> یہ خیال تو صحیح نہیں ہے کہ گل رعنا اردو کا پہلا رسالہ تھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ گل رعنا اردو کا غالبًا پہلا گلدستہ تھا۔ جس کو مولوی کریم الدین نے 1845 میں نہیں تو کچھ آگے چل کر جاری ضرور کیا۔(17)

مفید ہند: یہ پندرہ روزہ رسالہ تھا اور دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کی شروعات 15 اپریل 1848 کو ہوئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر منشی حسینی اور مہتمم پنڈت اجودھیا پرشاد تھے۔ یہ رسالہ بہت جلد بند ہو گیا تھا۔

معیار الشعرا: یہ بھی ایک گلدستہ تھا۔ جسے آگرہ سے نومبر 1848 میں شروع کیا گیا تھا۔ اسے مولوی ابوالحسن نے شروع کیا تھا۔ اس گلدستے میں بھی مشاعروں میں پڑھی گئی غزلیں شائع کی جاتی تھیں۔ 1852 کے بعد اسے منشی قمرالدین قمر اور گلاب خاں نکالتے رہے۔

ہمائے بے بہا: لاہور سے یہ پندرہ روزہ رسالہ یکم جنوری 1853 میں شروع کیا گیا۔ ہر ماہ کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک منشی دیوان چند تھے۔ اس کا مطبع چشمہ فیض تھا۔ یہ رسالہ فوائد الناظرین اور محبّ ہند کی طرز پر تھا اور اس میں علمی، تاریخی اور سماجی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔

معلم العملہ: جنوری 1855 سے اس ادبی اور تاریخی رسالے کی شروعات ہوئی۔ یہ کافی ضخیم مجلّہ تھا۔ اس کے مہتمم منشی سدا سکھ لال اور مالک مطبع نورابصار تھے۔ اس مجلّے کا سالانہ چندہ پانچ روپے تھا۔ اس رسالے کے خریداروں میں سر سید احمد خاں، کلیان رائے وغیرہ اہم لوگ شامل تھے۔

خورشید پنجاب: لاہور سے جنوری 1856 میں یہ رسالہ شروع ہوا۔ یہ 50 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے مالک ہرسکھ رائے تھے۔ اس رسالے کی طباعت مطبع کوہ نور میں کی جاتی تھی۔ اس رسالے میں تاریخی، ادبی، سائنسی اور مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے۔
مفید خلائق: منشی شیو نارائن نے 23 دسمبر 1856 سے رسالہ مفید خلائق شروع کیا تھا۔ یہ ہفتہ وار تھا اور چار اوراق پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ رسالہ 1859 تک نکلتا رہا۔

کچھ اہم رسائل

اس دور کے کچھ اہم رسائل میں معدن القرنین آگرہ سے 1856 میں جاری ہوا۔ یہ ایک قانونی پرچہ تھا اور اس میں عدالتوں کے حالات شائع کیے جاتے تھے۔ اس رسالے کے مالک سید حسین علوی تھے۔ رسالہ نورعلیٰ نور سیالکوٹ سے 30 جنوری 1856 کو جاری ہوا۔ یہ ہر ماہ کی تیس تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے مہتمم اور ایڈیٹر منشی دیوان چند تھے۔ سیالکوٹ سے ہی چشمہ خورشید کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ 1857 میں شروع کیا گیا۔ یہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے مہتمم بھی دیوان چند ہی تھے۔

جولائی 1859 میں 'تاریخ بغاوت ہند' کی آگرہ سے شروعات ہوئی۔ اس ماہانہ رسالے کے ایڈیٹر سرجن مکند لال تھے۔ یہ رسالہ 1857 کی جنگ آزادی کے حالات و واقعات شائع کرتا تھا۔ 1865 میں لاہور سے رسالہ انجمن پنجاب کی شروعات کی گئی۔ اس رسالے کے بارے میں امداد صابری لکھتے ہیں :

> ''1865 میں رسالہ انجمن پنجاب جاری ہوا۔ اس رسالے میں علم و ادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، اور اردو ادب پر مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ اس میں انجمن کے اجلاسوں اور مشاعروں کی روئیداد شائع ہوتی تھی۔ انگریزی اور ہندی میں کبھی کبھار چار پانچ صفحہ کا ایک مختصر سا مضمون شائع ہو جاتا تھا۔ اس رسالے میں مضمون نگار بابو چندر ناتھ متر، پنڈت من پھول، مولانا محمد حسین آزاد، منشی دیوان چند، برکت علی خاں،

مولوی علمدار حسین وغیرہ تھے۔'' (18)

انسٹی ٹیوٹ گزٹ: سرسید احمد خاں نے 30 مارچ 1866 کو اپنی سوسائٹی کا اخبار سائنٹفک سوسائٹی جاری کیا۔ اسے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا بعد میں ہفتے میں دوبار شائع ہونے لگا۔ گوجرانوالہ پنجاب سے ایک ماہانہ رسالہ انجمن فیض عام کے نام سے یکم جون 1866 کو شروع کیا گیا۔ اس کے مہتمم منشی دیوان چند تھے۔ گوجرانوالہ سے ہی کوہ طور نام کا ماہانہ رسالہ دسمبر 1866 میں شروع ہوا تھا۔ اس کے مالک منشی دیوان چند تھے اور یہ رسالہ بھی انجمن فیض عام کے ساتھ ساتھ ایک چھاپہ خانہ گیان پریس سے چھپتا تھا۔

رسالہ تہذیب الاخلاق: 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانو ں کے حالات نہایت دگرگوں ہو گئے تھے اور تعلیم و تربیت کے علاوہ وہ سماجی و معاشی طور پر بھی نہایت افسوسناک زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے کیونکہ اس جنگ آزادی کا الزام مسلمانوں پر لگایا گیا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں سرسید احمد خاں نے، جو رسالہ اسباب بغاوت ہند بھی لکھ چکے تھے، 24 دسمبر 1870 کو علی گڑھ سے رسالہ تہذیب الاخلاق کی شروعات کی۔ یہ رسالہ ہر ماہ میں ایک بار یا دو بار اور کبھی کبھی تین بار بھی شائع ہوتا تھا۔ لندن سے آنے کے بعد سرسید احمد خاں نے یہ رسالہ خالصتاً مسلمانوں کی خراب صورتحال اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے جاری کیا تھا۔ اس رسالے میں زیادہ تر مضامین مسلمانوں کی تعلیم، ان کی سماجی معاشی حالت، انگریزی اور مغربی تعلیم، تحقیق و اصلاح، اور دینی مسائل پر مبنی ہوتے تھے۔ خبریں بہت کم ہوتی تھیں اور اشتہارات وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے میں کبھی کبھی انگریزی میں بھی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ اس کا اداریہ سرسید خود لکھتے تھے۔ یہ رسالہ دوبار بند ہوا اور پھر سے جاری ہوا۔ تہذیب الاخلاق کے اہم مضمون نگاروں میں سرسید احمد خاں، منشی مشتاق حسین، حافظ محمد عبدالرزاق اور حافظ عبدالرحمٰن حیرت تھے۔

تہذیب الاخلاق کا آخری شمارہ 2 فروری 1897 کو شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اسے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ہی شامل کر لیا گیا اور تہذیب الاخلاق کا اپنا وجود باقی نہیں رہا۔ اس رسالے نے اردو صحافت کو کافی فائدہ پہنچایا اور پہلی مرتبہ ثابت ہو گیا کہ سچے اور ایماندارانہ

اصولوں کے ساتھ بھی صحافت کی جا سکتی ہے۔ سر سید احمد خاں کی کافی مخالفت بھی ہوئی لیکن انھوں نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہیں کی اور اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کے ذریعے صحافت کا ایک بہترین معیار پیش کرتے رہے۔ خلیق احمد نظامی سر سید کی صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''در اصل تہذیب الاخلاق ہی وہ رسالہ ہے جس نے اردو میں صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ سید احمد صحافت کی اعلیٰ قدروں کے ترجمان تھے۔ انھوں نے اردو صحافیوں کو بتایا کہ سچائی، صداقت روی اور سنجیدگی ایک صحافی کا اسوۂ زندگی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اظہار خیال کی آزادی پر بھی زور دیا۔ وہ صحافت کو سچائی اور رائے عامہ کا ترجمان بنانا چاہتے تھے۔'' (19)

سر سید احمد خاں اردو صحافت کے ان چند درخشندہ ستاروں میں ہیں، جنھوں نے صحافت کو محض ایک پیشہ تصور نہیں کیا بلکہ یہ ثابت کر دیا کہ اردو صحافت دنیا کی کسی بھی دوسری زبان کی صحافت کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو سکتی ہے اور صحافت کا جو اصول ہے ان اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے بھی سچی صحافت کی جا سکتی ہے اور صحافت سے اصلاحی اور مقصدی کام بھی کیا جا سکتا ہے۔

انجمن مناظرہ: مئی 1871 میں اس رسالے کی شروعات ہوئی تھی۔ اس کے سکریٹری نذیر علی اور اسسٹنٹ سکریٹری سید میر نصیر علی تھے۔ انجمن مناظرہ کا پہلا نام پبلک سوشل میٹنگ تھا۔ اس رسالے میں تعلیم کو فروغ دینے، تعلیمی و ادبی سوسائٹیاں بنانے اور مسلمانوں کو تعلیم و تربیت کی طرف راغب کرنے سے متعلق مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ اس کے مضمون نگاروں میں مولانا الطاف حسین حالی، منشی محمد انشاء اللہ خاں فائق دہلوی، منشی میر نصیر علی، سید محمد میر شاہ، عبدالرحیم خاں بیدل اور نذیر علی سکریٹری اہم تھے۔

مراسلہ کشمیر: یہ رسالہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کی شروعات 1872 میں ہوئی تھی۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا جو مطبع نول کشور میں چھپتا تھا۔ یہ رسالہ کشمیریوں

کے لیے مخصوص تھا اور رسالے کے جاری کرنے کا مقصد کشمیریوں کی اصلاح کرنا تھا۔ رسالے میں مضامین کم ہی شائع ہوتے تھے اور کشمیری معاملات سے متعلق کمیٹیوں، انجمنوں، سوسائٹیوں کی روداد اور رپورٹ زیادہ شائع کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی رسالے میں غزلیں اور نظمیں بھی شائع ہو جاتی تھیں۔

مرقع تہذیب: لکھنؤ سے یکم اکتوبر 1873 کو شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ پندرہ روزہ اخبار تھا۔ لکھنؤ کی انجمن 'تہذیب لکھنؤ' کا ترجمان تھا۔ منشی نول کشور کے مطبع میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں بھی خبریں کم ہی شائع ہوتی تھیں اور انجمن کی روداد وغیرہ زیادہ شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ، اصلاحی، تعلیمی، تاریخی مضامین زیادہ شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے میں کتابوں پر تبصرے بھی شائع کیے جاتے تھے۔

کچھ اہم رسائل

1873 میں اجمیر سے رسالہ انجمن رفاہ عام راجپوتانہ کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر پنڈت بھاگ رام تھے۔ یہ کوہ نور پریس لاہور سے چھپ کر آتا تھا۔ یہ سہ ماہی رسالہ تھا اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انجمن رفاہ عام راجپوتانہ کا ترجمان تھا۔ یکم دسمبر 1874 میں گلدستہ بدایوں ماہانہ کی شروعات ہوئی۔ یہ شاعری کا گلدستہ تھا اور اس میں شاعروں کے کلام اور ان کی نگارشات شامل اشاعت ہوتی تھیں۔ لکھنؤ سے 1874 میں گلدستہ شعرا کا آغاز ہوا۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا اور مطبع انوار محمدی میں شائع ہوتا تھا۔ رسالے کے مہتمم مولوی فتح محمد تھے۔ 12 مئی 1874 کو غزل الفوائد کے نام سے ماہانہ رسالہ حیدرآباد دکن سے شروع کیا گیا۔ اس کے بانی اور ایڈیٹر مولوی سید حسین بلگرامی تھے۔ رسالے کے مہتمم مسیح الزماں تھے۔ اس میں اخلاقی، علمی اور تاریخی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ لاہور سے یکم اپریل 1875 میں ہندو بندھو کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ شروع ہوا۔ اس رسالے کے مالک پنڈت شیونرائن اگنی ہوتری تھے۔ یہ کوہ نور پریس سے شائع ہوتا تھا۔ لاہور سے ہی گنجینۂ قانون کے نام سے ایک ماہانہ رسالے کی شروعات کی گئی۔ اس کی تاریخ اجرا

یکم جولائی 1874 تھی۔ 1875 میں ہی لکھنؤ سے انجمن اسلام کا آغاز ہوا جو ماہانہ رسالہ تھا۔ یہ انجمن اسلام کا ترجمان تھا۔ کانپور سے اکتوبر 1875 میں سہ ماہی رسالہ انجمن تہذیب جاری کیا گیا۔ اس کے مہتمم حافظ عبداللہ بلگرامی تھے۔ یہ مطبع نظامی سے شائع ہوتا تھا۔ مراۃ الہند نام کا ایک ماہانہ رسالہ 15 اکتوبر 1875 میں جاری ہوا تھا۔ یہ لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے مہتمم پنڈت کشن نرائن تھے۔ یہ مطبع بہار کشمیر میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے میں خبروں کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، تاریخی مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔

1875 میں ہی کرناٹک میں اردو رسائل کا آغاز ہوتا ہے۔ جنوبی ہند میں اردو ادب کو عروجِ دوام عطا کرنے کی بہت کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ حیدرآباد، بنگلور، گلبرگہ، چنئی جیسے شہروں سے اردو کی بقا کے لیے کافی جد و جہد کی گئی ہے اور آج بھی حیدرآباد و گلبرگہ جیسے شہروں سے اردو کے رسائل و اخبارات بہت بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں اور ان کی رسائی اردو کے ایک بڑے حلقے تک ہے۔ اپریل 1875 میں عبدالمجیب کی سرپرستی میں پندرہ روزہ محافظ بنگلور شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انیس صدیقی اپنی تحقیقی کاوش ''کرناٹک میں اردو صحافت'' میں رقم طراز ہیں:

> ''ریاست کرناٹک بھی اردو رسائل و جرائد کی متنوع و روشن تاریخ رکھتی ہے۔ اپریل 1875 میں عبدالمجیب کی زیر ادارت پندرہ روزہ محافظ بنگلور کا اجرا کرناٹک میں اردو رسائل کی اشاعت کا نقش اول تھا۔ یہ آٹھ صفحات پر مشتمل اخباری صورت میں شائع ہوتا تھا لیکن مشمولات اور ترتیب و تزئین اور تنوع کے اعتبار سے اس میں ایک رسالے کے لیے درکار تمام خوبیاں موجود تھیں۔ محافظ بنگلور کے اجرا کے ساتھ ہی شہر بنگلور سے کئی رسائل جاری ہوئے۔ 1881 میں ماہ نامہ ترغیب شائع ہوا۔ جو خواتین کا اولین رسالہ ہے۔ عبدالحلیم شرر کے ماہنامہ دلگداز کی تقلید میں قادر شریف صابر نے 1881 میں دلسوز جاری کیا شعر وسخن کا موقع شمع سخن 1884 میں منظر عام پر آیا۔ تعلیمی سرگرمیوں اور مسائل سے متعلق ماہنامہ تعلیم عبدالحق

تحقیق کا کارنامہ تھا۔ انیسویں صدی کے آخری دہائی میں جاری ہونے والے
رسائل کرناٹک میں اردو رسائل کی تاریخ کی اہم کڑیاں ہیں۔'' (20)

لاہور سے 1878 میں ماہانہ رسالہ 'اشاعت السنۃ' کی شروعات ہوئی تھی۔ اس رسالے کا مقصد مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیم سے آراستہ کرنا اور انھیں دینی و دنیاوی ترقی میں حصے دار بنانا تھا۔ یہ رسالہ سرسید کے رسالے تہذیب الاخلاق اور ان کے مدرسۃ العلوم کا کٹر مخالف تھا۔ لاہور سے یکم فروری 1878 کو حافظ صحت کے نام سے ایک طبی رسالے کی شروعات کی گئی۔ اس میں صحت کے اصول، خوراک، چھوٹے موٹے امراض اور ان کا علاج جیسے موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ یکم جنوری 1879 میں شاہجہاں پور سے آئینہ ریاضی شروع کیا گیا۔ یہ ماہنامہ رسالہ تھا۔ اکتوبر 1879 میں تیرھویں صدی نام کا ماہانہ رسالہ شروع ہوا۔ یہ آگرہ سے شروع کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ بھی سرسید احمد خاں کی مخالفت کے لیے مشہور تھا۔اس میں سرسید احمد خاں کی مخالفت میں زیادہ تر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ادبی، علمی و تاریخی اور سماجی مضامین بھی اس رسالے کی زینت بنتے تھے۔ آگرہ سے زمانہ کے نام سے ایک ادبی ماہانہ رسالہ نومبر 1883 میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کے بانی اور مالک مولوی خواجہ یوسف علی سکریٹری کمیٹی قانون آگرہ تھے۔ رسالہ زمانہ کے بارے میں امداد صابری لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ تیرھویں صدی کی جانشینی کا حق ادا کرنے کے لیے نکالا گیا تھا اور اس وقت نکالا گیا تھا جب تیرہویں صدی ختم ہوگئی تھی۔ اس کا پہلا پرچہ محرم 1301ھ کو نکلا تھا۔ اس سلسلہ کو قائم رکھنے کے لیے اس کے سرورق پر جلد 4 نمبر 1 پرچہ اولیٰ لکھ دیا تھا۔محرم 1301ھ میں انگریزی مہینہ اور نومبر 1883 پڑتا ہے۔ یہی سال اس کے اجرا کا ہے۔ مالک مولوی خواجہ یوسف علی صاحب اور ایڈیٹر مولوی ناصر علی صاحب تھے۔ (21)

لکھنؤ سے 24 فروری 1884 کو ماہانہ شعری گلدستہ مرقع نگار کی شروعات ہوئی۔ اس کے ایڈیٹر عاشق حسین عاشق اور سب ایڈیٹر مرتضیٰ عاشق تھے۔ اس دوران شروع ہونے

والے کچھ اہم رسائل کے نام اس طرح ہیں۔ماہانہ چمنستان سخن کان پور سے 25 اکتوبر 1884، ماہانہ معلم ہند لاہور سے یکم جولائی 1884، پنجاب لوکل سلف گزٹ گوجرانوالہ سے 15 نومبر 1884، ماہانہ انتخاب لکھنؤ سے شعری گلدستہ یکم نومبر 1884 ماہانہ رسالہ انجمن حمایت الاسلام 1884 میں لاہور سے، ماہانہ خلا سفر آگرہ سے 15 جنوری 1884 کو شروع کیے گئے۔

19ویں صدی کے اواخر میں یوں تو پورے ہندوستان سے مختلف رسائل منظر عام پر آئے تھے لیکن ان کی رسائی ایک محدود حلقے تک ہی تھی۔ ان رسائل میں زیادہ تر شعری گلدستے اور نعتیہ کلام پر مبنی پرچے تھے۔ 19ویں صدی کے اواخر میں ایک اہم ادبی رسالے کی شروعات ہوتی ہے اور وہ عبدالحلیم شرر کا دلگداز تھا۔ دلگداز کی شروعات 25 جنوری 1887 کو ہوئی تھی۔ یہ لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا اور ماہانہ رسالہ تھا۔اس کے مالک اور ایڈیٹر مولوی عبدالحلیم شرر تھے جو انجمن دارالسلام کے سکریٹری بھی تھے۔ یہ رسالہ ایک لمبے عرصے تک جاری رہا اور اردو داں طبقے میں کافی مقبول تھا۔ امداد صابری اس رسالے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ’’اس رسالے میں ادبی سیاسی مضامین بہت کم اور تاریخی مضامین بہت زیادہ ہوتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شرر نے جب سے اس میں ناولوں کو بالاقساط چھاپنا شروع کیا تھا تو لوگوں کی زیادہ توجہ ناولوں پر ہوگئی تھی اور لوگ ناولوں کی مانگ کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اس میں کافی ناول بالاقساط شائع ہوئے۔‘‘ (22)

عبدالحلیم شرر نے اس سے قبل محشر کے نام سے ایک خالص ادبی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔انھوں نے 1890ء میں ایک ادبی اخبار مہذب کا آغاز بھی کیا جس میں ان کے ناول بھی شائع ہوتے تھے۔

1894 میں بمبئی سے ماہانہ گلدستہ عروج بہار شروع کیا گیا۔اس کے ایڈیٹر اور مالک سید اسحٰق حسن شرر مارہروی تھے اور سرپرست جناب شیخ وزیر علی وزیر لکھنوی تھے۔ اس

گلدستے کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں زیادہ تر اتر پردیش اور لکھنوی شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔ بھوپال سے گل رعنا کے نام سے ماہانہ شعری گلدستہ 1895 میں جاری کیا گیا۔ گلدستہ سخن جو کہ ماہانہ رسالہ تھا مئی 1895 میں لدھیانہ سے شروع کیا گیا۔ اس دور کے کچھ اہم رسائل اس طرح تھے۔ مخبر دکنی ماہانہ 27 جون 1895 سے۔ ماہانہ گلدستہ مداح النبی 1895 روہتک سے، انتخاب لاجواب 1895 میں لاہور سے، ماہانہ خدنگ نظر ستمبر 1896 لکھنؤ سے، پروانہ ماہانہ میرٹھ سے اکتوبر 1896 میں، دبدبہ آصفی حیدرآباد سے ماہانہ 1898 تذکرۃ القرآن پٹیالہ سے ماہانہ دسمبر 1898 میں شروع ہوئے۔ بیسویں صدی کے اوائل اور 19ویں صدی کے اواخر میں جو اہم رسائل شروع ہوئے ان میں معارف کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ ماہانہ علی گڑھ سے جولائی 1898 میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کے بانی اور ایڈیٹر وحیدالدین سلیم تھے۔ اس رسالے نے ادبی اور علمی حلقوں میں اپنی ایک منفرد شناخت بنالی تھی لیکن بہت کم عرصے میں ہی یہ رسالہ بند ہو گیا۔ جیسا کہ امداد صابری لکھتے ہیں:

> ''اس رسالے نے چار سال کی زندگی پائی اور 1902 میں بند ہو گیا تھا۔ اس کے بند ہونے پر علمی طبقے میں بہت افسوس کیا گیا اور مسلمانوں کی غفلت اور لاپرواہی کا ماتم کیا گیا۔ اس میں نواب مہدی حسن خاں صاحب بھی شامل تھے۔ اس رسالے میں علمی، فلسفی، اخلاقی، مذہبی، ملکی، تاریخی اور ادبی مضامین شائع ہوتے تھے اور مشرقی و مغربی طرز کی عمدہ نظمیں اور ایک پاکیزہ ناول قسط وار درج کیا جاتا تھا۔ سالانہ چندہ میں انجمن یا طالب علموں کے لیے کوئی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔''(23)

فیروز آباد ضلع آگرہ سے جنوری 1899 میں ادبی ماہانہ رسالہ ادیب جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید اکبر علی اکبرآبادی تھے۔ مرادآباد سے شرارہ کے نام سے علمی رسالہ جنوری 1899 میں منظر عام پر آیا۔ یہ پندرہ روزہ تھا اور 24 صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ جالندھر سے آریہ مسافر ماہانہ رسالہ اکتوبر 1899 سے شروع ہوا۔ اس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی عقائد کی مخالفت میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ خادم الاسلام کلکتہ سے ماہانہ

یکم ستمبر 1900 سے شروع ہوا۔ یہ نظامی پریس کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ مٹیا محل دہلی سے ماہانہ گلدستہ نسیم 1900 میں شروع کیا گیا۔ اس گلدستے کے سرپرست محمد عبدالستار اختر اور مہتمم مفتی قربان علی بسمل تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے حیدرآباد سے شروع ہوئے ایک رسالے افسر کی ادارت کی تھی اس رسالے کو افسرالدولہ بہادر کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ رسالہ 1899 میں جاری ہوا تھا اور 1901 تک جاری رہا تھا۔ جناب عابد رضا بیدار لکھتے ہیں:

> ''قواعد وضوابط کی رو سے اس رسالے کا مقصد ہر قسم کے علمی، اخلاقی، تاریخی، فلسفی اور تمدنی وخوبی مضامین اور عمدہ کتابوں پر ریویو شائع کرتا تھا۔ ہر ماہ سب سے عمدہ مضمون کے لیے ایک اشرفی نذر مقرر تھی۔ رسالہ شروع میں 32 پھر 48 اور بالآخر 56 صفحات پر مشتمل تھا۔'' (24)

انیسویں صدی کے اواخر تک اردو صحافت ایک بار پھر اپنے پُرانے حالات پر واپس آنے لگی تھی۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جس طرح سے پریس اور اخبارات پر روک لگا دی گئی تھی وہ اردو صحافت کا بہت افسوسناک باب تھا لیکن سرسید احمد خاں، عبدالحلیم شرر، وحید الدین سلیم، منشی سجاد حسین، منشی محبوب عالم جیسے اردو صحافت کے نامور سپوتوں نے صحافت کو دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک اردو صحافت میں نئے نئے تجربے ہونے لگے تھے اور مغربی ادب کا ایک بڑا حصہ ترجمے کی شکل میں اردو حلقوں تک پہنچنے لگا تھا۔ بعد میں اس روایت کو منشی دیا نرائن نگم اور شاہد احمد دہلوی نے اور بھی آگے بڑھایا۔ اگر یہاں یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسی عہد میں ادبی صحافت کا مفہوم واضح ہو سکا اور لوگ اخبارات کے علاوہ رسائل و جرائد کو بھی اردو صحافت کا اہم حصہ تصور کرنے لگے۔ اس وقت کے رسائل کی صحافت میں اصلاح کا عنصر، تعلیمی اور تمدنی اصلاحات کرنے کا مقصد، لوگوں میں سیاسی معاشرتی اور سماجی بیداری پیدا کرنے کا جذبہ اور اردو داں حلقے کو ایک بہتر اور پرسکون زندگی گزارنے اور اپنے طرزعمل میں تبدیلی لانے جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس وقت کی ادبی صحافت میں ایک بڑی تعداد شاعری کے گلدستے اور شعرا کے

کلام پر مبنی رسائل کی ہے جن میں زیادہ تر ایسے رسائل ہیں جو کسی انجمن کے ترجمان کے طور پر شروع کیے گئے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ رسائل انجمن اور سوسائٹیوں کے مقاصد اور ان کی سرگرمیوں کے تعلق سے زیادہ مواد شائع کرتے تھے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صحافت کا عنصر بھی اس میں شامل رہتا تھا اور اعلیٰ قسم کے مضامین، خبروں کے تجزیے، ترجمہ شدہ مضامین، سرکاری اعلانات و اشتہارات جیسی تحریریں بھی عموماً شائع کی جاتی تھیں۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی صحافت کا مقصد اور نظریہ صحافت کے زریں اصولوں پر پورا اترتا ہے اور اس وقت ادبی صحافت بھی اخباری صحافت کی طرح ہی کافی اہم اور قابل قدر تھی۔ ادبی صحافت کا یہی وہ دور تھا جب اردو ادب میں نئی اصناف کا ارتقا ہوا اور ادب وصحافت میں نئے نئے تجربے کیے گئے۔ انشائیے، سوانح عمری، خاکے، ناول، ڈرامے، تنقید، بحث و مباحثے، تاریخی مضامین، مزاحیہ مضامین، آپ بیتی اور مضمون نگاری کی شروعات ادبی صحافت کے اسی دور میں ہوئی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر کی ادبی صحافت نئی صدی کا سامنا کرنے کے لیے خود کو بہت حد تک تیار کر چکی تھی اور اردو صحافت جو کچھ دنوں پہلے تک اخبارات اور پمفلٹ تک محدود تھی اب رسائل و جرائد، گلدستوں اور پندرہ روزہ و ماہانہ پرچوں اور رسائل کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئی۔

اردو کے اہم ادبی رسائل (1901 سے 1947 تک)

بیسویں صدی کی شروعات ایک نئے ہنگامے کی شکل میں ہوئی اور دوسرے شعبوں کی طرح صحافت میں بھی نئے نئے تجربے کیے جانے لگے۔ نئی نئی ایجادات اور نئے تجربوں نے اردو صحافت کو ایک نئی سمت عطا کی اور اردو صحافت بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی صحافت کی طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئی۔ بیسویں صدی کی شروعات ایسے وقت میں ہوئی جب انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض تھے اور ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت و بغاوت کا لاوا ابل رہا تھا اور نفرت کے اس جذبے نے صحافت کو فائدہ ہی دیا ہے۔ اس سلسلے میں رئیس الدین فریدی لکھتے ہیں :

''بیسویں صدی ہندوستان کے لیے زبردست انقلاب لے کر آئی۔ کانگریس نے جو اس سے پہلے ہی قائم ہو چکی تھی ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنی شروع کی۔ مسلم لیگ کا قیام، تقسیم بنگال کی تجویز، ایشیا اور افریقہ پر مغربی ملکوں کی تاخت و تاراج، کانپور کی مسجد کا واقعہ، ترکی سلطنت کی تباہی کا آغاز، پہلی عالمی جنگ، جلیاں والا باغ کی خوں ریزی وغیرہ نے جمع ہو کر سوراج اور خلافت کی تحریک کا راستہ تیار کیا۔ اس سے اردو اخبار بھی شدت سے متاثر ہوئے اور نئے نئے اخبار نکلنے لگے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ انگریزوں کے خوشامدی اخبار دب گئے اور اردو صحافت انگریزوں کی مخالفت کے لیے شمشیر عریاں ہو گئی۔ یعنی پچاس سال سے بھی کم مدت میں 1857 کا سماں پھر پیدا ہو گیا۔ ان دنوں اردو اخباروں کی اشاعت بھی کافی بڑھ گئی۔ یہ دور اردو صحافت کا سنہرا دور تھا۔'' (25)

صحافت کے بارے میں یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اگر سچے اصولوں پر قائم رہ کر صحافت کی جائے تو ہی کامیاب صحافت کہلاتی ہے اور کوئی صحافی تب ہی سچا صحافی کہلائے گا جب اس نے صحافت کے اصولوں کو پورا پورا برتا ہو اور صحافت کی تمام باریکیوں، تمام نکات اس پر واضح ہوں۔ بہت پرانا مقولہ ہے کہ انسان اپنی زبان اور لہجے سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ بات صحافت پر صد فی صد درست اترتی ہے۔ اگر صحافت میں صبر اور ضبط وتحمل کا دامن نہ چھوڑا جائے اور اخلاقی اقدار کے دائروں میں رہ کر صحافت کی پاسداری کی جائے تب ہی صحافت کو ہم صحیح معنوں میں صحافت سے تعبیر کر سکیں گے۔ بیسویں صدی کی شروعات، جہاں کئی نئے اخبارات و رسائل سے ہوئی تھی وہیں ان اخباروں و رسائل کا واضح مقصد ہندوستان کو آزادی دلانا تھا۔ فرحت احساس لکھتے ہیں:

''19ویں صدی میں صحافیانہ سرگرمیوں کے آغاز کے بعد 20ویں صدی میں جب ملک کے سماجی اور سیاسی حالات ایک شدید اتھل پتھل کی گرفت میں آ چکے تھے صحافت کے شخصی اظہار کی صورتیں بے انتہا بلیغ الدماغ۔

فصیح القلب، وسیع الشعور، قوی الفکر، جری الاظہار اور راسخ القلم افراد کی ایک تابناک کہکشاں بن کر ظاہر ہوئیں۔ ملک کی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں جیسے بے شمار افرادنظر آتے ہیں جن کی شخصیت کا ایک حصہ صحافی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ در اصل ان کی ذاتی حیثیت کا یہ صحافیانہ حصہ ہی اُن کی اجتماعی شخصیت کی تشکیلی بنیاد تھا۔صحافت ان کے لیے ایک شخصی اظہار کا وسیلہ اور وہ سب کچھ تھا جسے وسیع تر معنی میں مشن کہا جاتا ہے۔یعنی ایک خواب، ایک آدرش، ایک غالب خیال اور نصب العین کے تعاقب اورحصول کے لیے اپنی ساری زندگی کو وقف کر دینا۔'' (26)

مخزن: بیسویں صدی کے آغاز میں ہی اردو اخبارات کے ساتھ ساتھ اردو رسائل کی بھی شروعات ہو گئی تھی۔ بیسویں صدی میں ادبی صحافت کی شروعات شیخ عبدالقادر کے رسالہ مخزن سے ہوتی ہے۔اپریل 1901 میں یہ ماہنامہ شروع کیا گیا تھا۔48 صفحات پر مشتمل اس رسالے کی شروعات انجمن پنجاب کے ذریعے کی گئی تھی۔ اس مجلّے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں نئے شاعروں اور ادیبوں کو متعارف کرایا جاتا تھا اور ان کی سفارشات اس مجلّے میں شامل کی جاتی تھیں۔ سرزمین پنجاب سے یہ پہلا مجلّہ تھا جو ایک بڑے اور اہم مقصد کو سامنے رکھ کر شروع کیا گیا تھا۔مخزن پر تبصرہ کرتے ہوئے محترمہ روشن آرا راؤ لکھتی ہیں :

''بیسویں صدی کے آغاز میں ابھرنے والے ادیب وشاعرمخزن کی پیداوار کہے جا سکتے ہیں۔ اس مجلّے نے نئے ادیبوں کو متعارف کروایا۔ علامہ اقبال، ظفرعلی خاں، راشد الخیری، ناصر، نذیر، فراق، سید سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد کی تحریریں اس مجلّے میں خصوصیت سے شائع ہوئیں افسانے کی صنف کو متعارف کروانے میں بھی مخزن کا نام آتا ہے۔سجاد حیدریلدرم اور سدرشن کے افسانوں کی اشاعت کا اہتمام ہوتا رہا۔ افسانے،لطیف،

طنز و مزاح، فن تنقید، آپ بیتی اور سوانح عمری کی اصناف کو جدید رنگ میں پیش کیا گیا۔ شیخ عبدالقادر، علامہ اقبال، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، جدید انگریزی زبان و ادب پر بھرپور گرفت رکھتے تھے ان کی تحریروں سے مخزن کو خصوصی مقام ملا۔ مخزن کی رومانی تحریک کے اثرات اردو ادب پر اس درجہ راسخ ہوئے کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز تک ادب کی تمام اصناف پر رومان پسندی کا غلبہ رہا۔ مخزن کے عہد میں ابھرنے والے تمام مجلّات اسی تحریک کی پیداوار تھے۔'' (27)

مخزن کی رومانی تحریک نے ادب اور صحافت پر کافی اثرات مرتب کیے اور اس وقت جاری ہونے والے تمام رسائل میں اس تحریک کا اثر نظر آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے تک رومان پسندی ادب کی تمام اصناف پر اثر انداز ہوئی۔ اس دوران شروع ہونے والے اہم رسائل میں الناظر، زمانہ، معارف، جامعہ، الندوہ، عصر جدید، علی گڑھ منتھلی، اردوئے معلیٰ، ادیب الہ آباد، کہکشاں، ساقی، اردو، ہزار داستان، نقاد۔ آگرہ، نگار، فانوس خیال، بہارستان، ہمایوں، نیرنگ خیال، نقاد۔ لاہور، عالمگیر، شمع، اورینٹل کالج میگزین، ادبی دنیا، نیا ادب، شاہراہ، آئینہ، آفتاب، ادب لطیف، ادیب۔ دہلی، سویرا۔ لاہور، سالنامہ کارواں، ادیب۔ پشاور کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ان رسائل کے علاوہ بچوں اور خواتین کے درجنوں رسائل شروع کیے گئے۔ ظاہر ہے ان سبھی رسائل کا ذکر یہاں کرنا ممکن نہیں ہے۔ بیسویں صدی میں نکلنے والے اہم رسائل پر سرسری نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔

زمانہ: مخزن کے بعد دوسرا سب سے اہم اور قابل ذکر رسالہ 'زمانہ' ہے، جسے منشی دیا نرائن نگم نے کانپور سے فروری 1903 میں شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ پہلے بریلی سے نکلنا شروع ہوا تھا لیکن بعد میں اسے کانپور منتقل کر دیا گیا۔ یہ رسالہ اس لیے بھی اہم ہے کہ ایک لمبے عرصے تک نکلتا رہا اور 1943 کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی۔ اس رسالے میں اعلیٰ سطح کے مضامین شعرا کے کلام اور کتابوں پر تبصرے و تنقید شائع کی جاتی تھیں۔ ستمبر 1914 میں

اسی رسالے میں علامہ اقبال کا قومی ترانہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا پہلی دفعہ شائع کیا گیا۔ زمانہ کی زبان عام فہم اور سر سید کی نثر سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے زمانہ کے پرانے فائلوں کا مطالعہ کیا ہے اور اس میں سب سے اہم بات یہ نظر آتی ہے کہ زمانہ اپنے وقت میں اعلیٰ پائے کی صحافت کا ترجمان تھا اور صحافت کے تمام اصولوں پر پورا اترتے ہوئے زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس میں مضامین کے ساتھ ساتھ، زمانہ کے پرانے فائلوں کو خریدنے کے لیے اشتہارات واعلانات، خاص نمبرات کو خریدنے کا اشتہار، دوسرے رسالوں کے خاص نمبروں پر تبصرے، مختلف دواؤں کے اشتہارات وغیرہ بھی شائع کیے جاتے تھے۔ زمانہ میں جہاں ایک طرف خالص ادبی سفارشات شامل اشاعت ہوتی تھیں وہیں دوسری طرف عام لوگوں کی دلچسپی کی تحریریں بھی شائع کی جاتی تھیں اور یہ رسالہ ہر خاص و عام میں مقبول تھا۔ کچھ مضامین کی فہرست ملاحظہ ہو:

جذبات جگر: حضرت جگر مراد آبادی، 9، جنوری 1938

ہندوستان کے بینک: مسٹر عبدالرحیم شبلی بی کام، 11، جنوری 1938

اثر عظیم آبادی: سید رضا قاسم صاحب، 12، جنوری 1938

چتوڑ اور بھوپال کے قلعے: رائے زادہ گوبند پرشاد آفتاب، 33، جنوری 1938

تنقید کتب آرین میڈیکل سائنس فائل سازی، 40، جنوری 1938

جذبات فراق: فراق گورکھپوری134، فروری 1938

قدیم ہندوستان اور ہندو مسلم تعلقات، سید طفیل احمد بنگلوری، 72، فروری 1938

چکبست اور جذبہ حریت: مسٹر جے چودھری، 281، مئی 1938

ڈاکٹر سر اقبال، 325، مئی 1938

اقبال اور تصوف: از مسٹر دیال پرشاد مہتا 145، مئی 1938

اس دوران تقریباً ہر ماہ زمانہ کے پرانے فائلوں کے تعلق سے ایک اشتہار شائع ہوتا رہا ہے جو اس طرح تھا۔ زمانہ کے پرانے فائل :

دفتر ہٰذا میں 1926 سے پرانے فائل موجود ہیں۔ زمانہ کے تشنگان ادب

خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور باتصویر رسالہ 35 سال سے اردو زبان و ادب کی کس قدر مسلسل خدمت انجام دے رہا ہے اس کے نقادانہ مضامین اور گراں پایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں... منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے۔'' (28)

ایک مضمون کی کچھ سطریں بھی ملاحظہ ہوں:

قدیم ہندوستان اور اس زمانے کے ہندو مسلم تعلقات

''بدقسمتی سے آج کل ہندوستان کے متعلق ایک خیال یہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ زمانہ سابق میں مختلف اقوام کے حملہ آوروں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کی نہ جان و مال محفوظ تھی نہ اُن کے کسی قسم کے حقوق تھے نہ یہاں عدل و انصاف تھا نہ لوگوں کو کسی قسم کا امن و سکون حاصل تھا اور نہ فارغ البالی اور خوشحالی کا پتہ تھا اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ آج کل یہ سب چیزیں حاصل ہیں۔'' (29)

رسالہ زمانہ میں جہاں تاریخی، ادبی، معاشرتی، سماجی و سیاسی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ وہیں دوسری طرف خالص سائنسی، فلسفہ، علم نجوم، اور اقتصادی معاملات سے متعلق بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ کبھی بینکوں کی تفصیلات دی جاتی تھیں تو کبھی ہندوستان میں علم نجوم کی اہمیت کے تعلق سے مضامین دیے جاتے تھے۔ یہ سب باتیں زمانہ کو اُس دور کے تمام رسالوں میں ممتاز بناتی ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم نے عام فہم نثر اور کم قیمت میں ہندوستان کی عوام کو ایک بیش بہا ہیرا زمانہ کے روپ میں دیا اور جس سے زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کو بھی فائدہ پہنچا۔ زمانہ میں مستقل لکھنے والوں میں تلوک چند محروم، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، پریم چند اور ڈپٹی نذیر احمد کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اردوئے معلیٰ: اردوئے معلیٰ کو علی گڑھ سے مولانا حسرت موہانی نے جولائی 1903 میں جاری کیا تھا۔ یہ خالص ادبی اور سیاسی رسالہ تھا۔ اس رسالے کا مقصد لوگوں کے سامنے

ایک ایسا تہذیبی میگزین پیش کرنا تھا، جس میں تاریخی، سوانحی، تمدنی، ادبی و سیاسی مضامین بھی شائع ہوں گے۔ اردوئے معلیٰ نے بھی کافی لمبی عمر پائی اور مارچ 1942 تک نکلتا رہا۔ مئی 1908 سے ستمبر 1909 کے درمیان اس کی اشاعت بند رہی۔ اکتوبر 1909 میں یہ دوبارہ شروع ہوا اور حسرت موہانی نے مشاہدات زنداں کے عنوان سے اپنی قید و بند کی داستان اس رسالے میں قسط وار پیش کی۔حسرت موہانی اپریل 1916 میں پھر گرفتار ہوئے۔ ان کے آزاد ہونے کے کچھ مہینوں بعد رسالہ پھر شروع ہوا۔1917 سے 1924 تک اردوئے معلیٰ کی اشاعت جاری رہی۔ 1924 میں وہ پھر سے جیل چلے گئے۔ رسالہ بند ہوگیا، لیکن کچھ دنوں بعد جیسے ہی رہا ہوئے انھوں نے رسالہ شروع کردیا۔ انگریزوں کے ذریعے انھیں قید و بند کی کتنی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں لیکن اس مرد آہن کے حوصلے میں ذرا کمی نہیں آئی۔ آخری دم تک وہ اردو صحافت اور ادب کی پاسداری کرتے رہے۔حسرت موہانی خود بھی اعلیٰ پائے کے شاعر تھے اس لیے اردوئے معلیٰ میں بھی انھوں نے اعلیٰ پائے کی تخلیقات شامل کیں اور ہندوستانی عوام کو ایک بہترین مجلّہ دیا۔محترمہ روشن آرا راؤ لکھتی ہیں :

> ''یہ سیاسی مقاصد کے تحت جاری ہونے والا پہلا مجلّہ تھا جو ایک مسلمان مدیر کی زیر ادارت نکلنا شروع ہوا۔ اردوئے معلیٰ نے پہلی بار سیاست کا رخ موڑ کر بے باک اور نڈر انداز میں لکھنا شروع کیا۔ کیونکہ اس سے بیشتر اسلامی صحافت معتدل مزاج کی حامی تھی۔ مولانا حسرت موہانی بیباک لیڈر، حریت پسند، آزاد خیال سیاسی رہنما اور صحافی تھے۔ ان کے ان نظریات کی ترجمانی اور عکاسی اردوئے معلیٰ کر رہا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے سیاسی شعور کی بیداری میں اردوئے معلیٰ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔
> علمی و ادبی اعتبار سے بھی یہ اپنے دور کا بہترین مجلّہ تھا۔''(30)

اردوئے معلیٰ مطبع فیض عام علی گڑھ میں شائع ہوتا تھا۔ اردوئے معلیٰ میں شاعر یا ادیب کی سوانح، تاریخ اسلام، بجٹ ہند، نیشنل کانگریس، غیر مما لک کے حالات اور اس کے علاوہ حصہ نظم میں محشر، کوثر، عزیز، حفیظ، کیفی وغیرہ کی نظمیں وغزلیں شائع کی جاتی تھیں۔

رسالے میں غیر ملکی ادب کے شہ پارے بھی ترجمے کے بعد شائع ہوتے تھے۔ اردوئے معلیٰ کو اردو رسائل میں اس لیے بھی فوقیت حاصل ہے کہ حسرت موہانی نے اس رسالے میں شروع سے ہی انگریزوں کی مخالفت میں مضامین لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ملاحظہ ہو ایک مضمون سے یہ اقتباس :

''ہندوستان کے نادان دوست''

دشمن دانا بہ از نادان دوست مشہور مثل ہے جس کی سچائی حسب معمول ہندوستان کے موجودہ زمانہ اضطراب میں بھی قطعی طور پر ثابت ہو گئی ہے۔ مثلاً انگریز چونکہ ہندوستان کے دشمن ہیں لیکن دانا دشمن، اس لیے ان کے جبر وتعدی سے بھی ہندوستان کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ چنانچہ اہل ہند میں بیداری کے آثار درحقیقت حکومت کے اسی سخت برتاؤ کے ذریعے سے وجود میں آئے ہیں۔ برخلاف اس کے بعض ہندوستانیوں اور ان کے ہمدردوں سے بحیثیت نادان دوست ایسی ایسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کی تلافی غالباً مدت دراز تک نہ ہوں گی۔ مسلمان تو خیر خوشامدی مشہور ہو چکے ہیں۔ ہندو اور خصوصاً امن کا وہ فرقہ بھی جس کو اپنی آزاد خیالی و حق پرستی پر ناز ہے، حکومت کے خوف سے چاپلوسی کے اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں تک پہنچنے کا اس سے قبل کسی کو گمان ہی نہ ہو سکتا تھا۔'' (31)

حسرت موہانی نے جس طرح کی ہمت اور جرأت کے ساتھ ایسے مضامین لکھے ہیں وہ قابلِ داد ہیں اور ایسے ہی مضامین ان کی قید و بند کی وجہ ثابت ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے رسالے میں صاف صاف لفظوں میں کھل کر انگریزوں کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ انگریزوں کے ساتھ ساتھ ان کے چاپلوس، جس میں بڑے بڑے راجہ اور نوابین شامل تھے انھیں بھی اپنے رسالے کے ذریعے خبردار کیا اور ظاہر ہے کہ ایسے مضامین پڑھ کر کوئی بھی شخص جس کے خلاف لکھا گیا ہو ناراض ہوگا اور حسرت موہانی کے ساتھ بھی ایسا ہوا اور انھیں بھی کافی نفرت و عداوت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے اردوئے معلیٰ کے ذریعے کانگریس

کی تائید کی اور مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ جوق در جوق کانگریس پارٹی میں شامل ہوں۔ کیونکہ یہی وہ پارٹی ہے جو ہندوستان کو مکمل آزادی دلا سکتی ہے۔ ڈاکٹر شریف الدین اپنی کتاب 'اردو صحافت اور حسرت موہانی' میں لکھتے ہیں:

> ''حسرت کے اردوئے معلیٰ کی اشاعت سے قبل اردو صحافت کا معیار سیاسی، علمی اور ادبی لحاظ سے بھی کچھ کم نہ تھا۔ بلکہ الہلال، البلاغ، ہمدرد، زمیندار، مخزن، دلگداز، زمانہ اور معارف وغیرہ نے بھی اردو صحافت کے معیار کو ہر سطح پر کافی بلند کر رکھا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود مولانا حسرت نے صحافت میں جو نئی روح پھونکی وہ یہ کہ انھوں نے اردوئے معلیٰ کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ جس نے مسلمانوں میں سیاسی اور ادبی شعور پیدا کیا۔ انھوں نے بے خوف اور نڈر ہو کر مصلحت کوشی کے خلاف جھنڈا بلند کیا۔''(32)

بیسویں صدی کی شروعات میں حسرت موہانی کے رسالہ اردوئے معلیٰ نے ادبی صحافت کو ایک نیا مقام اور نئی سمت عطا کی۔ اردوئے معلیٰ میں جہاں خالص ادبی مضامین شائع ہوتے تھے وہیں نیم ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات کو بھی جگہ ملتی تھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں مولانا حسرت موہانی کو ایک اچھے شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے لیکن وہ اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ایک نڈر اور بے باک صحافی بھی تھے۔

رسالہ عصمت: رسالت عصمت سے پہلے یوں تو مختلف ادبی اور نیم ادبی رسالے نکل رہے تھے لیکن عورتوں کے لیے ان میں کم ہی مواد ہوتے تھے۔ اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ ایک ایسا رسالہ بھی شروع ہو جس میں عورتوں کی تعلیم و تربیت اور زندگی گزارنے کے طور طریقوں کے متعلق کچھ بتایا جائے اور جو خالصتاً خواتین کے لیے ہو۔ انھیں سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دہلی سے جون 1908 میں رسالہ عصمت جاری کیا گیا۔ محترمہ جبیں انجم لکھتی ہیں:

> ''چنانچہ مسلم خواتین کو معلومات کے ساتھ دلچسپ مضامین بہم پہنچانے کے

لیے جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے مخزن پریس دہلی سے جون 1908 میں عصمت کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کیا جس کا مقصد عالم نسواں کی ترقی تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ کسی شہر میں خواتین کی ترقی سے دوسرے شہروں کی خواتین کو بھی واقفیت حاصل ہوجاتی۔عصمت نے اس ترقی کے تمام حالات مختلف ذرائع سے جمع کر کے ان کی طرف دوسری خواتین کو متوجہ کرایا اور ان کے لیے تبادلۂ خیال کا ایک مؤثر ذریعہ فراہم کیا۔'' (33)

رسالہ عصمت ایک باتصویر رسالہ تھا۔ اس میں خواتین کے تعلق سے ہر قسم کے موضوعات کو شامل کیا جاتا تھا۔ علمی، تاریخی، ادبی، سماجی، و معاشرتی مضامین کے علاوہ امورِ خانہ داری، بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ کے موضوعات پر مبنی مضامین کو بھی شامل اشاعت کیا جاتا تھا۔ عصمت میں خواتین مضمون نگاروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور انھیں زیادہ اہمیت دی جاتی تھی جس سے خواتین میں لکھنے پڑھنے اور تعلیم و تربیت کے تعلق سے دلچسپی پیدا ہو۔

فانوس خیال: اس رسالے کی شروعات پٹھان کوٹ سے کی گئی تھی۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا اور جون 1914 کو اس کی شروعات ہوئی تھی۔ یہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو منظر عام پر آیا کرتا تھا۔ رسالے کے ایڈیٹر ابوالرشید عبدالمجید سالک بٹالوی تھے۔ یہ رسالہ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے شروع کیا گیا تھا اور رسالے کا مقصد تھا کہ اس میں بہترین اور اعلیٰ سطح کی شاعری، نثر پارے اور مختلف ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر مضامین شائع کیے جائیں۔ اس کے علاوہ دوسری زبانوں کی خوبصورتی اور چاشنی کو اردو زبان میں لایا جائے۔ اس رسالے میں غزلیں، نظمیں، افسانے اور حکومت کے تعلق سے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔

معارف: علامہ سید سلیمان ندوی کی ادارت میں اعظم گڑھ سے جولائی 1916 میں اس رسالے کی شروعات ہوئی۔ یہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ کا ترجمان تھا یہ ایک بہترین علمی و دینی رسالہ تھا۔ یوں تو بیسویں صدی کی شروعات کے بعد اردو رسائل کی جیسے ایک باڑھ سی آگئی تھی اور ہر دوسرے مہینے کوئی نہ کوئی اردو رسالہ شروع ہو رہا تھا لیکن ان رسالوں میں بہت کم تعداد ایسے رسالوں کی تھی جو کچھ مہینوں تک لگاتار شائع ہو پاتے تھے ورنہ زیادہ تر

مجلّے اپنے آغاز کے بعد دو تین مہینوں کے اندر دم توڑ دیتے تھے۔ ایسے وقت میں علامہ سیدسلیمان ندوی نے معارف کے نام سے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک بہترین رسالہ شروع کیا جو اب تک جاری ہے۔ ڈاکٹر اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولانا نیاز فتح پوری، مولوی الف دین، حاجی عبد الرحمٰن حیرت، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا الطاف حسین حالی، جیسے اس وقت کے اہم اور معروف اہل قلم، ادیب، مورخ اور شاعروں کے مضامین اور تخلیقی نگارشات اس رسالے کی زینت بنتی تھی۔ مولانا امداد صابری ڈاکٹر اقبال کا قول دہراتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''اس رسالہ نے جو سنجیدہ اور تحقیقی لٹریچر پیش کیا ہے اس سے اس رسالے کی مقبولیت ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال نے رسالہ معارف کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔'' (34)

نگار: نگار کی شروعات اردو کے مشہور ادیب، نقاد اور دانشور نیاز فتح پوری نے کی تھی۔ یہ رسالہ 1922 میں لکھنؤ سے شروع کیا گیا تھا۔ایک طویل عرصے تک اس رسالے نے اردو کی ادبی صحافت کو جلا بخشی۔ نیاز فتح پوری نے اپنے رسالے کے ذریعے اردو صحافت کو مستحکم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ رسالہ اپنے خصوصی نمبروں کی وجہ سے آج بھی جانا جاتا ہے۔ اس رسالے نے ہر سال ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر شریف الدین لکھتے ہیں:

> ''اس رسالے کی سب سے عمدہ خوبی یہ تھی کہ یہ سال کے آخر میں کسی اہم موضوع پر خصوصی شمارہ پیش کرتا تھا۔ نگار نے اردو کے بہت سے اہم شعرا کے نمبر نکالے جیسے مومن، غالب، بہادر شاہ ظفر وغیرہ''۔ (35)

رسالہ اردو: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کے ذریعے یہ سہ ماہی رسالہ جنوری 1921 میں جاری کیا گیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ انجمن کی سرگرمیوں اور خبروں کے ساتھ ساتھ اس میں بہترین علمی و تحقیقی اور ادبی مضامین شائع کیے جاتے

تھے۔ یہ رسالہ ایک لمبے عرصے تک اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ 1947 کے بعد یہ رسالہ کراچی سے نکلنے لگا۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور اردو زبان کے فروغ میں اس رسالے کا اہم رول رہا ہے۔ یہی رسالہ بعد میں اردو ادب کے نام سے دہلی سے شائع ہوا۔رسالہ اردو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر محمد یونس رقم طراز ہیں:

''رسالہ اردو ایک خالص ادبی رسالہ تھا۔ یہ جس وقت جاری ہوا اس وقت دلگداز، الناظر، اردوئے معلیٰ، العصر اور بزم جیسے متعدد اور مختلف النوع اعلیٰ پائے کے رسالے شائع ہو رہے تھے۔لیکن' اردو' نے ان تمام رسائل کے مقابلے اپنی انفرادیت ہمیشہ برقرار رکھی چنانچہ خالص ادبی نقطہ نظر سے اس کا مقام ان تمام رسالوں سے بلند ہے۔ یہ خصوصیت ثمرہ تھی ان اغراض و مقاصد کا جن کا تعین اس کے اجرا کے وقت بھی کر دیا گیا تھا۔'' (36)

یہ رسالہ شروع سے ہی ایک اعلیٰ معیار قائم کیے ہوئے تھا اور اس کے قاری اس کے تحقیقی اور ادبی مضامین کی کافی تعریف کیا کرتے تھے۔اس میں نظم و نثر اور اعلیٰ درجے کے مضامین شامل اشاعت ہوتے تھے۔ اس رسالے نے اردو کی ترویج و اشاعت میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

''انجمن کا مشہور و معروف سہ ماہی رسالہ'اردو' ہندوستان کے نہایت کارآمد اور مشہور رسائل وجرائد میں سے ہے اور اس میں زبان و ادب اردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دل چسپ مضامین ہوتے ہیں۔'' (37)

اس کے علاوہ آزاد ہندوستان کے پہلے رسالہ اردو ادب کے اداریہ حرف آغاز میں پروفیسر آلِ احمد سرور نے بھی لکھا تھا:

''انجمن ترقی اردو ہند کے رسالہ اردو نے 1922 سے 1947 تک اردو میں تحقیق و تنقید کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ اس نے ماضی کے سیکڑوں تاریک گوشوں کو روشن کیا۔ اس نے ادبی بُت توڑے اور بنائے۔ اس نے تنقید کو تحسین و تاثر سے آگے بڑھا کر علمی اور سائنٹفک بنایا۔'' (38)

یہاں آل احمد سرور نے 1922 لکھا ہے جبکہ رسالہ اردو 1921 میں جاری ہوا تھا۔ یہاں 1922 شائع ہونے کی وجہ شاید ٹائپ کی غلطی ہو۔

رسالہ 'اردو' اردو صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ برصغیر میں اردو تحقیق و تالیف اور ترقی کا کام سر سید احمد خاں کی وفات کے بعد تک کسی حد تک سرد پڑ گیا تھا۔ لیکن مولوی عبدالحق اور انجمن کے قیام کے بعد اردو کی ترویج و اشاعت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ رسالہ اردو تقسیم کے بعد پاکستان سے نکلنا شروع ہوا۔

ہمایوں: اس مجلّے کی شروعات جنوری 1922 میں ہوئی۔ میاں بشیر احمد اس کے مدیر تھے۔ سر عبدالقادر اور علامہ اقبال اس مشہور رسالے کے سرپرست رہ چکے ہیں۔ اس رسالے نے مشرقی ومغربی تہذیب کو ایک ساتھ فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیاست کے موضوعات پر مشتمل مضامین بھی اس رسالے میں شائع کیے جاتے تھے۔ ترقی پسند تحریک اور عام انسانوں کے ادب کے فروغ میں اس رسالے نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس رسالے نے ادب میں عام انسان کی زندگی کی عکاسی کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب رہا۔

جامعہ: جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سوسائٹی کے زیر اہتمام اس مجلّے کی شروعات جنوری 1923 میں ہوئی تھی۔ یہ رسالہ معارف اور زمانہ کی طرز پر شروع کیا گیا تھا۔ اس میں جامعہ کی سرگرمیاں تو شائع ہوتی ہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملکی وغیر ملکی سیاست پر مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ، ادبی مضامین، فلسفہ، مختلف علوم، سائنس، علوم جدید جیسے اہم و دقیق موضوعات پر اس رسالے میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ یہ رسالہ کسی دانش گاہ کا پہلا ایسا ایک مقبول عام رسالہ ہے جو شروع سے ہی بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا رہا ہے۔

رسالہ جامعہ کے جنوری-جون 1923 کے شمارے میں تقریب کے عنوان سے اداریہ شائع ہوا ہے جس میں نورالرحمٰن نے رسالے کی غرض و غایت اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''ہر دارالعلوم کی یہ بھی قدیمی سنت ہے کہ اس کا ایک مخصوص علمی رسالہ ہو لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس کو اس وقت تک ضروری نہیں سمجھا کہ طلبہ کے علمی ذوق، مشاغل تصنیف و تالیف کی مقبولیت اور جامعہ کی علمی زندگی کی تدریجی ترقی کے ساتھ خود رسالہ کا وجود بھی مسئلہ ارتقا کے عالمگیر اثر میں پیدا نہ ہوجائے۔ چنانچہ تقریباً ایک سال تک طلبائے جامعہ اپنے رسالہ جوہر کو قلمی نکالتے رہے اور اس طرح وہ تمام اسباب جو ایک علمی رسالہ کی اشاعت کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں خود ہی فراہم ہوگئے جن کی موجودگی میں مجلس تعلیمی کو رسالہ جامعہ کی طبع و اشاعت کی منظوری دینا ضروری ہوگیا۔ اس عرصہ میں شعبہ تصنیف و تالیف کی گزشتہ یک سالہ کوششوں کے نتائج بھی ظاہر ہونے لگے تھے اور آئندہ کے لیے بھی تنظیم و ترتیب کے ابتدائی مدارج سے فراغت حاصل ہوچکی تھی لہٰذا اِس بار گراں کا اِس شعبہ کو ذمہ دار قرار دینا زیادہ دشوار نہ ہوا اس اظہار سے غالباً یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ رسالہ جامعہ جو بفضل خدا آج آپ کے ہاتھوں میں ہے کسی رسمی ضرورت یا خارجی اثر سے نہیں بلکہ خود ہی عالم وجود میں آیا ہے گویا:

ما بنودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گرد دفن ما

اور یہ جامعہ ملیہ جیسے تعلیمی مرکز کے لیے ہرگز قابل تعجب بھی نہیں۔

جامعہ کے متعلق اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ گرچہ یہ رسالہ شعبہ تصنیف و تالیف کے زیرنگرانی شائع ہوگا لیکن یہ طلبہ جامعہ ملیہ کا ہی رسالہ ہے انھیں کا ہاتھ اِس کی ترتیب و تہذیب میں انھیں کی کوششیں اِس کی طبع و اشاعت میں اور انھیں کی کاوش و محنت اس کی علمی و ادبی مضامین میں نظر آئے گی۔''

نورالرحمٰن

رسالہ جامعہ میں تعلیمی دنیا کے عنوان سے خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔شذرات کے تحت دیگر مختلف خبریں دی جاتی تھیں۔مثلاً:

> شذرات: جامعہ کا یہ نمبر مئی کے نمبر کے بعد چند ہی روز کے وقفہ سے شائع ہورہا ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اگست کے مہینے میں بھی اسی طرح کے دو نمبر شائع ہوں گے اور رسالہ اپنے معمول وقت پر آجائے گا۔"(39)

رسالے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ رسالے میں پورے سال تک صفحات کا شمار ہوتا رہا ہے۔کوئی شمارہ جب نمبر کے صفحے پر ختم ہورہا ہے۔اس کے بعد کا شمارہ اُس نمبر کے بعد سے شروع ہورہا ہے۔بعد کے شماروں میں یہ روش نہیں نظر آتی ہے۔

رسالہ جامعہ ہندوستان کی ادبی صحافت میں ایک اہم رسالہ رہا ہے۔ اردو کے ادبی رسالوں کی بھیڑ میں کتنے جرائد و رسائل ایسے بھی شروع کیے گئے جن کے وجود کا علم بھی نہ ہوسکا اور کچھ صحافت کے مشکل دور میں حالات سے نبردآزما بھی ہوئے تو محض کچھ فاصلے طے کرکے دم توڑ گئے۔ رسالہ جامعہ نے خالص شعر و ادب و روایتی ادبی رسائل سے انفرادیت اختیار کرتے ہوئے خالص علمی موضوعات پر مضامین شائع کیے۔ اِس رسالے کے پرانے فائلوں اور ان میں شائع شدہ مضامین کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اِس رسالے میں ایسے نادر موضوعات اور اعلیٰ سطح کے مضامین شائع ہوئے ہیں جو دوسرے رسالوں میں نظر ہی نہیں آتے۔رسالہ جامعہ نے آغاز سے ہی اس بات پر توجہ دی کہ تعلیم وتدریس کی جانب قاری متوجہ ہو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معلم اور متعلم دونوں ہی رسالے میں طبع آزمائی کرتے رہیں تاکہ نئی نسل قلم اٹھائے اور آنے والا مستقبل عظیم قلمکاروں سے بھرا رہے۔ جامعہ کی اِس روش پر تنقید بھی کی گئی ہے جیسا کہ جون 1923 کے شذرات میں ہے۔

بعض بزرگوں کے نزدیک جامعہ کو عام رسائل کے خلاف کسی خاص بحث کو اپنا لینا چاہیے تاکہ وہ اُس کے لیے امتیازی شان ہوسکے۔(40)

رسالہ جامعہ کا بنیادی مقصد فروغ تعلیم اور قومی نصب العین تھا۔ جامعہ میں سیاست، تاریخ، قومی مسائل پر بھی مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ یورپ میں مقیم جامعہ کے طلبا میں

بھی یہ جریدہ کافی مقبول ومعروف رہا ہے۔

1947 کے بعد یہ رسالہ تقریباً 3 سال تک شائع نہیں ہو سکا۔ کیونکہ تقسیم ہند کی ہولناکیوں اور نامساعد حالات کا اثر اس رسالے پر بھی ہوا۔ بعد میں اسے 1960 میں دوبارہ شروع کیا گیا اور اس کے بعد سے یہ رسالہ لگاتار شائع ہورہا ہے۔ اس رسالے کے مدیروں میں ڈاکٹر عابد حسین، نورالحسن ہاشمی، اور اسلم جیراجپوری جیسے لوگ شامل رہے ہیں۔ یہ رسالہ بھلے ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ترجمان رہا ہو اور اس کے مدیروں میں وہی افراد ہیں جو جامعہ سے جڑے رہے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رسالے نے اردو ادب کی کافی خدمت کی ہے اور رسالہ جامعہ میں شروع سے ہی اردو تحقیق سے متعلق بیش بہا مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ رسالہ جامعہ اس معنی میں بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں پنڈت جواہرلعل نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیق الرحمٰن قدوائی، سید وقار عظیم، پروفیسر محمد عاقل، قاضی عبدالغفار، آل احمد سرور، اختر انصاری، امداد صابری، شوکت سبزواری، مرزا فرحت اللہ بیگ، نصیر الدین ہاشمی، عبدالماجد دریابادی جیسے ادبا اور مفکرین کی تحریریں شامل اشاعت ہوتی رہی ہیں۔ رسالہ جامعہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اردو ادب و زبان، تعلیم و ترقی، تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ عالمی ادب، ملکی اور غیر ملکی سیاست، معاشیات اور اہم شخصیات پر بھی کافی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر فرزانہ خلیل لکھتی ہیں:

> ''یہ ٹھیک ہے کہ اشتراکیت 1917 کے انقلاب روس کے بعد مختلف ملکوں میں مختلف شکلوں میں سامنے آئی۔ روس میں کمیونزم کی شکل میں، چین میں عوامی سوشلزم کی شکل میں اور دنیا کے دیگر ملکوں میں جمہوری سوشلزم کی شکل میں ابھری۔ اس دور کے رسالہ ''جامعہ'' کے مضامین ان تبدیلیوں کے پوری طرح گواہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ 1920 میں خلافت تحریک اپنے نقطہ عروج پر تھی اور مہاتما گاندھی سمیت تمام عظیم رہنما اس تحریک میں پیش پیش تھے جو تاسیس جامعہ سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے کہا

جاتا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اسی تحریک کی زائیدہ ہے۔ ان حالات میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ترجمان رسالہ ''جامعہ'' ان حالات و واقعات سے کسی طرح بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔''(41)

رسالہ جامعہ میں جہاں اعلیٰ درجے کے مضامین شائع ہوئے ہیں وہیں تخلیق نگارشات افسانوں، غزلوں اور نظموں وغیرہ کو بھی کافی جگہ دی گئی ہے۔ افسانوں میں سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، پریم چند، قرۃ العین حیدر جیسے افسانہ نگاروں کی تحریریں عموماً شائع ہوتی رہی ہیں۔ جامعہ میں ادب کے لیے ایک مخصوص کالم رکھا گیا تھا اس میں انشائیہ، طنز و مزاح، سفر نامے، شعر و ادب، اور دوسری ادبی نگارشات کو خصوصی طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ رسالہ جامعہ نے آغاز سے ہی اپنا ایک معیار برقرار رکھا ہے اور آج بھی یہ رسالہ اسی معیار کے ساتھ ادبی سفر پر رواں دواں ہے اور ادبی حلقے میں اسے نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

نیرنگ خیال: اس رسالے کی شروعات جولائی 1924 میں ہوئی تھی۔اس کی شروعات کے متعلق مولانا امداد صابری جولائی1924 لکھتے ہیں جبکہ محترمہ روشن آرا راؤ نے جون 1924 لکھا ہے جو کہ غلط ہے کیونکہ مولانا امداد صابری نے 1978 میں شائع کیے گئے گولڈن جوبلی نمبر کے مضمون کے اقتباس کو پیش کرتے ہوئے یہ تاریخ بتائی ہے جس میں لکھا ہے کہ پہلا شمارہ جولائی 1924 میں چھپا اور لاہور سے شروع کیا گیا تھا۔ یہ ایک علمی و ادبی رسالہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن تھے۔ اس رسالے کی خاص بات یہ تھی کہ اس مجلّے نے تصاویر شائع کرنی شروع کیں جس سے دوسرے مجلّے بھی اس طرف راغب ہوئے۔ جیسا کہ روشن آرا راؤ لکھتی ہیں:

''اردو رسالوں میں تصاویر کی پیش کش کے رجحان کو اس مجلّہ سے تقویت ملی جس سے مجلّاتی صحافت میں حسن اور نکھار پیدا ہوا۔ علمی، ادبی اور شعری ادب کے علاوہ سیاسی حالات پر تبصرہ بھی اس مجلّہ کا خصوصی موضوع رہا۔ اس مجلّہ میں امتیاز علی تاج، عبدالمجید مالک، سید احمد شاہ پطرس بخاری،

حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر اور تصدق حسین خالد کی تحریریں
شائع ہوئیں۔'' (42)

رسالہ نیرنگ خیال ایک اور اہم معاملے میں دوسرے ہم عصر رسالوں سے ممتاز تھا کہ یہ رسالہ ہمیشہ وقت کی پابندی کرتا تھا اور ہر ماہ مقررہ تاریخ پر شائع ہوتا تھا جس سے دوسرے رسالے بھی نیرنگ خیال کی طرح پابندی وقت کا خیال کرنے لگے۔ اس کے علاوہ اس رسالے میں ہندو مسلم یک جہتی کو فروغ دینے کی بابت کافی مضامین شائع ہوتے تھے۔ مسلمانوں کو ہندو مذہب کی جانکاری دینے کے لیے رامائن نمبر شائع کیا گیا۔ جس میں ہندو مذہب کے مختلف موضوعات۔ شیو جی پاربتی، برما میں دسہرا، رام چندر جی، سوئمبر جیسے مضامین شامل تھے۔ اگر اردو صحافت کی بات کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو صحافت کو نئی روشنی دینے میں نیرنگ خیال نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ صحافت کی باریکیوں کو جانتے اور سمجھتے ہوئے اس رسالے نے وقت و حالات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستانیوں کو اعلیٰ پائے کے مضامین اور شعری تخلیقات دیں جس سے سماج اور معاشرے کو کافی فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ رسالے نے قارئین کو راغب کرنے کے لیے نئے نئے تجربات کیے۔ کبھی رسالے کے صفحات زیادہ کر دیے تو کبھی رسالے کا سائز بڑھا دیا کبھی اس کا ٹائٹل پیج بالکل ہی منفرد کر دیا کبھی اس کی چھپائی میں جدت آئی۔ اس سے لوگوں میں اشتیاق پیدا ہوا اور لوگ اس رسالے کی طرف راغب ہوئے۔ غرض یہ کہ رسالہ نیرنگ خیال آزادی کے بعد بھی پاکستان کا ایک مقبول رسالہ رہا ہے اور ادب وصحافت کے فروغ میں اس کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بہارستان: اختر شیرانی نے لاہور سے مئی 1926 میں اس رسالے کی شروعات کی تھی۔ اردو ادب میں خوبصورت الفاظ کا اضافہ کرنے میں اس رسالے کی خدمات کو یاد کیا جاتا ہے۔ اس رسالے میں تصاویر بھی کافی شائع کی جاتی تھیں۔ اختر شیرانی نے کئی رسالے جاری کیے تھے۔ 1925 میں رسالہ انتخاب جاری کیا جو ادبی رسالہ تھا۔ 1930 میں خیالستان اور 1933 میں رومان شروع کیا۔ ان کے سبھی رسالے کافی مقبول ہوئے تھے۔

ساقی: ماہنامہ ساقی کی شروعات دہلی سے کی گئی تھی۔ اس کے مدیر شاہد احمد دہلوی تھے۔ یہ اس دور کا ایک بہت ہی اہم رسالہ تھا۔ اس کی شروعات کے تعلق سے کافی اختلاف ہے۔ ڈاکٹر شریف الدین نے اجرا کا سال 1903 لکھا ہے۔ (اردو صحافت اور حسرت موہانی، ص 89)۔ روشن آرا راؤ نے 1920 لکھا ہے۔(روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل،ص 31)۔ جبکہ مولانا امداد صابری نے جنوری 1930 لکھا ہے۔(تاریخ صحافت اردو جلد پنجم، ص 1165)۔ محمد نوشاد عالم نے اپنی کتاب ' ادبی شناخت' میں1928 لکھا ہے۔ ان سبھی تاریخوں میں مولانا امداد صابری کی دی گئی تاریخ صحیح ہے کیونکہ میں نے ساقی کے پرانے فائلوں کا مطالعہ کیا تو اس میں دیے گئے اقتباس سے بھی یہی تاریخ سامنے آتی ہے۔ ملاحظہ ہو ساقی کا جنوری 1937 کا اداریہ۔

نگاہ اولین

الحمداللہ ! ساقی اپنی زندگی کے سات سال پورے کر کے اب آٹھویں میں
قدم رکھ رہا ہے۔ سالگرہ کے موقع پر اب تک ہر سال ایک ضخیم خاص نمبر
سالنامہ کی صورت میں شائع ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی اس نئے
سال کی ابتدا سالنامہ سے ہو رہی ہے۔'' (43)

ماہنامہ ساقی سے رومان پسندی اور کلاسیکی ادب کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ یہ رسالہ تقسیم ہند کے بعد بھی کراچی سے شائع ہوتا رہا۔ شاہد احمد دہلوی کافی جدت پسند شخص تھے اور ترجمہ نگاری میں انھیں مہارت حاصل تھے۔ ترقی پسندی سے متاثرہ ادب بھی ساقی کی زینت بنتا رہا۔ سعادت حسن منٹو، بیدی، عصمت، میراجی، فیض، سردار جعفری کی تحریریں ہمیشہ ہی ساقی کی زینت بنتی رہیں۔ ساقی میں مغربی ادب کے شہ پارے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے تھے۔ فاؤسٹ، رومیو جولیٹ، ہیملٹ، راسیلاک جیسے انگریزی ادب کے مشہور ڈرامے اور نثری شہہ پارے ساقی میں شائع ہوئے تھے۔ ساقی کو اہم اور خاص نمبر شائع کرنے میں بھی امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس کے کچھ خاص نمبروں کی تفصیل۔

دلی نمبر۔اکتوبر1932، ناصر نمبر۔ ستمبر 1933۔سالنامہ۔ جنوری 1934،دلی نمبر۔

اکتوبر 1934، سالنامہ۔جنوری 1935، ظریف نمبر۔ اپریل 1935، افسانہ نمبر۔ جولائی 1935، چغتائی نمبر۔اکتوبر 1935، جاپان نمبر۔ جنوری 1936، ظریف نمبر۔ اپریل 1936۔ افسانہ نمبر۔ جولائی 1936، راشد الخیری نمبر۔ستمبر 1936۔

ماہنامہ ساقی کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امداد صابری لکھتے ہیں :

> ''ساقی کا شمار ان رسالوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد میں ادیبوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری، اور بہت سے ادیب اس افق سے طلوع ہوئے۔ جن ادیبوں کی شخصیت اور تحریروں سے عصمت چغتائی متاثر ہیں ان میں شاہد احمد بھی ہیں۔ ساقی بک ڈپو نے بھی اردو ادب کی بڑی خدمت کی اور ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں شائع کیں۔'' (44)

ساقی کا ہر شمارہ ضخیم ہوتا تھا اور اس میں تقریباً تمام حلقۂ ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہوتا تھا۔ ساقی ہر طرح سے اس وقت کے دور کا ایک موزوں اور بہترین مجلّہ تھا۔ اردو ادب کے بہترین رسالوں کی اگر ایک فہرست مرتب کی جائے تو ساقی کا نام ان میں ضرور شامل کیا جائے گا۔ اس وقت رسائل نکالنا آسان تھا لیکن انھیں قائم رکھنا، جاری رکھنا ایک مشکل کام تھا اور شاہد احمد دہلوی نے ایک لمبے عرصے تک ساقی کو قائم رکھا۔ بعد میں شاہد احمد کی 28 مئی 1966 کو موت کے بعد شمس زبیری نے کچھ شمارے شائع کیے لیکن ساقی پھر زیادہ دن ادب کے متوالوں کو اردو میں بہترین مے سے سیراب نہ کر سکا اور ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

ماہنامہ شاعر: رسالہ شاعر کی شروعات 15 فروری 1930 کو بطور پندرہ روزہ اخبار ہوئی تھی۔ یہ رسالہ علامہ سیماب اکبرآبادی نے شروع کیا تھا جو آگرہ اسکول کے اہم استاد شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کی پیدائش 5 جون 1882 کو آگرہ میں ہوئی تھی۔ وہ بچپن سے ہی شعر و ادب کا علمی ذوق رکھتے تھے۔ ان کے والدین نے ان کا نام شیخ عاشق حسین صدیقی رکھا تھا لیکن وہ سیماب اکبرآبادی کے نام سے ہی مشہور

ہوئے۔ اس زمانے میں آگرہ کو اکبرآباد کہا جاتا تھا۔ انھوں نے کچھ دنوں تک کانپور میں ملازمت کی اس کے بعد اجمیر چلے گئے۔ ان کی شاعری کی شروعات تو بچپن میں ہی ہو چکی تھی اور انھوں نے نوجوانی سے ہی بڑے بڑے مشاعروں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان کی صحافت کی شروعات اجمیر سے ہوتی ہے جہاں سے انھوں نے رسالہ' فانوس خیال' جاری کیا تھا۔ اجمیر سے واپس آگرہ آنے کے بعد انھوں نے رسالہ مرصع کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ آگرہ میں ہی انھوں نے 1923 میں ایک علمی اور ادبی ادارہ قصرالادب قائم کیا۔ 1923 میں ہی اس ادارے سے ایک ادبی ماہنامہ پیمانہ کا آغاز ہوا۔ مولانا روم کی مثنوی کا منظوم ترجمہ کرنے کے لیے سیماب اکبرآبادی 1925 میں لاہور منتقل ہو گئے۔ ان کے لاہور چلے جانے سے ماہنامہ پیمانہ بھی جاری نہیں رہ سکا۔ تقریباً کچھ ہی مہینوں بعد وہ لاہور سے آگرہ لوٹ آئے۔ آگرہ واپس آنے کے کچھ دنوں بعد انھیں دلی کے ایک اخبار ریاست میں ملازمت مل گئی اور وہ دہلی چلے گئے۔ دہلی میں ان کی زندگی کافی مصروف گزری، ایک طرف وہ اخبار کے لیے کام کرتے تھے تو دوسری طرف شاگردوں کی شاعری کی اصلاح اور اپنے رسالہ 'پیمانہ' کی اشاعت میں بھی لگے رہتے تھے۔ ادارہ قصرالادب سے ہی 1929 میں انھوں نے اخبار' تاج' شروع کیا۔ کچھ برسوں کے بعد پیمانہ اور تاج دونوں بند ہو گئے۔ رسالہ شاعر کو پہلے ہفتہ وار شائع کرنے کی بات تھی لیکن غالب کے یوم وفات 15فروری 1930 کو اسے پندرہ روزہ اخبار کے طور پر شائع کیا گیا۔ اس بارے میں سیماب اکبرآبادی کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے حامد اقبال صدیقی لکھتے ہیں:

اولاً اُسے ہفت روزہ اخبار کے طور پر شائع کرنے کا منصوبہ تھا لیکن غالب کے یوم وفات 15 فروری 1930 کو پندرہ روزہ اخبار شاعر کا اولین شمارہ منظر عام پر آیا۔ اس کے نگراں خود حضرت سیماب اور مدیر ان کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی مرحوم تھے۔ سرورق پر ایک جانب غالب کی تصویر تھی اور دوسری جانب جمعیۃ الشعرائے ہند کا واحد اخبار تحریر تھا اور ساتھ ہی حضرت سیماب کی نظم کا یہ شعر تھا:

پیدا ہوا ہے فکر کی مشکل کشائی کے لیے
شاعر ہے آواز خدا ساری خدائی کے لیے

مذکورہ شمارے کے ادارتی نوٹ کا ایک اقتباس دیکھیں:

''میں عرصہ دراز سے ایک ایسے خالص ادبی اخبار کے اجرا کا خواب دیکھ رہا تھا جو صرف جماعت شعرا کا متفقہ آرگن ہو اور جس کے ذریعے مشرقی فن شاعری کو موجودہ انحطاط کی پستیوں سے نکال کر معراج ترقی پر پہنچایا جا سکے۔ الحمداللہ کہ آج اس خواب کی تعبیر شاعر کی صورت میں پیش نظر ہے۔ ہندوستان میں اردو کے تحفظ وتہذیب کے لیے بے شمار انجمنیں قائم ہو چکی ہیں لیکن شاعری کی تہذیب اور شعرا کی تنظیم کے لیے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا گیا ہے اور وہ شاعری جو کبھی مایہ صدنازش تھی آج صرف سرمایۂ تفریح وتضحیک بن کر رہ گئی ہے۔ یوں تو کوئی اخبار اور کوئی رسالہ نہیں جو ہماری جماعت کا مرہون قلم نہ ہو بلکہ مجھے یوں کہنے دیجیے کہ آج ہندوستان کی صحافت ہماری جماعت کی توجہ سے دلچسپ اور قابل بنی ہوتی ہے۔ پھر بھی شعرا کسی اخبار اور کسی رسالہ کو اپنی جماعت کا نمائندہ اور ترجمان نہیں کہہ سکتے۔ اسی ضرورت کے احساس نے اجرا 'شاعر' پر مجھے آمادہ کیا اور میری آمادگی کا یہ پہلا نقش قدم ہے۔ حضرت سیماب کے اختراعی ذہن اور شاعر کے جدید مزاج نے جلد ہی عاشقانِ شعر و ادب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ادھر خود ان کی اپنی مصروفیات میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شاعر کو پندرہ روزہ نکالنا کسی حد تک دشوار بھی ہو چلا تھا اس لیے اسے ماہنامہ کر دیا گیا اور جون 1932 سے یہ اخبار سے رسالہ ہو گیا۔'' (45)

رسالہ شاعر آج نکلنے والے اردو کے تمام رسالوں میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ جدید ٹکنالوجی اور اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے شاعر میں کافی کچھ شائع ہوتا رہا ہے۔ اس

رسالے نے غیر مما لک میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے تعلق سے بہت سارے مضامین شائع کیے اور غیر مما لک میں بسنے والے اردو ادبا وشعرا کو ہندوستان کے اردو حلقے سے روشناس کرایا۔ میں نے شاعر کے موجود ہ مدیر جناب افتخار امام صدیقی کو اپنے محبّ اور بڑے بھائی ڈاکٹر غضنفر اقبال کے ذریعے ایک سوالنامہ ارسال کروایا تھا جس کا جواب مدیر شاعر افتخار امام صدیقی نے مجھے بھیجا اور ساتھ میں شاعر کا ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر بھی ارسال کیا۔ وہ سوالنامہ اور جناب افتخار امام صدیقی کے جوابات یہاں پیش خدمت ہیں جن سے شاعر کی ادبی قدر و قیمت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے ان کا خط ملاحظہ ہو:

3 جون 2009 بروز بدھ

برادرم عبدالحی ! السلام علیکم

برادرم غضنفر اقبال نے آپ کا سوالنامہ ارسال کیا تھا۔ صاف گوئی کے ساتھ جواب تحریر کیے ہیں کسی طرح کی لن ترانی کے بغیر۔ آپ نے اپنے موضوع میں جہاں شاعر کو شامل کیا وہیں معارف، انشاء، انتساب، اسباق کو بھی شامل کرتے تو اچھا تھا۔ سرکاری رسائل ہوں یا تجارتی اداروں کے رسائل کی پالیسی سرکار بناتی ہے۔ تجارتی اداروں کے رسائل بھی تجارتی سطح کے رہتے ہیں لیکن نجی رسائل کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر معاشی مسائل۔ میری فہرست میں دو نام اور رہ گئے ہیں۔ نئی کتاب، نئی صدی، اور بھی نوازئید ہ رسالے ہوں گے۔ شاعر کا ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبرارسال کیا جا رہا ہے۔ اس میں ماہنامہ شاعر کے بارے میں تحقیقی لوازمہ مل جائے گا۔

زیادہ خیریت۔ اپنا خیال رکھیے گا

مخلص

افتخار امام صدیقی

میرے سوالات اور ان کے جوابات اس طرح ہیں۔

بشرف ملاحظہ محترم افتخار امام صدیقی صاحب
مصاحبہ نگار عبدالحی

1. سوال : رسالہ 'شاعر' کی اب تک کتنے حضرات نے ادارت سنبھالی ان کے بارے میں بتائیے۔ شاعر کی ابتدا اور اس کے اغراض و مقاصد پر بھی روشنی ڈالیے؟

جواب : شاعر کا اجرا فروری 1930 کو آگرہ میں ہوا۔ غالب کی برسی کے موقع پر یہ ادبی رسالہ اپنے بانی مدیر علامہ سیماب اکبر آبادی کی سوچ کا مظہر تھا۔ ان کا مقصد اردو شعرا کی کل ہند جمعیت قائم کرنا تھا۔ علامہ کے بڑے صاحبزادے شمشاد حسین منظر صدیقی معاون ہوئے۔ لیکن 1934 میں انھوں نے اپنا رسالہ جاری کیا اور علامہ کے منجھلے صاحبزادے اعجاز صدیقی علامہ کے معاون ہوئے۔ اعجاز صاحب 9 فروری 1978 میں بمبئی میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے تاجدار احتشام صدیقی رسالے کے مدیر ہوئے۔ ناظر نعمان صدیقی جو کہ اعجاز صاحب کے چھوٹے صاحبزادے ہیں ان کے معاون ہوئے۔ تاجدار احتشام 'شاعر' کے بہتر مستقبل کی خاطر سعودی عربیہ چلے گئے۔ جہاں ان کا انتقال 5 فروری 1981 کو ہوا۔ اس کے بعد اعجاز صاحب کے دوسرے صاحبزادے افتخار امام صدیقی مدیر ہوئے اور ان کے معاون چھوٹے بھائی حامد اقبال صدیقی ہوئے۔

80 سالہ یہ قدیم جریدہ فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ کسی بھی رسالے کے مدیران ایک ہی خاندان کی تیسری نسل پر مشتمل نہیں شائع ہوا۔ البتہ رسالے کے معاونین میں جمیل مہدی (مرحوم)، شکیل الرحمٰن، آغا رشید مرزا (مرحوم)، ظ انصاری (مرحوم)، محمد حسن اور یونس اگاسکر کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ بھائی جان کے انتقال کے بعد سے آج تک تین بھائی شاعر کو مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔

2. سوال : شاعر نے کن شخصیات اور کن موضوعات پر خصوصی شمارے شائع کیے۔

جواب : شاعر کے ضخیم نمبروں میں کرشن چندر نمبر، غالب نمبر، گاندھی نمبر، اہم ہیں (قبلہ اعجاز صدیقی نے انھیں مرتب کیا تھا)۔ شاعر نے 1971 میں اعزازی گوشوں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، جوگندر پال، جیلانی بانو، رام لعل، وغیرہم پر

خصوصی گوشے، قومی یکجہتی نمبر، منٹونمبر، ڈراما نمبر، ضخیم ناولٹ نمبر، جمہوریت نمبر، ہم عصر اردو ادب نمبر، بھی مرحوم نے شائع کیے تھے۔

3. سوال : شاعر کیا کسی تحریک یا رجحان کا ترجمان تھا۔ ابتدائی دور کے حوالے سے جواب دیں؟

جواب : رسالہ شاعر کبھی بھی کسی تحریک یا مستعار ادبی تھیوری کا بھونپو نہیں بنا۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، سبھی معاصر ادبی نظریوں کی باہر سے مثبت حمایت کی۔ کسی سیاسی نظریے کا بھی مبلغ نہیں رہا۔ کسی ادبی شخصیت کا پرچارک بھی نہیں رہا۔

4. سوال : شاعر آگرہ سے شروع ہوا تھا ممبئی کب منتقل ہوا؟

جواب: 31 جنوری 1951 کو سیماب صاحب کا کراچی میں انتقال ہوا تو اعجاز صاحب پاکستان جانے کی بجائے آگرہ سے ممبئی ہجرت کر گئے اور مذکورہ سال سے تاحال شاعر ممبئی سے شائع ہو رہا ہے۔

5. سوال : شاعر کی اشاعت کبھی مسدود رہی ہے کیا؟

جواب: شاعر کی اشاعت کبھی بھی منقطع نہیں رہی البتہ مشترکہ شمارے ضرور شائع ہوئے ہیں اور وہ بھی اعجاز صدیقی کے انتقال کے بعد۔

6. سوال : موجودہ دور میں شاعر کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

جواب : موجودہ دور میں شاعر کی ادبی حیثیت کا تعین ہم نہیں کر سکتے۔ یہ تو عالمی اردو قارئین اور نقاد و محققین کا کام ہے۔

7. سوال : کیا شاعر سے اردو کی ادبی صحافت مستحکم ہوئی ہے؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب : اردو کی ادبی صحافت شاعر سے مستحکم ہوئی ہے کیونکہ رسالے نے جتنے تجربے کیے ہیں۔ وہ کسی بھی اردو جریدے کو میسر نہیں۔ رسالے کے مدیران اردو کے عاشق، شاعر حضرات اس کے امین ہیں لہٰذا اس کے عشق جنوں میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتیں جھونک دینے میں مصروف ہیں۔

8. سوال : شاعر کو مزید بہتر بنانے کے آپ کے پاس کیا لائحہ عمل ہے؟

جواب : مستقبل کا شاعر کیا ہوگا۔ یہ تو اللہ جانتا ہے۔ پھر بھی بہت سارے خواب پلکوں پر سجا رکھے ہیں۔

مدیر شاعر جناب افتخار امام صدیقی کے مندرجہ بالا جوابات سے شاعر کی تاریخ اور اس کی ادبی قدر و قیمت کا کسی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ شاعر اردو کا واحد ایسا رسالہ ہے جس کا معیار اپنے آغاز سے ہی خالص ادبی رہا ہے۔ کبھی کسی تحریک سے متاثر ہوئے بنا اس رسالے نے جہاں اردو کے نامور قلم کاروں کو اپنے صفحات پر جگہ دی وہیں اردو کے نئے شعرا اور ادیبوں نے بھی شاعر کے اوراق پر یکساں جگہ پائی ہے۔ شاعر کی ایک نمایاں اور ممتاز خوبی یہ ہے کہ اس مجلّے نے وقت اور حالات کے ساتھ ادب اور صحافت کے تقاضوں کو سمجھا ہے اور زمانے کے رخ کو دیکھتے ہوئے نئے تجربے کیے ہیں اور ان تجربوں میں کامیاب بھی ہوا ہے۔ شاعر کی کامیابی شاید اسی میں پنہاں ہے کہ اس رسالے نے اپنا دامن ہمیشہ وسیع رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو کے شائع ہونے والے تمام رسالوں میں سب سے قدیم رسالہ ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ 80 برسوں کا سفر آسان اور کم نہیں ہوتا۔ ماہنامہ شاعر نے اسے جس کامیابی سے پورا کیا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ نجی پرچہ ہوتے ہوئے بھی اس کی اشاعت کبھی موقوف نہیں ہوئی۔ جہاں سرکاری پرچے و رسائل ہونے کے باوجود کبھی بھی نہیں شائع ہوئے ہیں وہیں شاعر نے 80 برسوں تک لگاتار شائع ہو کر ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ یہ واحد رسالہ ہے جس میں غیر ممالک کے ادیب اور شاعر حضرات کی نگارشات دلکش اور منفرد انداز میں شائع ہوتی ہیں اور ان شعرا و ادبا کے حوالے سے مکمل معلومات بھی شائع کی جاتی ہے جس سے اردو حلقے میں غیر ممالک اور بین الاقوامی ادبی صورتحال کا واضح منظرنامہ سامنے آجاتا ہے۔ شاعر کے خصوصی نمبروں کی اگر بات کریں تو یہ صاف لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کے خصوصی نمبر اپنے آپ میں بے مثال ہیں۔ شاعر کے ناولٹ نمبر میں 16 ناولٹ شائع ہوئے ہیں۔ کرشن چندر نمبر میں ان کی افسانہ نگاری، شخصیت اور خدمات پر تقریباً 58 تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ غالب نمبر میں غالب کی نثر اور ان کی شاعری پر بہت سارے مضامین

شامل کیے گئے ہیں۔ 1980 میں شاعر کا ایک شمارہ 1980 کے نام سے شائع ہوا تھا۔ شاعر کے خصوصی نمبروں میں یہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں۔

''ایک شمارہ 1980 کے نام شاعر کے خاص نمبروں میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو میں اس طرح کا نمبر پہلی بار شائع ہوا ہے جس میں 1980 میں انتقال کرنے والے ادیبوں اور شاعروں پر تنقیدی مضامین۔ خاکے، منتخب تخلیقات۔ 1980 میں منعقد ہونے والے سیمینار، کانفرنس اور دوسرے علمی و ادبی پروگرام، انعامات و ایوارڈ وغیرہ کی تفصیلات، 1980 کی اہم مطبوعات اور غالب، اقبال، پریم چند، حسرت، فانی اور آغا حشر صدی کے سلسلے میں نذرانۂ عقیدت شامل ہے۔'' (46)

شاعر نے ہم عصر اردو ادب نمبر کے نام سے خصوصی نمبر شائع کیے ہیں۔ 1977 میں بھی ایک نمبر ہم عصر اردو ادب نمبر کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مئی تا دسمبر 1997 میں شاعر کے ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔ یہ شمارہ اپنے آپ میں بے مثال ہے اس ایک شمارے میں جیسے پورے اردو ادب کو شامل کر دیا گیا ہو۔ اس خصوصی نمبر کے اداریے میں جناب افتخار امام صدیقی لکھتے ہیں:

''ہم نے رسالہ شاعر کو کبھی بھی صرف اور صرف مدیر کے رحم و کرم پر نہیں رکھا۔ ہم تو اول و آخر طالب علم ہیں اور شاعر کو ادب کے ایک باذوق قاری کی حیثیت سے ترتیب دیتے ہیں۔ مدیر پر تو ہم نے بہت زیادہ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور ضرورت بھر ہی اس کو آزادی دی جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ادبی رسالے کے مدیر کو رسالے کے سرورق سے متن اور آخری صفحے کے آخری لفظ و حرف تک پس منظر اور مواد کے بین السطور میں ہونا چاہیے۔ ہم تو قاری ہیں۔ معیاری، اچھے اور سچے شعر و ادب کی تلاش میں رہتے ہیں۔ نئے قلمکاروں کی جستجو کرتے ہیں۔ یہ شاعر کی روایت کہنہ ہے۔ یہی شاعر کا مزاج بھی ہے۔ .... اردو شعر و ادب کا

یہ کوئی انتخاب نہیں ہے۔ یہ کسی طرح کی کوئی انتھولوجی بھی نہیں ہے۔ شہروں، صوبوں، ملکوں کا منتخب ادب بھی نہیں ہے۔ یہ سالانہ جائزہ یا کوئی دس سالہ جائزہ یا پھر پچاس سالہ ادب کا محاکمہ بھی نہیں ہے۔ بظاہر اس کا عنوان ('ہم عصر اردو ادب نمبر' اردو شعر و ادب کا عالمی گاؤں) ہے اور 1990 کے مابعد شعر و ادب کو عمل میں رکھا گیا ہے لیکن ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے ادبی کارناموں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے آزادیِ ہند اور ہندوستان کی تقسیم کے آس پاس کے شعر و ادب کی بات بھی ہوئی ہے لیکن کسی طے شدہ موضوع کو اس کے میکانکی مضمرات کے ساتھ یا خاص نمبر کے کسی بھی تصور سے الگ ہو کر ہم عصر اردو ادب نمبر کی تینوں جلدوں کو دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔ یہ ایک بے حد گتھا ہوا تخلیقی تجربہ ہے جو نثر و نظم کی معلوم و معروف ہیئتی تراکیب کے لحاظ سے مختلف ہے لیکن دونوں کی خوبیاں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ہم نے اپنے نہایت ہی گھنے خوابوں کے اندرون میں ممکنہ حد تک سیاحی کی ہے۔ اپنی روح کی ساری حرارتیں خاص نمبر میں انڈیل دی ہیں۔ ہم نے طرح طرح سے اردو ادب کو موضوع بحث بنانے کی سعی کی ہے تاکہ قاری تازہ بہ تازہ کے ساتھ بہت ساری بھولی بسری، فراموش کردہ یا پھر نظر انداز کی جانے والی باتوں کی یاد دہانی کر سکے۔ کلاسیکی ادب، ترقی پسند ادب، جدید ادب، مابعد جدید ادب یا رواں ادبی نظریے اور رجحانات (الیکٹرانک میڈیا، نیوکلیئر جنگ کے خطرات، کلوننگ، کائنات کے اسراروں کی جستجو، سی ٹی بی ٹی کا خوف، آدمی سے آدمی کی جنگ، اعلیٰ دماغوں کے جاری سائنسی تجربے وغیرہ یا کسی ایک طرف شدید جھکاؤ کے بغیر ہم نے اپنے طور پر منظر نامے بنانے کی مقدور بھر کاوش کی ہے۔'' (47)

شاعر کا یہ ہم عصر اردو ادب نمبر اول 1240 صفحات پر مشتمل ہے جو شاید اردو رسالوں

کے خاص نمبروں کی تاریخ کا سب سے زیادہ ضخیم نمبر ہے۔ اس خصوصی نمبر میں آگرہ اسکول، علامہ سیماب اکبر آبادی، معاصر تنقید، مکاتیب مشاہیر، ہم عصر افسانہ،معاصر اردو شاعری پر پرمغز مقالات اور بہترین شعرا اور نثر نگاروں کی اعلیٰ ترین تخلیقات و نگارشات شائع کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ''شاعری سے نثر کی طرف،نثر سے شاعری کی طرف'' کے عنوان سے مختلف قلم کاروں کی آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ افتخارامام صدیقی نے ملک کے مختلف ادبا وشعرا کو ایک سوالنامہ بھیجا تھا کہ وہ شاعری کے بعد نثر کی طرف متوجہ ہوئے یا پہلے نثر میں طبع آزمائی کی پھر شاعری کی طرف توجہ دی۔ ان کے جوابات شمس الرحمٰن فاروقی، آل احمد سرور، احمد سہیل، اظہار اثر، اکبر حمیدی، تنویر احمد علوی، ساجدہ زیدی، حنیف نقوی، جیسے مشہور اور قابل قدر شعرا و ادبا نے دیے۔ ان کے خیالات نے ایک تاریخی اور ادبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ شاعر کے اس ضخیم نمبر میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ڈائرکٹری بھی دی گئی ہے جس میں غیر ممالک کے اردو ادیبوں اور شاعروں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جس سے شاعر کے اس عظیم نمبر کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ شاعر کے اس ہم عصر اردو ادب نمبر کو لندن میں 15 مئی 1999 کو ایک خصوصی ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ یہ خصوصی نمبر سات سال کے طویل عرصے میں تیار کیا گیا تھا۔

ماہنامہ شاعر کے موجودہ مدیر جناب افتخار امام صدیقی کی پیدائش 13 مئی 1947 کو آگرہ میں ہوئی تھی۔ افتخار امام صدیقی نے 1978 میں شاعر کی ادارت سنبھالی تھی۔ انھوں نے شاعر کو کامیابی کی اس منزل تک پہنچانے میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر غضنفر اقبال کو گلبرگہ، کرناٹک کے ایک روزنامہ اخبارُ کے بی این ٹائمزُ کو دیے گئے ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا:

> ''اردو دنیا شاعر کے ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر کو بھلا نہیں سکتی کہ یہ بھی اپنی نوعیت کا اولین تجربہ تھا۔00 13 صفحات میں الف سے س تک فکشن کو اہمیت دی گئی تھی اور مختصر مختصر گوشے شائع کیے گئے تھے بے طرح مالی نقصان نے ش تا ی تک دوسری جلد شائع نہیں ہونے دی... کیا اردو دنیا ضخیم

اور بحث نمبر، اقبال نمبر، کو بھول سکتی ہے...... اس میں سوائے اشتہارات کے کسی سے بھی مالی تعاون نہیں لیا گیا تھا... تیسری نسل کی ادارت میں شاعر نے اردو کی نئی بستیاں، کولمبس کی، اس کے علاوہ چہرہ چہرہ یادیاں، آچار لفظ لفظ، مختصر گوشہ کل آج اور کل بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ شاعر کے البم سے رو میں ہے رخش عمر۔ یہ تمام تنوع تجربے کسی اور ادبی رسائل میں نظر نہیں آئے۔

اب شاعر جنوری 2009 میں 80ویں سال میں داخل ہو رہا ہے۔ فانصیب یہ دنیا قریب الختم ہے۔ پھر شاعر کون کہاں ہے۔ پھر بھی ایک صدی تو ضرور پوری ہوگی۔ ہم اپنے خوب سیرت خواب، ہر شمارے کو دے رہے ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر 2۔ اقبال نمبر 2 اور بچوں کا ادب، اردو مشاعرہ نمبر، عالمی اردو قلمکاروں کا سوانحی لغت، عالمی اردو خواتین قلمکار نمبر، سیماب نمبر، اعجاز صدیقی نمبر، تاجدار احتشام حسین نمبر، ڈرامہ نمبر، عالمی اردو فکشن نمبر۔ ایک نیا سلسلہ گوشہ اعترافیہ بھی ہے۔ تو کیا اردو کے منجمد اور اسٹیریوٹائپ ادبی رسائل کے پاس شاعر ایسے تجربے ہیں؟'' (48)

اردو صحافت نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں ہر لمحہ ساتھ دیا ہے۔ اردو صحافت پر بھلے ہی زوال کا الزام لگتا رہا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ حالات اب بھی اتنے بُرے نہیں ہیں جتنے بتائے جاتے ہیں۔ اردو صحافت میں ترقی کا عمل ہمیشہ جاری رہا ہے۔ اردو صحافت کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اسے قابل قدر، با کمال اور بے مثال شخصیات کا دست شفقت ملتا رہا ہے۔ ان ذہین اور لائق فائق حضرات نے اپنی بصیرت اور اپنی جدت طرازی سے صحافت کو ایک نئی طرز فکر دی، ایک نیا لہجہ، نئی اونچائی، اور نئی منزلوں تک پہنچایا۔ ماہنامہ کتاب نما اپنے مئی 1978 کے شمارے میں ماہنامہ شاعر اور اس کے مدیر اعجاز صدیقی صاحب کو کچھ یوں خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

''ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور روشن پہلو یہی تھا کہ اردو ان کی

سب کچھ تھی۔ کامل 47 سال تک نامساعد، ناسازگار اور ناموافق حالات میں اردو کے ایک پرچے کو پابندی کے ساتھ اور وہ بھی اس طرح شائع کرتے رہنا کہ وہ ادب اور صحافت کا ایک لازمی جز بن جائے بجائے خود ایک اعجاز ہے۔ شاعر کی صرف ادبی صحافتی نہیں، دستاویزی حیثیت بھی ہے۔ اس کے جو بھی سالنامے اور خاص نمبر شائع ہوئے ہیں، اردو ادب اور اردو زبان کے مسائل سے متعلق اہم معلومات کا مخزن ہیں۔ مرحوم اعجاز صدیقی صاحب نے اپنے بچوں کو تو ظاہر ہے چاہا ہی ہوگا، لیکن شاعر ان کی اس محبت میں برابر کا شریک تھا۔ شاعر کا ہر شمارہ خواہ وہ عام شمارہ ہو یا خاص نمبر، مدیر شاعر کی انتھک محنت اور پرچے سے ان کی بے پناہ شفقت اور محبت کی گواہی دیتا ہے۔ مرحوم اعجاز صدیقی 'شاعر' کے پہلے صفحے سے آخری صفحے کی آخری سطر تک کا ایک ایک لفظ توجہ سے دیکھتے تھے۔ یہ الفاظ کہ پرنٹر، پبلشر اور مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل لیتھو فائن پریس22 نوروجی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی 2 سے چھپوا کر وہیں سے شائع کیا، رسمی اور مقررہ الفاظ تھے لیکن یہ جملہ بھی ان کی جانچ اور تنقیح کے بغیر نہیں چھپ سکتا تھا۔ وہ ان مدیرانِ جرائد میں سے نہیں تھے جن کا نام مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے چھپ تو جاتا ہے لیکن انھیں یہ علم نہیں ہوتا کہ پرچے میں چھپا کیا ہے۔ 47 سال تک مدیر شاعر نے اپنی یہی روش برقرار رکھی۔''(49)

اردو رسائل میں شاعر ایسا رسالہ ہے جسے آغاز سے ہی باکمال اور علم و ادب کی بے مثال شخصیات کا ساتھ رہا ہے اور رسالہ شاعر بھی زمانے کے انداز و اطوار کے ساتھ مختلف تبدیلیوں کے ساتھ کامیابی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہاں علامہ اقبال کی بات لکھنا بے محل نہ ہوگا جو انھوں نے شاعر کے لیے کہی تھیں۔ شاعر کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے ایک بار کہا تھا:

''رسالہ شاعر اب مبتدیوں کے مذاق سے گزر کر منتہیوں کے مفاد کا

باعث ہوتا جاتا ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر
صوبہ کے سر رشتۂ تعلیم میں شاعر کو منظور کر لیا جائے۔ خود بھی کوشش کر رہا
ہوں۔ آپ بھی توجہ فرمائیں۔'' (50)

آج کا شاعر دیکھنے کے بعد یہی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی اس کے لیے عمردرازی کی دعا واقعی قبول ہوئی اور یہ رسالہ اپنی ریکارڈ کامیابی کے ساتھ آج بھی اردوداں حلقے میں اپنی تحریروں اورمنفرد لب و لہجے سے منفرد شناخت بنانے میں کامیاب ہے۔ شاعر نے آغاز سے ہی ادب برائے ادب، قدیم ادبی اقدار اور ادب برائے زندگی کے نظریے کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ جدت پسندی اور زمانے کے مطالبے کو بھی تسلیم کیا ہے اور شاعر کی کامیابی کا راز اسی میں پنہاں ہے۔ شاعر نے نہ صرف ہندوستان بلکہ غیرممالک کے اردو داں حلقے میں بھی وہ پذیرائی حاصل کی ہے جو ہندوستان کا کوئی دوسرا رسالہ آج تک نہیں حاصل کر سکا۔ شاعر کی مقبولیت ملکی نہیں عالمی سطح تک ہے اور آج بھی یہ رسالہ پوری آب وتاب کے ساتھ 81ویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔

رسالہ ندیم: یہ ماہانہ رسالہ تھا اور اس کی شروعات بہار کے مشہور ومعروف شہر اور ہندوؤں کی مقدس سرزمین گیا میں ہوئی تھی۔ اس رسالے کا پہلا شمارہ 1931 میں منظر عام پر آیا تھا۔ یوں تو رسالے پر گیا کا نام شائع ہوتا تھا لیکن یہ رسالہ سید منظرعلی ندوی کے ذریعے برقی پریس سبزی باغ پٹنہ سے شائع کیا جاتا تھا۔رسالے کے مدیرا نجم مانپوری تھے اور معاون مدیر عبد القدوس ہاشمی تھے۔ رسالے میں نظمیں، غزلیں،اور چھوٹے افسانے بڑی تعداد میں شائع کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ضروریات زندگی سے متعلق دوسری کارآمد باتیں بھی شامل اشاعت ہوتی تھیں۔

ادب لطیف: 1935 میں لاہور سے اس ماہانہ رسالے کی شروعات ہوئی تھی۔ چودھری برکت علی اس کے مدیر تھے۔ یہ ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا۔ ترقی پسند تحریک کو جلا بخشنے میں اس مجلّے کا بہت بڑا کردار ہے اردو کے تقریباً سبھی بڑے ترقی پسند ادیب و شاعر حضرات کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی تھیں۔ اس رسالے میں افسانوں، غزلوں اور نظموں کے ساتھ

ساتھ اعلیٰ پائے کے تنقیدی مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔ اردو زبان کی طرف لوگوں کو راغب کرنے میں بھی اس رسالے نے کافی کوششیں کی ہیں جنھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس مجلّے کے مستقل لکھنے والوں میں فیض، بیدی، ممتاز مفتی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

سب رس : ادبی صحافت کی تاریخ پر یوں تو کافی مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن مکمل کتاب ایک بھی نہیں ہے۔ محترمہ روشن آرا راؤ اور ڈاکٹر شریف الدین نے مختصراً اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ گنے چنے کچھ مضامین ہیں جن میں اہم رسائل کا ذکر مل جاتا ہے۔ لیکن ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ سب رس جیسے اردو کے ایک مشہور اور اہم رسالے کا ذکر کسی بھی کتاب یا مضمون میں نہیں ملتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے ذریعے شروع کیا گیا یہ رسالہ اپنے وقت کا ایک بے حد اہم رسالہ تھا۔ دکنی ادب کے فروغ اور خالصتاً ادب کی خدمت کرنے کے مقصد سے شروع کیا گیا یہ رسالہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ رسالہ میری تحقیق کے اہم مجلوں کی فہرست میں شامل ہے۔ جنوبی ہند سے شائع ہونے والے رسالوں میں سب رس سب سے ممتاز رسالہ ہے۔

سب رس کی شروعات جنوری 1938 میں حیدرآباد، دکن میں ہوئی تھی۔ یہ رسالہ ادبیات اردو کا ترجمان تھا۔ اس رسالے کا مقصد اردو زبان و ادب کی ترقی، غیر ملکی زبانوں کے شاہکار کو اردو میں شائع کرنا، اور اردو میں تنقید و تحقیق کو فروغ دینا تھا۔ یہ رسالہ جنوری 1938 سے لگاتار شائع ہوتا رہا ہے اور اس رسالے نے دکنی ادب کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اردو نثر و نظم، کلاسیکی ادب اور تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس رسالے نے مختلف اوقات میں کئی ضخیم اور بہترین نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ جو آج بھی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں سب رس میں شروع سے ہی نامور ادیبوں کی تخلیقات شامل اشاعت ہوتی رہی ہیں۔ پہلے شمارے سے ہی رسالے کو تصاویر سے مزین کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ اردو صحافت کے فروغ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے شمارے کے پیش لفظ میں سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں :

”سب رس ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان ہے جو ہر مہینے اردو زبان اور

ادب کی خدمت کے لیے شائع ہوا کرے گا۔ اس ادارے نے اب تک سنجیدہ علمی و ادبی کتابیں شائع کر کے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست احباب سے مخفی نہیں ہے۔ لیکن اس خدمت سے خاص خاص اہل ذوق ہی مستفید ہو سکتے تھے اس لیے ادارہ ابتدا ہی سے دھیان لگائے ہوئے تھا کہ ایک ایسا رسالہ بھی نکالا جائے جس کی رسائی سب تک ہو اور جس میں سب کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔'' (51)

صحافت کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ کوئی بھی رسالہ یا اخبار چاہے کتنے ہی اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے شروع کیا گیا ہو اگر پیشہ ورانہ جذبے سے بڑھ کر خالص تحریک کی شکل میں صحافت کی جاتی ہے تو تاریخ گواہ ہے کہ وہ صحافت آج بھی یاد کی جاتی ہے۔ مولوی باقر، سر سید احمد خاں، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، کسی کا بھی نام لیا جائے یہ سبھی لوگ اپنی صحافتی خدمات اور اعلیٰ اقدار کے فروغ کے لیے جانے جاتے ہیں۔ آج بھی ان کی پھیلائی ہوئی صحافت کی روشنی ویسے ہی بقعہ نور ہے جیسے ان کے وقتوں میں تھی۔ سب رس جیسا عظیم رسالہ شروع کرنے کے پیچھے بھی ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا واحد مقصد تھا اردو زبان و ادب کا فروغ۔ اردو کی ادبی صحافت کی ترقی اور محی الدین قادری زور اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

اس رسالے میں جہاں ایک طرف اردو کے نامور ادبا و شعرا کی تخلیقات پیش کی جاتی تھیں۔ وہیں دوسری طرف پہلے شمارے سے ہی اس بات کا اہتمام رکھا گیا کہ نئے ادیبوں، شاعروں اور طلبا کو بھی موقع دیا جائے جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہو اور ان میں اردو زبان و ادب کے لیے سچا شعور پیدا ہو۔ پہلے شمارے سے اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ رسالہ کافی جامع اور دلچسپ ہو۔ اسی لیے اس میں تصاویر بھی شائع ہونی شروع ہوئیں۔ پہلے شمارے میں ہی ڈاکٹر اقبال، وحیدالدین سلیم، سید امجد حسین امجد کی تصاویر شامل ہیں۔ ایک خاص بات اور بھی سامنے آتی ہے کہ اس رسالے میں اردو کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے نامور ادیبوں کی تخلیقات بھی شامل اشاعت کی گئیں اور پہلے شمارے

میں ہی میتھلی شرن گپت، رابندر ناتھ ٹیگور، جی سورج بھان، شیو رانی دیوی اہلیہ پریم چند، ونشی دھرودی لیکار کی تخلیقات شامل ہیں جو اس رسالے کو دوسرے تمام ہم عصر رسالوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ 1931 میں ادارہ ادبیات اردو کے قائم ہونے کے کچھ ہی برسوں بعد شروع کیے گئے اس رسالے نے گزشتہ 68 برسوں میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں کافی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ کافی بڑی تعداد میں رسالے نے خاص نمبر نکالے ہیں جن میں اقبال نمبر، محرم نمبر، ریڈیو نمبر، اردو نمبر، عابد علی خاں نمبر، ولی نمبر، سراج نمبر، غالب نمبر، دکنی ادب نمبر، اور قلی نمبر جیسے اہم اور دستاویزی نمبر کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

سب رس کے کچھ خاص نمبروں کی تفصیل:

مارچ	1938	محرم نمبر
جون	1938	اقبال نمبر
جنوری	1939	مرقع دکن نمبر
جنوری	1941	ریڈیو نمبر
ستمبر	1949	افسانہ نمبر
فروری مارچ	1954	خاص نمبر
فروری، مارچ	1955	جشن سیمیں نمبر
جنوری،فروری	1956	سالگرہ نمبر
مارچ،اپریل	1956	صفی نمبر
جولائی، اگست	1956	امجد نمبر
جنوری	1957	ادارہ نمبر
اپریل،مئی، جون	1958	خاص نمبر قلی قطب شاہ
جنوری	1960	محمد قلی قطب شاہ نمبر
مارچ	1960	ادارہ نمبر
مئی	1960	ایوان اردو نمبر

اپریل	1961	ادارہ نمبر
جون	1961	ٹیگور نمبر
جنوری	1962	قلی قطب شاہ نمبر
مارچ	1962	ادارہ نمبر
مئی، جون	1962	امجد نمبر
جولائی	1962	عزیز جنگ والا نمبر
جنوری، فروری	1963	ظفر نمبر
اپریل	1963	ادارہ نمبر
اکتوبر، نومبر، دسمبر	1963	زور نمبر
فروری	1964	یوم قلی قطب شاہ نمبر
مئی	1964	ادارہ نمبر
جنوری	1965	ہاشمی نمبر
جولائی	1965	ادارہ نمبر
اپریل	1966	یادگار محمد قلی قطب شاہ نمبر
اگست	1966	ادارہ نمبر
اکتوبر	1966	یوم زور نمبر
اگست	1967	ادارہ نمبر
جولائی	1968	یوم قلی نمبر
ستمبر	1968	ادارہ نمبر
اپریل	1969	نجیب اشرف نمبر
ستمبر، اکتوبر	1969	غالب نمبر 1
دسمبر	1969	غالب نمبر 2
جولائی	1970	ادارہ نمبر

جنوری	1971	سالنامہ
اپریل	1971	عنایت جنگ نمبر
فروری	1972	ادارہ نمبر
جون	1972	خاص شمارہ یوم قلی
جولائی	1972	بشیر نمبر
ستمبر	1972	ادارہ نمبر
مارچ	1973	احتشام نمبر
اکتوبر	1973	ادارہ نمبر
ستمبر	1974	ادارہ نمبر
جولائی	1975	ادارہ نمبر
مارچ	1977	یوم قلی قطب شاہ نمبر
ستمبر	1980	اریب نمبر
نومبر	1970	اقبال نمبر
نومبر	1980	زور نمبر
ستمبر، اکتوبر	1983	پروفیسر علی اکبر نمبر
جنوری	1985	عالم خوند میری نمبر
ستمبر، اکتوبر	1986	سکینہ بیگم نمبر
نومبر، دسمبر	1990	ڈاکٹر حفیظ قتیل نمبر
اگست	1991	ڈاکٹر سکسینہ الہام نمبر
جنوری، فروری، مارچ	1993	عابد علی خان نمبر
مارچ	1998	محبوب حسین جگر نمبر

غرضیکہ ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ میں اس رسالے کا نام جلی حروف میں لکھا جا سکتا ہے۔ دکن کی سرزمین سے شروع کیا جانے والا یہ رسالہ دکنی ادب میں تحقیق

و اشاعت کے کام تو انجام دیتا ہی رہا ہے اس کے علاوہ شمالی ہند کی ادبی سرگرمیوں کو بھی اس رسالے میں خاص جگہ دی گئی ہے اور یہی بات اس رسالے کو اردو کے ادبی رسائل میں سب سے زیادہ ممتاز بناتی ہے۔ سب رس ایک ایسا رسالہ ہے جس میں شروع سے ہی بچوں کے اوراق مختص کر دیے گئے تھے اور جنوری 1938 سے ہی بچوں کے سب رس کی بھی شروعات ہوئی تھی جس میں ان کی دلچسپی اورضروریات کے تعلق سے کافی مواد شائع کیے جاتے رہے۔ سب رس نکالنے کا مقصد تھا کہ یہ رسالہ اردو کے تمام حلقوں میں یکساں طور پرمقبول ومعروف ہواور سماج کے ہر طبقے کی دلچسپی کا اس میں سامان ہو اور اگر دیکھا جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ادب کی سچی خدمت تبھی ہو سکے گی جب اس میں سب کے لیے دلچسپی کا سامان رکھا جائے ورنہ ادب ایک خاص حلقے تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ جبکہ ادب ایک لافانی اور لامحدود شے ہے جسے سماج کے کونے کونے تک پہنچنا چاہیے۔

ماہنامہ سہیل: ترقی پسندی اور اشتراکیت کو پروان چڑھانے کے لیے اس ماہنامے کی شروعات گیا سے 1939 میں کی گئی تھی۔اس معروف رسالے کوبسمل سنسہاروی نے شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ بعد میں بند ہوگیا تھا لیکن 1954 میں اسے ادریس سنسہاروی نے دوبارہ جاری کیا۔ملاحظہ ہو:

> ''میرے پاس سہیل کا پہلا شمارہ موجود ہے جس میں واضح طور پر درج ہے کہ 1939 میں اس رسالے کا رجسٹریشن ہوا تھا اور اسی سال اس رسالے کے ایک یا دو شمارے منظر عام پر آئے تھے۔ اس کی تحقیق میں نے بسمل صاحب کے پوتے اور ادریس صاحب کے لائق فرزند جناب جمیل منظر اور ممتاز شاعر مظہر امام سے بھی کی اور دونوں نے ستمبر 1939 کی تاریخ کو ہی صحیح بتایا۔رہی بات اس کی تجدید اجرا اور ادریس سنسہاروی کی اس میں شمولیت تو ادریس سنسہاروی نے سہیل کی ادارت 1954 میں سنبھالی تھی۔سہیل کے شماروں سے اس کی وضاحت ہوجاتی ہے۔'' (52)

ماہنامہ سہیل بہار سے جاری ہونے والے رسالوں میں کافی اہم تصور کیا جاتا ہے۔ اس رسالے نے ادب اور صحافت کی کافی خدمات کیں اور کئی معروف خصوصی نمبر شائع کیے۔ 1958 میں سہیل کا جمیل مظہری نمبر شائع ہوا تھا۔کچھ اور خصوصی نمبروں میں بھاگل پور کا ادبی ماحول نمبر1960، منشی پریم چند نمبر1980، سہیل عظیم آبادی نمبر1981،جمیل مظہری نمبر1983، کیفی اعظمی نمبر1984، کلام حیدری نمبر، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔سہیل کے قلمکاروں میں جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی،علیم اللہ حالی،کلام حیدری،مظہر امام،سید احمد قادری جیسے کہنہ مشق ادیب، صحافی اور شاعر شامل تھے۔ گیا سے شائع ہونے والے رسالے ندیم اور سہیل کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے عاصم شہنواز شبلی لکھتے ہیں:

’’بہار میں سہیل اور ندیم دو ایسے رسالے تھے جس نے شعر وادب کی جیسی خدمت کی ہے وہ شاید ہی کسی رسالے اور جریدے نے کی ہے۔ ان دو رسالوں نے صحیح معنوں میں بہار میں اعلیٰ ادبی صحافت کی بنیاد ڈالی اور اسے ہندوستانی صحافت کے مد مقابل لا کھڑا کردیا جس کا بین ثبوت سہیل میں شائع ہونے والے ادیب و شاعر ہیں۔سہیل اور ندیم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان رسالوں نے ہندوستان میں بڑے بڑے ادیب و شاعر پیدا کیے جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ کچھ ادیب اور شاعر تو سہیل کے ذریعے ہی ادب کے افق پر نمودار ہوئے اور یہیں سے شہرت و کمال حاصل کیا۔سہیل کے ذریعے ادریس سنسہاروی نے ایک طرف کامیاب تخلیقات کی اشاعت کی تو دوسری طرف ان ادبی و ثقافتی نقوش کو بدلنے کی کوشش کی جن میں جمود اور تعطل پیدا ہو چکا تھا۔ بہت سارے ادیب اور شاعر تو ایسے تھے جو چاہتے ہوئے بھی لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ادب سے وہ اپنا رشتہ توڑنے کے قریب تھے۔ادریس سنسہاروی نے ان کے اندر ادب تخلیق کرنے کے لیے جوش و جذبہ بھرا اور ان کے اندر جو روشن الاؤ تھا اس کی لو کو تیز کرنے کی کوشش کی اور اس میں ادریس سنسہاروی کامیاب بھی ہوئے۔‘‘(53)

سہیل میں کہنہ مشق شعرا، ادبا کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی کافی جگہ ملی۔ سہیل نے صوبہ بہار میں اور خاص طور سے گیا میں ادبی ماحول تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔بہار کی ادبی صحافت کو پروان چڑھانے میں اس رسالے کا نام ہمیشہ سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا۔

(نن پرون) آجکل: آجکل حکومت برطانیہ کے ذریعہ قائم کیے گئے یونائیٹڈ پبلی کیشنز سے شائع ہوتا تھا۔ یونائیٹڈ پبلی کیشنز کو برطانوی حکومت کے ذریعے اپنی سرگرمیوں کو ایران، افغانستان اور اسلامی ممالک تک پہنچانے اور پھیلانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔اس ادارے سے عربی، فارسی، پشتو اور انگریزی زبان میں کتابیں اور رسائل شائع کیے جاتے تھے۔اسی ادارے سے ایک رسالہ پشتو زبان میں نن پرون کے نام سے 5 مئی 1941 کو شروع کیا گیا تھا،لیکن بعد میں لوگوں کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس رسالے کا اردو ایڈیشن 10جون، 1942 کوشروع کیا گیا۔ یہ پندرہ روزہ جریدہ تھا اور ہر ماہ کی 10 اور 25 تاریخ کوجلوہ افروز ہو جاتا تھا۔اس رسالے میں زیادہ تر سیاسی مضامین اور پشتو ادب اور سرحدی علاقوں کے قارئین کی دلچسپی پر مبنی مضامین کو شائع کیا جاتا تھا۔اس رسالہ نن پرون کے پہلے اردو ایڈیشن میں ادارے کی طرف سے یہ اعلان شائع کیا گیا تھا:

> ’’نن پرون ایک عرصے سے پشتو زبان اور پشتو ادبیات کی بے نظیر خدمات سر انجام دے رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس رسالے کی قدر ومنزلت پختون قوم کے دل میں بس گئی ہے۔بعض احباب پے در پے خواہش کر رہے ہیں کہ نن پرون کا اردو ایڈیشن بھی نکالا جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش اور دلائل سے متاثر ہو کر ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نن پرون کا اردو ایڈیشن جاری کیا جائے جس کا پہلا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اپنی قیمتی آرا اور مشوروں سے ہمیں مشکور فرماویں۔‘‘ (54)

نن پرون کے اردو ایڈیشن نکلنے کے تقریباً 5 مہینے کے بعد اس میں لفظ آجکل جوڑ دیا

گیا۔ کیونکہ یہ پشتو زبان کا لفظ ہے اور نن کے معنی آج اور پرون کے معنی کل ہوتے ہیں جبکہ یہ رسالہ پشتو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شائع ہو رہا تھا اس لیے نن پرون کی مناسبت سے اس میں آجکل کا اضافہ کر دیا گیا جبکہ آجکل کے ساتھ ساتھ نن پرون بھی لکھا جاتا رہا۔ 25 نومبر 1942 کو وہ پہلا شمارہ شائع ہوا تھا جس میں آجکل بھی لکھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر صرف آجکل لکھ دیا جاتا تو لوگ سمجھ نہیں پاتے اس لیے پندرہ روزہ آجکل کے ساتھ 'نن پرون کا اردو ایڈیشن' بھی جوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ جریدہ 4 مئی 1943 تک ایسے ہی شائع ہوتا رہا۔ جہاں پہلے یہ 10 اور 25 تاریخ کو شائع ہوتا تھا اب 4 اور 20 تاریخ کو شائع ہونے لگا۔ 4 مئی 1943 تک نکلنے کے بعد یکم جون 1943 کو اس رسالے سے نن پرون کو ہٹا دیا گیا اور صرف 'آجکل پندرہ روزہ باتصویر رسالہ' شائع ہوتا تھا۔ آجکل نے جب اپنی اشاعت کے دو سال پورے کر لیے تو رسالے نے اپنی کامیابی کو کچھ یوں بیان کیا:

> ''اپنی دوسری سالگرہ کے موقع پر رسالہ 'آجکل' ایک نیا روپ بدل کر سامنے آرہا ہے۔ اب تک یہ رسالہ پشتو کے معروف رسالے نن پرون کا گویا ایک اردو چربہ ہوتا تھا اور اس حیثیت سے صوبہ سرحد میں پہلے ہی روشناس ہے۔ یہ اردو ایڈیشن جون1942 میں شائع ہونا شروع ہوا اور جب سے اب تک غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے بہت سے قدر دانوں کی فرمائش پر بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ ہم صرف اپنے سرحدی احباب کو ہی مخاطب نہ کریں۔ بلکہ یہ رسالہ تمام ہندوستان کی اردو داں پبلک کے موافق مذاق اور پسند خاطر ہو سکے۔ چنانچہ اب رسالہ 'آجکل' ایک کل ہند حیثیت کا رسالہ ہوگیا ہے۔ امید ہے اہل ذوق اس کی حوصلہ افزائی کریں گے۔''(55)

15 اگست 1947 تک یہ رسالہ پندرہ روزہ رہا اور اس کے بعد بند ہو گیا۔ تقریباً تین مہینے تک اس کی اشاعت بند رہی۔ 1947 میں تقسیم ہند کے واقعات اور حالات کو

دیکھتے ہوئے اسے بند کرنا پڑا تھا۔ بعد میں جب حالات معمول پر آئے تو دسمبر 1947 سے یہ رسالہ ماہنامے کی شکل میں شروع ہوا لیکن اس پر پندرہ روزہ رسالہ لکھا جاتا رہا۔ جنوری اور فروری 1948 کا دوماہ پر مشتمل مشترکہ شمارہ شائع کیا گیا۔ اس کے بعد ایک خاص نمبر گاندھی جی کی موت پر شائع کیا گیا۔ یہ شمارہ گاندھی نمبر کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ شمارہ میں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے لیکن اس میں کسی مہینے کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ گاندھی نمبر کے بعد اگست 1948 میں یہ ماہنامہ ایک نئے گیٹ اپ کے ساتھ شروع ہوا۔ گاندھی نمبر پر حالانکہ کوئی ماہ تحریر نہیں ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو اسے ہم مارچ سے لے کر جولائی تک کا شمارہ کہہ سکتے ہیں۔ اکتوبر 1948 سے اس کے پتے میں تبدیلی کی گئی اور پبلی کیشنز ڈویژن پوسٹ بکس نمبر 144 لکھا جانے لگا، جہاں یہ پہلے انگریز حکومت کی ماتحتی میں شائع ہوتا تھا اب حکومت ہند کے ذریعے شائع کیا جانے لگا۔ دسمبر 1948 میں اسے ایک بار پھر پندرہ روزہ کر دیا گیا لیکن ٹھیک ایک سال بعد یعنی دسمبر 1949 میں اسے دوبارہ سے ماہنامہ کر دیا گیا۔ آجکل اس کے بعد سے لگاتار شائع ہو رہا ہے اور حکومت ہند کے اہم ادارے پبلی کیشنز ڈویژن کے ذریعے شائع کیا جا رہا ہے۔ یوں تو یہ سرکاری رسالہ ہے لیکن اردو زبان کی خدمت کے لیے رسالے کو ہمیشہ سے ہی نامور ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ سید وقار عظیم، شان الحق حقی، جوش ملیح آبادی، راج نرائن راز، نند کشور وکرم۔ جگن ناتھ آزاد، محبوب الرحمٰن فاروقی، ابرار رحمانی، خورشید اکرم، نرگس سلطانہ وغیرہ جیسے قابل اور سرگرم لوگوں کی ادارت میں آجکل نے کافی ترقی کی ہے۔ آجکل کی ادبی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف محقق ڈاکٹر جمیل اختر لکھتے ہیں :

> ’’آزادی سے قبل اور اس کے بعد بھی ہندوستان میں شائع ہونے والے ادبی جریدوں میں آجکل کی اپنی ایک انفرادیت رہی ہے۔ آجکل ابتدا ہی سے ایک خاص طریق کار کا حامل رہا ہے۔ جس کی بدولت اس کی اپنی پہچان بنی جو شروع سے آج تک قائم ہے۔ اس جریدے نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہر طرح کے نظریاتی اختلافات، ادبی گروہ بندی اور

سیاست سے الگ رہ کر، ہر نظریے اور ہر طبقے کے لوگوں کی نمائندگی کی ہے۔ کسی ایک نظریے سے آج کل کی وابستگی نہ پہلے کبھی تھی اور نہ اب ہے۔ یہ تمام تعصّبات سے اوپر اٹھ کر علم و ادب کی خدمت کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رسالے نے ترقی پسند، غیر ترقی پسنداور جدید یت کے حامی ادیبوں و دانشوروں کی تخلیقات کو اپنے صفحات میں جگہ دی اور ان کو یکساں مواقع فراہم کیے۔ آج کل کی اسی غیر جانب داری نے اس رسالے کو ہر طرح کے لوگوں میں یکساں طور پر مقبول بنایا۔ آج ہمارے بہت سے دانشوران ادب نظریاتی اور شخصی مفاد کی خاطر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ ایسے میں ہر زاویہ فکر کے لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنا اور سب کو ساتھ لے کر چلنا صرف آجکل کا طرہ امتیاز ہے اور یہی اس کی شہرت و مقبولیت کا سبب ہے۔

ادبی جریدوں میں جو امتیاز آج کل کو حاصل ہے وہ شاید کسی اور کو حاصل نہیں ابتدا ہی سے حکومت کا ترجمان ہونے کے باوجود اس نے علم و ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس کا ماضی اور حال اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔'' (56)

ڈاکٹر جمیل اختر نے بالکل بجا فرمایا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ بات چاہے خالص ادب کی ہو یا خالص سائنس کی آج کل میں ہر طرح کے مضامین چھپتے رہے ہیں۔ نینوٹیکنالوجی، حرکی حقیقت، ماس کمیونیکیشن یا اسی طرح کے دوسرے موضوعات پر کافی بڑی تعداد میں مضامین شائع ہوتے رہے ہیں جو آجکل کی قدر و قیمت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ آجکل نے اردو ادب میں ایسے مضامین کو شائع کیا ہے جو اس سے پہلے اردو میں شائع نہیں ہوئے تھے اور یہی آجکل کا امتیاز رہا ہے۔ آج بھی یہ رسالہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔

سویرا: ترقی پسند ادب کے فروغ کے لیے اس رسالے کو شروع کیا گیا تھا۔ 1946 میں

چودھری نذیر احمد نے ایک ماہنامے کی شکل میں اس کی شروعات کی۔ پہلا شمارہ فکر تونسوی، احمد ندیم قاسمی اور چودھری نذیر احمد کی ترتیب میں شائع ہوا۔ ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، کیفی اعظمی، ظہیر کاشمیری، عبدالمتین عارف اور طفیل احمد جیسے ترقی پسند مصنفین کی تحریریں اس رسالے میں شائع ہوتی رہیں۔ نثری نظموں اور علامتی افسانوں کو بھی اس میں شائع کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کی آبیاری میں سویرا کی حصہ داری کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ کافی لمبے عرصے تک یہ مجلّہ جاری رہا۔

کچھ اور اہم مجلّے :

1900 کے بعد نکلنے والے کچھ اہم رسائل کے نام اس طرح ہیں۔

جولائی 1914 میں تذکرۃ الشعرا علی گڑھ۔ سہ ماہی، ایڈیٹر، مولانا حسرت موہانی، عبرت، نجیب آباد جنوری 1916، ماہانہ، آب حیات میرٹھ ماہانہ، جنوری 1916، ادیب لاہور ماہانہ، نومبر 1916، پیام یار لاہور، 1916، ماہانہ رفیق التعلیم، ماہانہ، لاہور، جنوری1917، کہکشاں، ماہانہ لاہور، ستمبر 1918، صبح امید، ماہانہ لکھنؤ، اکتوبر 1918، نظام، ماہانہ، لاہور، فروری 1919، شگوفہ، کانپور ماہانہ 1924۔، شمع ماہانہ، آگرہ، جنوری 1925 اورینٹل کالج میگزین، لاہور سے ماہانہ، فروری 1925۔ مشاعرہ، فرخ آباد، ماہانہ گلدستہ، فروری 1930، ادبی دنیا 1929، ادب لطیف 1933، برہان، دہلی، 1939۔

ہندوستان کی آزادی اور برصغیر کی تقسیم ایشیا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ آزادی اور پاکستان کے ظہور پذیر ہونے کے بعد اردو صحافت اور ادیبوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاں کئی رسائل و جرائد پاکستان کے لاہور، کراچی اور پشاور سے دہلی اور دوسرے شہروں میں آئے وہیں ہندوستان کے دہلی، آگرہ اور بمبئی سے کئی اخبارات و جرائد کا پاکستان کے شہروں میں تبادلہ ہو گیا۔ ہندوستان کی آزادی اور برصغیر کی تقسیم ایشیا کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ برصغیر کی تقسیم نے ہندوستان میں رہنے والوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ اس سے ادب وصحافت، ملکی

وغیر ملکی سیاست، ہندوستانی معیشت کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی زندگیاں بھی متاثر ہوئیں۔ اردو ادب وصحافت پر بھی خاصا اثر پڑا اور کچھ رسائل و اخبارات ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو گئے تو کچھ پاکستان سے ہندوستان۔

پروفیسر محمد شاہد حسین لکھتے ہیں :

> ''1947 میں ہندوستان آزاد ہی نہیں ہوا بلکہ تقسیم بھی ہو گیا جس کی وجہ سے اردو صحافت کو زبردست دھچکا پہنچا۔ بہت سے اخبارات اور پریس ہنگامے کی نظر ہو گئے۔ بہت سے صحافی اور قارئین ہجرت کر گئے۔ جس کی وجہ سے قارئین کی بھی کمی ہو گئی۔ پھر اردو کے ہندوستان میں سرکاری زبان نہ رہ جانے کی وجہ سے بھی اردو صحافت متاثر ہوئی۔ ہندوستان کی آزادی کے کافی عرصے بعد اردو زبان نے پھر سے رفتار پکڑی اور بہت بڑی تعداد میں اخبارات و رسائل نکلنا شروع ہوئے۔'' (57)

اس وقت کا یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ تقریباً تمام اخبارات و رسائل نے آزادی اور تقسیم کو اپنا موضوع بنایا۔ بہت سارے اخبارات و رسائل بند ہو گئے اور دونوں مما لک میں نئے نئے قانون اور پریس ایکٹ کے بننے تک اخبار اور رسائل کا شائع ہونا کافی دشوار کن مرحلہ رہا۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں ایک نئے سرے سے اردو صحافت کا فروغ شروع ہوا اور دھیرے دھیرے ماضی کے زخم بھرتے گئے اور دونوں مُلکوں کے ادبا وشعرا نے اردو زبان و ادب اور اردو صحافت کو ایک نئی سمت دینے اور اسے پھر سے زندہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ادب کی دوسری اصناف، مثلاً ناول، افسانوں، شاعری پر جس طرح سے تقسیم ہند کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں اسی طرح سے اردو صحافت پر بھی اس ہنگامے کا اثر پوری طرح واضح نظر آتا ہے۔

اردو صحافت نے اپنی شروعات سے ہی ایک اصلاحی، تعلیمی مقصد کو سامنے رکھا تھا اور وقت و حالات کے ساتھ ساتھ اس میں قومی عنصر بھی شامل ہوتا گیا۔ 1822 سے لے کر 1947 تک کی اردو صحافت کی تاریخ گواہ ہے کہ چاہے اخبارات ہوں یا رسائل سب

نے کھل کر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ہمیشہ ہی اس کے لیے انھیں قید و بند اور جرمانے کی سزا دی گئی۔ مولوی باقر کی شہادت حسرت موہانی کی قید، مولانا آزاد کی صعوبتوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

حواشی

1. عبدالسلام خورشید، داستان صحافت، مجلس ترقی ادب لاہور 1963، ص 10
2. انٹرویو، شمس الرحمٰن فاروقی، بحوالہ ویب سائٹ، شمس الرحمٰن فاروقی ڈاٹ کام
3. روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، 1989، ص 13
4. نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987، ص 75
5. پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2003 ص79
6. نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987، ص 97
7. پروفیسر فضل الرحمٰن (مضمون) اردو انسائیکلوپیڈیا، جلد سوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ص585
8. سنجر ہلال بھارتی، مضمون، تحریک آزادی اور اردو صحافت، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، اگست 1999 ص20
9. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول، چوڑی والان دہلی، ص 495-494
10. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول، چوڑی والان دہلی، ص 50
11. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد دوم، چوڑی والان دہلی، ص59
12. قطب اللہ، مولانا آزاد کا نظریہ صحافت، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ص 11
13. نیاز فتحپوری، مضمون، مولانا آزاد کی صحافتی عظمت، ماہنامہ آجکل، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، اگست 1958 ص 20
14. تاریخ صحافت اردو جدید پرنٹنگ پریس، چوڑی والان، دہلی، جلد اول، ص 226
15. نادر علی خاں، اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987 ص 248
16. نادر علی خاں، اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987، ص 190
17. محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

1957، ص287

18. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جدید پرنٹنگ پریس، چوڑی والان، دہلی، جلد دوم، ص 213

19. خلیق احمد نظامی، سید احمد خاں، آجکل، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی جون 1971، ص 97

20. ڈاکٹر انیس احمد صدیقی، کرناٹک میں اردو صحافت، افلاک پبلی کیشنز، بلال آباد، گلبرگہ، کرناٹک 2003 ص136

21. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جدید پرنٹنگ پریس، چوڑی والان، دہلی، جلد دوم ص 310

22. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جدید پرنٹنگ پریس، چوڑی والان، دہلی، جلد دوم ص 256

23. امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جدید پرنٹنگ پریس، چوڑی والان، دہلی، جلد دوم

24. عابد رضا بیدار، اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار ص 127

25. مضمون اردو صحافت عہد بہ عہد، رئیس الدین فریدی، انور دہلوی، مرتبہ اردو صحافت، دہلی اردو اکادمی، ص50

26. فرحت احساس، مضمون 'صحافت، پیشہ یا مشن'، مرتبین محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی، اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ، اردو اکادمی دہلی، 2007، ص 126

27. روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، 1989 ص 27

28. رسالہ، زمانہ، کانپور،، مارچ 1938، ص 2

29. رسالہ، زمانہ، کانپور، فروری 1938

30. روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان 1989، ص30

31. اردوئے معلیٰ، مدیر حسرت موہانی، علی گڑھ ماہ، جولائی 1907، ص 43
32. اردو صحافت اور حسرت موہانی ڈاکٹر شریف الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005، دہلی، ص 148
33. ماہنامہ جامعہ، ستمبر 1992، ص 34
34. مولانا امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم، چوڑی والان، دہلی، ص 484
35. ڈاکٹر شریف الدین، اردو صحافت اور حسرت موہانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005، ص 90
36. ڈاکٹر محمد یونس، انجمن ترقی اردو ہند کی تاریخ و خدمات 1947 تک، ص 279
37. ڈاکٹر رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اردو۔ راجا رام کمار پریس لکھنؤ، 1952 ص 394-393
38. رسالہ اردو ادب، علی گڑھ، جولائی 1950، ص 5
39. ص 457، رسالہ جامعہ، جلد 12، فروری 1929، نمبر 2
40. مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ شذرات، ص 55-54
41. ڈاکٹر فرزانہ خلیل، رسالہ جامعہ کا تنقیدی اشاریہ 1947-1923، تخلیق کار پبلشرز، 104/B، یاور منزل، آئی بلاک لکشمی نگر، دہلی – 110092، ص 84
42. روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، 1989، ص 34
43. ماہنامہ ساقی، دہلی، سالنامہ۔ جنوری 1937، ص 4
44. مولانا امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، چوڑی والان، دہلی، جلد، پنجم، ص 1176
45. حامد اقبال صدیقی، سیماب اکبرآبادی، ساہتیہ اکادمی، دہلی 2009، ص 42-41
46. ڈاکٹر شمیم نکہت، مضمون 'اردو ادبی رسائل کے چند اہم خاص نمبر'، روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی 1982، اردو بک سیلر اور پبلیشرز نمبر ص 115
47. افتخار امام صدیقی، ایک ناممکن تخلیق خواب کی داستان، اداریہ، ہم عصر اردو ادب نمبر، ماہنامہ شاعر مئی تا دسمبر، 1997، ص 25

48. انٹرویو افتخار امام صدیقی، مصاحبہ نگار، غضنفر اقبال، روز نامہ کے بی این ٹائمز، گلبرگہ کرناٹک، یکم دسمبر 2008، ص 3

49. ماہنامہ کتاب نما، مئی 1978، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ص6

50. شاعر ہم عصر اردو ادب نمبر مضمون 'شاعر ابتدائی شماروں کی روشنی میں'، فیروز احمد، ص 106

51. ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، جنوری 1938، پیش لفظ ص 4

52. عاصم شہنواز شبلی، مضمون: ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم، ماہنامہ امکان، لکھنؤ، دسمبر، جنوری 2009، ص 36

53. ایضاً، ص 38

54. ادارہ نن پرون راج پور روڈ، 10، پرانی دہلی، رسالہ نن پرون، اردو ایڈیشن 10 جون 1942

55. پندرہ روزہ آجکل دہلی، یکم جون 1943 ص 4

56. جمیل اختر، اشاریہ ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، ص 81

57. پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2003، ص 121

آزادی کے بعد اردو کے رسائل و جرائد
(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

اردو صحافت جس کی شروعات 1822 میں ہوئی تھی 1947 تک کافی ترقی کرچکی تھی اور اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو صحافت میں بھی نت نئے تجربے ہونے شروع ہوگئے تھے۔کسی بھی ملک کے حالات و واقعات کا اثر ملک کے ادب وصحافت پر پوری طرح ہوتا ہے اور یہی ہمارے ملک کی صحافت کے ساتھ بھی ہوا۔ جہاں بھی کوئی تحریک چھیڑی گئی ہے چاہے وہ سیاسی ہو یا غیرسیاسی اس کا دارومدار صحافت پر رہا ہے۔صحافت کے کندھوں پر سوار ہوکر ہی وہ تحریک زور پکڑتی ہے اور بعد میں یہ تحریک اتنی مضبوط ہوجاتی ہے کہ ایوان اقتدار کوتہہ وبالا کرتے ہوئے بغاوت وانقلاب کا سبب بنتی ہے۔ ملک میں جس صحافت کی آبیاری مولوی محمد باقر، سرسید احمد خاں، ظفرعلی خاں، حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، نیازفتحپوری نے کی تھی وہ آزادی کے وقت تک پہنچتے پہنچتے بہت ہی مضبوط ہوچکی تھی اور ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ 1947 سے قبل ملک کے مختلف حصوں سے کافی بڑی تعداد میں اخبار ورسائل نکل رہے تھے جن میں سب رس، بیسویں صدی، انقلاب، شاعر، آجکل، نیادور، ساقی اوررسالہ اردووغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے

لیکن ملک کی آزادی کے بعد اردو ادب وصحافت کی ترقی کی رفتار جیسے تھم سی گئی۔ ہندوستان میں آزادی یا ملک کی تقسیم جس انداز سے کی گئی وہ کسی طرح بھی صحیح نہیں تھی۔ ایک طرف تو ملک آزاد ہوا اور دوسری طرف ہزاروں لاکھوں انسان نفرت وعداوت کی بھینٹ چڑھ گئے ملک کے لیڈروں نے عوام سے جو وعدہ کیا تھا وہ وفا نہیں کر سکے۔ کہنے کو تو ملک آزاد ہوگیا تھا لیکن عوامی مسائل کی کمی نہیں تھی اور لوگ انسان دشمنی نفرت وعداوت اور انتقام کی ایسی آگ میں جلنے لگے جو ایک لمبے عرصے کے بعد سرد ہوئی۔ 1947 میں ملک کے بٹوارے کے بعد قتل وغارت گری کا وہ طوفان برپا ہوا جس کی مثال ملنی آج بھی ناممکن ہے۔ شاید دنیا میں پاکستان ایسا واحد ملک ہے جس کی تخلیق مذہب کی بنیاد پر ہوئی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کچھ گنے چنے سیاسی لیڈروں کی آپسی عداوت کا نتیجہ تھا جو برصغیر میں تقسیم کی شکل میں رونما ہوا۔ علامہ اقبال نے ایسے وقت کے لیے ہی کہا تھا:

جہلِ فرد نے یہ دن دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی
کہ انساں عالم انسانیت پر بار ہو جائے
(اقبال)

آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد جہاں ایک طرف ملک میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے کہ ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوگیا، وہیں دوسری طرف ایک بڑی آبادی کو دوحصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ اس طرف سے ادھر گئے اور اس طرف سے ادھر آئے۔ ملک کا جمہوری نظام عوام کے مسائل کو دور کرنے میں ناکام رہا اور دونوں ملک اقتدار کے نشے میں ایسے ڈوبے کہ دونوں ہی ملکوں کے عوام آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کا اثر ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ برصغیر کی تقسیم کے اتنے بڑے سانحے نے انسانی زندگی کو تہہ وبالا کرکے رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ ملک کے حالات وواقعات کا اثر ادب وتخلیقات پر پڑتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ ملک کی آزادی سے قبل ترقی پسند

تحریک کا دور دور ہ تھا اس وقت کے ادب وصحافت کے موضوعات اشترا کی نظام، جمہوریت کی لڑائی، آزادی، سماجی برابری، مزدور اور محنت کشوں کی لڑائی وغیرہ تھے۔

جب بھی ملک میں کوئی تحریک شروع ہوئی ہے یا کوئی بڑا حادثہ رونما ہوا ہے اردو صحافت نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے لیکن اردو صحافت کے ساتھ ایک بہت بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ بدلے میں اسے نظر انداز ہی کیا گیا ہے اور جو حق ملنا چاہیے تھا وہ ملا نہیں۔ یہ فخر بھی اردو صحافت کو حاصل ہے کہ ملک کا سب سے پہلا شہید ہونے والا صحافی اردو کا تھا، اس کے علاوہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں بھی اردو صحافت نے اہم رول ادا کیا، اور اگر ہم آزادی کی بات کریں تو حسرت موہانی نے ہی سب سے پہلے اپنے اردو مجلّے 'اردوئے معلّٰی' کے ذریعے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اردو صحافت نے ملک کی تعمیر وترقی میں شروع ہی سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے لیکن اردو کو ہمیشہ نظر انداز کیا جا تا رہا ہے۔ بات چاہے مولوی باقر کی ہو یا حسرت موہانی کی دونوں کو اس کی سزا ہی ملی ہے۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد بھی اردو اخبارات ورسائل کو انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار ہونا پڑا تھا۔ 1857 کے بعد کے حالات تو اور بھی بدتر ہو گئے تھے۔ خاص طور سے مسلمان طبقہ تو تاریکی اور ناامیدی کے غار میں دفن ہوتا جارہا تھا لیکن سرسید احمد خاں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق جیسے رسالوں سے اردو صحافت کی لاج رکھ لی۔ بعد میں ظفر علی خاں، حسرت موہانی او رمولانا آزاد نے صحافت کی باگ ڈور سنبھالی اوراردو صحافت کو عروج بخشا لیکن ملک کی تقسیم اور ملک کی آزادی کے بعد تو اردو صحافت کا جیسے کوئی رکھوالا نہیں تھا۔ ملک میں ہر طرف افراتفری کا ماحول تھا۔ جب اردو صحافت نے انگریزوں کے خلاف ہرقدم پر زورآزمائی کی، ملک کی آزادی کے بعد سب سے زیادہ ستم اسی پر ہوئے۔ آزادی کے بعد اردو کے رسائل وجرائد اوراخبارات پر پابندی عائد کردی گئی۔ ہندی زبان کے فروغ پر زیادہ کوششیں کی جانے لگیں۔ ایسا سمجھا جانے لگا کہ اردو زبان کی ترقی سے ہندی زبان کوخطرہ ہے جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن ان ارباب اقتدار کو کون سمجھا تا جنھوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب اور نفرت کا چشمہ لگا رکھا تھا انھیں اردو مسلمانوں کی زبان

نظر آتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اردو بولنے والے بڑی تعداد میں مسلمان ہیں لیکن یہ زبان کبھی مسلمانوں کی نہیں رہی۔ آزادی کے بعد ملک میں جمہوریت کا شور بلند ہوا اور اس جمہوریت میں بھی مذاہب کو مکمل آزادی دینے کی بات کہی گئی لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اردو ادب وصحافت پر بے جا ظلم وستم کیے گئے اور ملک میں بڑی تعداد میں رسائل وجرائد بند ہو گئے۔

آزادی کے بعد ہندوستان کا بدلتا منظر نامہ

بیسویں صدی کی شروعات سے ہی ہندوستان میں سیاسی اورصحافتی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ انیسویں صدی کے اواخر سے ہی ظفر علی خاں کا 'زمیندار' آسمان صحافت پر جگمگا رہا تھا اور بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ کی شروعات کر کے ہندوستان کی اردوصحافت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر نے اسے اور بھی توانائی بخشی۔ انگریزوں کی ہمیشہ سے یہ سازش رہی ہے کہ وہ اپنی غلطی کا الزام بلاوجہ مسلمانوں پر عائد کر دیتے تھے اور ایسا ہی انھوں نے 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد بھی کیا تھا اور اس بغاوت کا ذمے دار مسلمانوں کو قرار دیا گیا اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے رسائل وجرائد اوراخبارات نے مسلمانوں کے خلاف خوب خوب زہرافشانی کی۔ لاہور کرانیکل جیسے اخبار نے 8 جولائی 1857 کی اشاعت میں کچھ اس انداز میں لکھا تھا:

> ''اب اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس بغاوت کی تہہ میں مسلمانوں کی سازش کارفرما ہے انھیں شدید سے شدید سزا دینی چاہیے۔ کیونکہ یہ جب تک مسلمان ہیں اپنی رائے نہ بدل سکتے ہیں نہ بدلیں گے۔''(1)

لاہور کرانیکل کے ساتھ ساتھ دوسرے اخبارات نے بھی مسلمانوں کی مخالفت میں مضامین شائع کیے۔ حالانکہ انگریزوں کے خلاف بغاوت یا جنگ آزادی میں برصغیر کی مختلف اقوام نے حصہ لیا تھا لیکن مسلمان اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو ہی انگریز حکومت کے ظلم وستم اورسزا کا نشانہ بننا پڑا۔ اس ظلم وعتاب سے سب سے زیادہ

نقصان مسلم قوم کا ہوا تھا اور نتیجے کے طور پر مسلم طبقہ معاشی تنگدستی، تعلیمی بے راہ روی، جاہلیت اور بے حسی کے تاریک اندھیرے میں گم ہوتا چلا گیا۔

1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد کئی اردو اخبارات کو بند کردیا گیا اور ان کے مدیروں کو سزا کا حقدار ٹھہرا یا گیا اور مولوی محمد باقر ہندوستانی صحافت کے پہلے شہید صحافی کہلائے۔ 1857 کے بعد کی صحافت کی صورتِ حال کا اندازہ جے نٹراجن کی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''سنہ 1853-54,1850 اور 1857 میں تیار کیے گئے اور شائع کیے گئے اخبارات کی فہرست کے جائزے سے کچھ دلچسپ حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ 1853 کی فہرست میں 35 اخبارات کے نام ہیں جن میں سے 15 نام 1850 کی فہرست والے ہیں 1858 کی فہرست کے مطابق اس وقت صرف 12 اخبارات شائع ہورہے تھے جن میں سے صرف چھ اخبارات 1854-1857 والی فہرست کے ہیں۔ ان بارہ اخبارات میں صرف ایک اخبار کا مدیر مسلمان تھا۔'' (2)

جے نٹراجن کے مذکورہ قول سے یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ اردو صحافت کی حالت نہایت خستہ ہو چکی تھی۔ بغاوت کے بعد اخبارات نے حکومت کی پابندیوں اور حکومت کے عتاب کے ڈر سے ایک اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کرلیا اور حکومت کے خلاف کسی بھی اخبار میں کوئی مضمون شائع ہونا بند ہوگیا۔ بعد میں سرسید احمد خاں نے مردِ آہن بن کر انگریزوں کے سامنے وہ سارے حقائق پیش کیے جو بغاوت کا سبب بنے تھے اور یہ ثابت کیا کہ بغاوت کے ذمے دار مسلمان نہیں تھے۔ لندن سے ہندوستان آنے کے بعد سرسید نے ایک اصلاحی مشن کو سامنے رکھتے ہوئے صحت مند صحافت کی بنیاد ڈالی اور اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کے ذریعے اردو صحافت کو نئی ترقی اور نیا حوصلہ عطا کیا۔

کچھ اسی طرح کی صورتِ حال 1947 کے بعد بھی ہوئی تھی۔ ملک تو آزاد ہوگیا لیکن یہ آزادی برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کرکے حاصل ہوئی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں

میں سیاسی اورسماجی حالات نہایت ابتر تھے۔تقسیم ملک کی بنا پر لاکھوں لوگوں کو ترک وطن کرنا پڑا۔ بڑی تعداد میں مسلمان پاکستان گئے اوروہاں سے سکھوں اور ہندوؤں کی بڑی تعداد ہندوستان آئی۔ 1947 کی یہ آزادی اور ملک کی تقسیم نے اردو صحافت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ کئی بڑے اخبارات ورسائل پاکستان سے ہندوستان منتقل ہوئے اور بہت سارے ہندوستان کے اردو رسائل واخبارات پاکستان چلے گئے۔ لاہور سے نکلنے والے پرتاپ، ملاپ، وندے ماترم، پربھات، اجیت کا دفتر دہلی منتقل ہوگیا جبکہ ساقی، جنگ، انجام، اور مولوی عبدالحق کا رسالہ اردو پاکستان چلے گئے۔ رسالہ اردو پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان سے بھی شائع ہوتا رہا اور آج بھی اسلم پرویز کی زیرادارت سہ ماہی 'اردو ادب' کی شکل میں جاری ہے۔ بڑی تعداد میں اخبارات ورسائل بند ہوئے،جن میں روزنامہ نوجوان،منشور، ایشیا، نیاادب، کرم ویر، مزدور وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ ممبئی سے نکلنے والا رسالہ آفتاب نو،حیدرآباد سے پیام، کلکتہ سے رہنما اور کانپور سے سیاست جدید بھی بند ہوگئے۔ 1947 کے بعد ملک کے قانون میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔ 1950 میں جب نیا آئین تشکیل دیا گیا تو پریس اورصحافت کی آزادی بھی اس قانون کی زد میں آ گئی۔ بہت سے اخبارات ورسائل کے خلاف مقدمے چل رہے تھے اور بہت سارے اخبارات کو بندکردیا گیا تھا۔ عدالت نے بہت سارے اخبارات کے خلاف فیصلہ سنایا۔ مدیروں اوراخبارات کی تنظیموں، آل انڈیا نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس اور انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹ نے حکومت کے ذریعے پریس کے خلاف کیے گئے کئی اقدامات کی مخالفت کی اورحکومت نے پریس کمیشن میں کچھ اور تبدیلیاں کیں۔لیکن اس میں بھی پریس کومکمل آزادی نہیں دی گئی تھی پریس پر غیرضروری پابندیاں عائد کردی گئی تھیں ان پابندیوں کو ہٹانے کے لیے آل انڈیا نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس کے وفد نے وزیراعظم سے ملاقات کی اوران سے درخواست کی کہ آئین کی دفعہ 19-(2) میں جو تبدیلی کی گئی ہے وہ غیرضروری ہے لیکن اس درخواست کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ آل انڈیا نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس کی 24 جون 1951 کو ممبئی میں میٹنگ ہوئی۔میٹنگ میں پریس کے متعلق دفعات

کی پرزور انداز میں تنقید کی گئی۔ پریس کمیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے جے کے نٹراجن لکھتے ہیں:

''مخالفت جتانے کے لیے سبھی اخبارات سے 12جولائی 1951 کو اپنا اخبار شائع نہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ اس لیے انتخابات میں کھڑے ہوئے سبھی امیدواروں سے ان کے لیے کام کرنے اورآئین کی ترمیم کو منسوخ کرنے کی گزارش کی گئی۔'' (3)

ان حالات میں جبکہ اخبارات ورسائل کے خلاف کارروائی ہورہی تھی اور کئی مدیر عدالت کا چکر لگانے پر مجبور تھے۔ اخبار ومجلّہ نکالنا کافی مشکل تھا۔ اس وقت بڑی تعداد میں اخبارات ورسائل بند ہوگئے۔ اردوصحافت کی اس ناگفتہ بہ حالت کے لیے ایک حد تک خود اردو والے بھی ذمے دار تھے۔ یہ صحیح ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ملک کا ایک بڑا طبقہ مسلمانوں اور اردو کو تعصب کی نظر سے دیکھ رہا تھا لیکن اردو ادیبوں اور اردوصحافیوں نے اس پرآشوب دور میں کہیں نہ کہیں بےعلمی، پست ہمتی اوراحساس کمتری کا ثبوت دیا جس سے اردوصحافت اوربھی کمزور ہوئی جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ ایسے مشکل وقت میں ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوتے اور اپنی عظمت کا ثبوت پیش کرتے۔ ملک میں کچھ تنگ نظر اردو کی ترقی سے حسد بھی کرتے تھے کیونکہ آزادی سے قبل یہ دوسری سب سے بڑی زبان تھی لیکن آزادی کے بعد سب سے زیادہ نقصان اسی زبان کا ہوا۔ ڈاکٹر شمیم حنفی تقسیم کے بعد کے اردو ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ تقسیم کا ادب ایک واضح سماجی جہت رکھتا ہے اورآزادی کے بعد کے چار پانچ برسوں میں یہ ادب روایتی ترقی پسندی کا واسطہ بھی بنا، لیکن اس زمانے میں نسبتاً زیادہ نمایاں صورتیں ایک شدید ردّعمل کا اظہار کرتی ہیں۔ تقسیم کے بعد فسادات، ہجرت اور سیاسی ونظریاتی تصادمات اور تضادات کے پس منظر میں ایک ایسے ادبی تصور کو ابھرنے کا موقع ملا جو ادب اور ادیب کے سیاسی وسماجی رول کی نفی کرتا ہے اور ادب میں مقصدیت یا ادب کی سماجی افادیت سے متعلق تمام معروف ومروّج ایقانات پر ضربیں لگاتا ہے۔'' (4)

اردو کو آئین کے آٹھویں شیڈول میں ہندوستان کی قومی زبان تسلیم تو کرلیا گیا لیکن عملی طور پر اس آئین کی خلاف ورزی ہی کی گئی ہے اور اس پر عمل ٹھیک سے ہوا ہی نہیں۔ 1947 کے بعد اردوزبان وادب اورصحافت ایک قسم کے سیاسی تعصب کا شکار ہوگئی۔فرقہ پرست لوگوں نے اقلیتوں اور اردو کے خلاف جی بھر کے زہر اگلا اور فرقہ پرستی کی آگ بھڑکائی۔ اردوصحافت اور اردوادب کی خستہ حالی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اردو والوں نے خود ہی اسے اپنی زبان بنالیا اور جب پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا تو اس وقت بھی یہ دلیل دی گئی تھی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد نے یہ دعویٰ کیا کہ اردو ان کی زبان ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اردو مشترکہ تہذیب وتمدن اور گنگا جمنی تہذیب کی بدولت پیدا ہوئی اس پر کبھی کسی کا حق نہیں رہا اور اردوصحافت ہو یا ادب اس میں غیر مسلم حضرات نے بھی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ آزادی سے قبل جہاں اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان تھی اور اردو پر کبھی کسی نے اپنا دعویٰ نہیں پیش کیا تھا لیکن آزادی کے بعد کچھ غیر مسلموں نے ایک دم سے فرقہ پرستی کی عینک سے اسے دیکھنا شروع کردیا اور یہ زبان صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے دی گئی۔ جس سے اردو ادب اورصحافت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ ڈاکٹر صالح عبداللہ آزادی کے بعد کی اردو صحافت کی زبوں حالی پر کچھ یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ’’آزادی کے بعد اردوصحافت کی زبوں حالی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ یہ ادیبوں، دانشوروں اورمفکروں کی اس سرپرستی سے محروم ہوگئی جو آزادی کے پہلے اسے حاصل تھی۔ اسے اردو کا المیہ ہی کہا جائے گا کہ آزادی کے بعد بیشتر ادیبوں اورقلم کاروں نے اردوصحافت کو قابل اعتنا نہ سمجھ کر اسے پس پشت ڈال دیا اور گردوپیش کے کرب اور ہولناکی سے بے خبر ہو کرفکروخیال کے سنہرے جزیرے آباد کرنے میں لگ گئے جس کے نتیجے میں اردوادب کی سرگرمیاں اکادمیوں اور دانش گاہوں تک محدود ہوکر رہ گئیں جہاں ادب تفریح طبع کے ساتھ ساتھ دانش ورانہ رعب وجلال اور

نظریاتی وابستگی کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیشتر اردو ادیبوں کو بائیں بازو یا دائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کا چھتر سایہ مل گیا۔ نئی نئی اکادمیوں اور اداروں سے ان پر خوب انعامات کی بارش ہونے لگیں۔ دوسری طرف اردو صحافت تقسیم ملک کی تہمت اور سرمائے کی سرپرستی سے محروم ہوجانے کے باعث تذبذب اور بحران کا شکار ہوگئی۔''(5)

یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد ملک سے بڑی تعداد میں اخبارات ورسائل جاری ہوئے لیکن آج بھی اردو صحافت اپنا وہ مقام نہیں حاصل کرسکی جو آزادی سے قبل اسے حاصل تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ موجودہ دور اردو صحافت کا زریں دور ہے اور کئی اخبارات کی اشاعت ایک ہی ساتھ ملک کے مختلف شہروں سے ہورہی ہے اور اخباروں کا سرکولیشن بھی لاکھوں تک پہنچ گیا ہے۔ اردو صحافت جو آزادی کے بعد نہایت خراب صورتِ حال سے دوچار تھی اب کسی حد تک سنبھل چکی ہے۔ خاص طور سے اردو کی اخباری صحافت اب بہت بہتر حالت میں ہے اور اردو صحافت کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنے والے وقت میں اردو صحافت اور بھی ترقی کرے گی۔ اگر ہم اردو کی ادبی صحافت کی بات کریں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب کی نظریاتی تقسیم، اور سیاسی سماجی حالات نے رسائل کی صحافت کو کافی متاثر کیا، وسائل کی کمی ادیبوں اور صحافیوں کی نقل مکانی، قاریوں کی کمی جیسے مسائل اور مالی دشواریوں نے بھی ادبی صحافت پر کافی برے اثرات مرتب کیے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے اس بات کو بہتر انداز میں لکھا ہے:

''اردو کے ادبی رسالوں کا یہ بڑا المیہ رہا ہے کہ اسے اردو والوں کا بھرپور تعاون حاصل نہیں ہوسکا۔ حکومت نے بھی ادبی رسالوں کی مالی مشکلات پر توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے ادبی رسالے بہت جلد دم توڑ دیتے ہیں۔ اردو دانوں کا حال یہ ہے کہ ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہتی ہے کہ انھیں اعزازی طور پر ادبی رسائل ملتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی رسالوں کی تعداد اشاعت اتنی نہیں ہوپاتی کہ وہ زندہ رہ سکیں۔ اس عدم توجہ اور

غیر دلچسپی کا رونا آج بھی رویا جاتا ہے اور آزادی سے قبل بھی اور یہ شکوہ
دوسرے اور تیسرے درجے کے ادبی رسالوں کو ہی نہیں تھا بلکہ ادبی طور پر
جو صف اول کے رسالے تھے انھیں بھی تھا۔'' (6)

اردو ادب میں آزادی سے قبل جہاں ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا وہیں آزادی کے بعد جدیدیت کی تحریک اور بعد میں مابعد جدیدیت اور ساختیات و پس ساختیات کے نظریات و رجحانات در آئے۔ ہندوستان کا عام اردو داں قاری ان تحریکوں سے بہت حد تک نابلد تھا اور اسے اپنے معاشرے اور سماج کے مسائل اور اس کے اپنے کردار کے گرد گھومتا ادب ہی متاثر کرتا تھا۔ عام قاری کو وہی ادب متاثر کرسکتا ہے جس میں اس کی اپنی بات ہو جس میں اس کی اپنی داستان ہو۔ لیکن ادب میں مغرب سے مستعار لی گئی ایسی تحریکوں کے نتیجے میں اسے انگریزی اور فلسفے کی منطقی اور فلسفیانہ اصطلاحیں دی جانے لگیں جس سے عام قاری کا ذہن ادب کی اس گہرائی اور گیرائی سے گھبرا گیا اور ایسے ہی وقت میں اردو زبان کی ترقی کا نعرہ دیتے ہوئے ادب میں ایک نئے پاپولر ادب کی شروعات ہوئی۔ آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت کو اس پاپولر ادب نے کافی نقصان پہنچایا ہے لیکن دوسری طرف اردو زبان کی ترقی میں ہم اس ادب کی کوششوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ پاپولر ادب ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں مقبول ہے اور کسی حد تک اسے بھی ادب کا درجہ دے دیا گیا ہے لیکن ہندوستان میں اب بھی پاپولر ادب کو ایک گھٹیا اور نچلے درجے کا ادب تصور کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاپولر ادب کے زمرے میں جو ڈائجسٹ نکالے گئے وہ کہیں نہ کہیں خالص اردو ادب کا ہی ایک حصہ تھے۔ اردو کے نامور صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی کے ذریعے شروع کیا گیا 'ہما' اس کی بہترین مثال ہے جس نے اقبال صدی نمبر، اقبال نمبر، غالب نمبر، اردو نمبر، اردو تحریک نمبر، علی گڑھ نمبر، سرسید نمبر، بہادر شاہ ظفر جیسے بہترین اور اعلیٰ درجے کے خصوصی نمبر شائع کیے۔ اس کے علاوہ نکہت پبلی کیشنز کا جاسوسی دنیا، رومانی دنیا، سلامت علی مہدی کا محراب، اظہار اثر کا ماہنامہ اظہار اثر اور نازش انصاری کا ماہنامہ آتش گل بھی اسی زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ کہنے کو تو یہ ڈائجسٹ تھے

لیکن ان میں ہر مہینے اردو ادب کا بہترین انتخاب شائع کیا جاتا تھا۔ غزل اور افسانوں کے علاوہ شاعروں اور ادیبوں کے حالات زندگی اور ان کے انٹرویو بھی پیش کیے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب سماج میں اس طرح کے ادب کی شروعات ہوئی تو عام قاری کا اس طرف متوجہ ہونا لازمی تھا کیونکہ یہ خالص اردو ادب کی طرح ثقیل نہیں تھا اور عام قاری اس میں آسانی سے اپنا کردار ڈھونڈ سکتا تھا۔ ان سب باتوں نے اردو کی ادبی صحافت کو خاصا متاثر کیا۔ کلام حیدری اپنے رسالے ماہنامہ آہنگ کے دسمبر 1970 کے اداریے میں لکھتے ہیں:

> ''اردو کا ادبی ماہنامہ نکالنا اور نکالتے رہنا کٹھن کام ہے اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ مگر تفصیل میں جائیے تو اس کی صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے کہ ادبی رسائل کا بازار سرد ہے لوگ بد ذوق ہوگئے ہیں، اردو پڑھنے والے تعداد کے لحاظ سے کم ہوتے جارہے ہیں، اس لیے کہ اگر صرف یہی ایک وجہ ہوتی تو آج سے بیس پچیس سال قبل شائع ہونے والے اردو رسائل کی تعداد اشاعت ہزاروں ہوتی کیا زمانہ، نگار، ساقی، نیرنگ خیال، خیام، نظام جدید اردو، سہیل، ندیم، معاصر، چمنستان، تہذیب اوراس طرح کے دوسرے پرانے رسالوں کی تعداد اشاعت آج کے ادبی رسائل سے بہت زیادہ تھی؟ ان رسائل کے اوراق الٹیے تو لوگوں کی بدذوقی، قدردانی کی کمی وغیرہ کا رونا ان کے صفحات پر بھی ہے۔ اور آج کے رسائل کے مقابلے میں ان کی تعداد اشاعت کم ہی تھی، زیادہ نہ تھی، لیکن اس کے باوجود ان میں استقامت آج کے رسائل کے مقابلے میں زیادہ تھی اور ان کی مختصر زندگی بھی ایسی گزری کہ ان کی یاد اور اہمیت امٹ ہوگئی۔'' (7)

برصغیر کی تقسیم سے قبل اردو زبان وادب اور صحافت کا ایک واضح مقصد انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانا تھا اور اس وقت اردو ہی ملک کی اہم زبان تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے اخبارات ورسائل نکالنے والوں میں مسلمانوں اور غیر مسلم حضرات دونوں ہی پیش پیش تھے۔ اردو پر مسلمانوں کا ٹھپہ بھی نہیں لگا تھا۔ یہ زبان مشترکہ کلچر کی ترجمان تھی۔ اردو صحافت

اور ادب کے موضوعات دونوں قوموں کے مشترکہ مسائل و معاملات ہوتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد یہ سب باتیں پرانی ہوگئیں اور نئے مسائل اور نئی مشکلات نے جنم لیا اور اردو صحافت کے موضوعات بھی تبدیل ہوگئے۔ ملک کے سیاسی اور سماجی حالات نے اردو صحافت کو ایک نیا رنگ دے دیا۔ ملک کے حالات پر پروفیسر تاج انور رقم طراز ہیں:

''تصور پاکستان سے قبل اردو صحافت مذہبی انتہاپسندوں سے نبردآزما ضرور تھی جو عام سماجی یا مقامی مسئلوں کو مذہبی رنگ دے کر 'ہندو مسلم' 'اردو ہندی' یا مندر مسجد جیسے نعروں کا استعمال کر کے فضا کو مسموم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن اس صحافت کے پیر بہر حال جمے ہوئے تھے مگر تصور پاکستان کی وکالت نے اس کی ساری طنابیں ڈھیلی کر دیں۔فہم وفراست کو تہہ کر کے گو یا رکھ دیا گیا تھا اور جذبات کا الاؤ روشن ہوگیا۔نیتجتاً یہ ہوا کہ سیاسی جواریوں کے ساتھ ساتھ مذہبی انتہا پسندوں کی بھی بن آئی اور وحشت کا خونی رقص شروع ہوگیا۔

حصول آزادی کے بعد ہندوستان میں اردوصحافت بے حد نروس دکھائی دی، کیونکہ اس کا استحصال کرنے والے ہاتھ 'ہجرت' کر گئے تھے یا انھوں نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لی تھیں۔ انتہاپسندوں نے اردو کو بھی پاکستانی قرار دے دیا تھا۔سخت اضطراب اور کشمکش کا دور تھا جو قریبا ایک دہائی تک اردوصحافت کے سینہ پر مونگ دلتا رہا۔ دھیرے دھیرے اردوصحافت بھی مصلحت پسند بن گئی کیونکہ اب بغیر سرپرستی حاصل کیے وہ اپنی سانسوں کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔ اردوصحافت کا ایک بڑا حصہ اگر 1947 سے قبل تصور پاکستان کا وکیل نہ بنا ہوتا تو آزادی کے بعد وہ اعتماد کی دولت سے محروم نہ رہتا اور اسے سرپرست کی بیساکھی کے سہارے نہ گھسٹنا پڑتا۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ بیشتر سرپرست ایسے تھے جنھوں نے وفاداریاں تبدیل کیں تھی اور مقرب بارگاہ بنے رہنے کے لیے اردوصحافت کو استعمال

کرنے لگے۔ اس طرح آزادی کے بعد بھی اردو صحافت قیدیوں کی زندگی گزارتی رہی۔'' (8)

پروفیسر تاج انور کی یہ باتیں تھوڑی تلخ وترش ضرور ہیں لیکن ان جملوں میں جس طرح سے حقیقت پسندانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل توجہ اورقابل تعریف ہے۔ ان سطور میں اردوصحافت کی ناکامی کا دردوغم بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے بڑے ہی صاف اورسیدھے سادے انداز میں حقیقت بیانی کی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آزادی کے بعد اردو زبان وادب پر اس انداز میں دھیان نہیں دیا گیا جیسا آزادی سے قبل دیا جا تا تھا۔ آزادی کے بعد اردوصحافت کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی اردو اخبارات کا تو اور بھی برا حال ہوا اور بہت کم ایسے اخبارات تھے جو اعتدال پسندانہ یا غیر جانب دارانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے ورنہ زیادہ تر اخبارات کسی سیاسی پارٹی کے مرہون منت تھے اور اخبار کو بس اپنے فائدے کا ذریعہ سمجھتے تھے اور یہ حالت کسی حد تک آج بھی برقرار ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ صحافت کے اصول وضوابط کی پاسداری کرتے ہوئے اردوصحافت کے فروغ کی سچی اور جائز کوشش کی جائے۔ صرف مالی فائدے اور اشتہارات کو مقصد بنا کر اخبارات ورسائل نہ نکالے جائیں۔ اردو اخبارات کو جس طرح اشتہارات ملتے ہیں اور بہت سارے مالکان اخبار صرف اشتہارات کے لیے اخبارات نکال رہے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ ان اشتہارات سے اردو اخبارات کو کافی طاقت مل رہی ہے لیکن اخبارات کے ساتھ ساتھ اردو کے ادبی رسائل میں بھی اس طرح کے اشتہارات دیے جائیں تاکہ اردو رسائل کو بھی کچھ تقویت ملے۔ اردو صحافیوں کی ٹریننگ اوران کے معاوضوں پر بھی خصوصی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اگر ان سب باتوں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور عمل کیا جائے تو یقیناً اردوصحافت دنیا کی کسی بھی زبان کی صحافت کے سامنے فخر کے ساتھ کھڑی ہوسکے گی اور اس سے سب سے بڑا فائدہ اردو زبان وادب اورصحافت کا ہوگا۔

اردو کے اہم رسائل و جرائد (1947 سے 2000 تک)

آزادی کے بعد ایک افراتفری کا ماحول تھا اورایسے وقت میں تو حال یہ تھا کہ جورسائل نکل رہے تھے وہ بھی بے قاعدگی کا شکار ہوگئے۔ اردو کا سب سے اہم رسالہ آجکل بھی اس سے بچ نہ سکا اور اس کے بھی کئی شمارے منظر عام پر نہیں آسکے۔ آزادی کے بعد ماہنامہ ’آجکل‘ ایک نئے جوش وخروش کے ساتھ جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شروع ہوا۔

آجکل: آزادی کے بعد یوں تو ماہنامہ آجکل 10 جون 1947 سے ہی شروع ہوگیا تھا لیکن آزادی کے بعد ہی اس نے باقاعدہ ایک مجلّے کی شکل اختیار کی اور یہ ماہنامے کی صورت میں نکلنے لگا۔ آجکل کا گاندھی نمبر جو کہ مارچ 1948 میں شائع ہوا تھا اس میں عرش ملسیانی نے آجکل کے نئے دور کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا:

> ’’اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی حکومت ہند کے پبلیکیشنز ڈویژن کے شعبہ اردو میں مدیراعلیٰ کی حیثیت سے تشریف لے آئے ہیں۔ شعبہ اردو اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ راقم جگن ناتھ آزاد اور بلونت سنگھ آپ کے معاونین کی حیثیت سے کام کریں گے۔ شعبہ اردو کے زیراہتمام آجکل کے علاوہ دو رسالے ’بساط عالم‘ اور ’نونہال‘ بھی نکلیں گے۔
>
> چند مجبوریوں کی وجہ سے آجکل کی اشاعت قریب قریب ملتوی رہی اس لیے ہم ناظرین سے معذرت کے خواستگار ہیں۔ آجکل کا نیا دور اب ماہ اگست 1948 سے شروع ہوگا اور اس دور کا پہلا پرچہ 15اگست تک شائع ہوجائے گا۔ پہلے مہینے میں دوبار شائع ہوتا تھا اب اسے ماہنامہ کردیا گیا ہے امید ہے کہ آجکل اپنے نئے دور میں اپنی سابقہ روایات کو برقرار ہی نہیں رکھے گا بلکہ صوری اور معنوی لحاظ سے ترقی کی طرف گامزن ہوگا۔ حسب سابق اس میں تصاویر ہوں گی۔ عصر حاضر کے تقاضوں کے اعتبار

سے معیاری ادب کے نمونے بھی، ہندوستان کی آزادی اور بہبود سے متعلق مقالے بھی۔ الغرض اس کے حسن ظاہر اور حسن باطن میں ہر ممکن اضافے کی کوشش کی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ مضمون نگار حضرات اور احباب جو اس رسالے پر کرم فرماتے رہے ہیں اپنے سلسلہ کرم کو جاری رکھیں گے اور اپنی اولیں فرصت میں اپنے نظم ونثر کے شاہکار عنایت فرما کر آجکل کی قدر و قیمت میں اضافے فرمائیں گے:

مشاط را بگو کہ بر اسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا برتاریک (9)

اسی سال یعنی 1948 سے ہی آجکل کے ساتھ ساتھ دو نئے رسالوں کا آغاز ہوا۔ ماہنامہ بساط عالم 15 جولائی 1948 سے شروع ہوا جبکہ بچوں کے لیے نونہال کی شروعات 15 اگست 1948 سے ہوئی۔ ڈاکٹر جمیل اختر لکھتے ہیں:

''رسالہ 'نونہال' چونکہ بچوں کے لیے تھا اس لیے اس میں بچوں کے معیار کے مطابق کہانیاں، نظمیں، پہیلیاں، ڈرامے، خبریں، تصویریں اور مختلف مسائل پر دلچسپ مضامین شائع ہوئے تھے۔ 'بساط عالم' کا مقصد عوام کو صحیح اور سنجیدہ انداز میں غیر ملکی سیاست اور اس کے مختلف پہلوؤں سے آشنا کرانا تھا۔ ان میں بین الاقوامی سیاست اور تہذیب وتمدن سے متعلق مضامین ہوتے تھے۔ افسوس کہ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا اور 1949 میں حکومت نے موخر الذکر رسالے بند کردیے۔ بچوں کی ضرورت کے لیے مارچ 1950 سے آجکل کے آخر میں آٹھ صفحوں پر مشتمل 'بچوں کا آجکل' شائع ہونے لگا۔ یہ سلسلہ اکتوبر 1965 تک جاری رہا اور پھر اس بنا پر بند کردیا گیا کہ بچے اس رسالے کے خریدار کیسے بن سکتے ہیں جو زیادہ تر بڑوں کے لیے ہو۔'' (10)

اگست 1948 سے جوش ملیح آبادی نے ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔

سرورق پر ادب وثقافت کا حال مصور ماہنامہ آجکل لکھا جانے لگا

مدیر: جوش ملیح آبادی

نائب مدیر: عرش ملسیانی ،جگن ناتھ آزاد، بلونت سنگھ

اس وقت اس مجلّے کی قیمت فی پرچہ 8 آنے تھے جبکہ سالانہ چندہ 6 روپے تھا۔

جوش ملیح آبادی نے آجکل کی ادارت سنبھالنے کے بعد ادب اورصحافت کو ایک نیارخ عطا کیا اور یہ سرکاری ماہنامہ ہوتے ہوئے بھی پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ مقبول ہوگیا۔ جوش کو اردو رسائل کی پریشانیوں اور اردو کی ادبی صحافت کی بے بسی و بے کسی کا کافی بہتر تجربہ تھا اس لیے انھوں نے آجکل کو بہتر سے بہتر بنانے کی پوری کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ انھوں نے اپنی ادارت میں کئی اہم اور خاص نمبر بھی نکالے اورآجکل کو مشترکہ تہذیب اور کلچر کا ترجمان بنایا۔اس میں ادب کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، جدید ٹکنالوجی، سائنس،فن، آرٹ، موسیقی وغیرہ موضوعات پر بھی کافی نگارشات شائع ہوئی۔ جس سے اردو ادب کے خزانے میں اور بھی ترقی ہوئی۔ جوش نے آجکل کا مدیر بننے کے بعد اگست 1948 کے اداریے میں بڑے صاف اورسنجیدہ لہجے میں کچھ اس طرح سے اداریہ تحریر کیا تھا۔

معیاری جریدہ

یادش بخیر 1935 یا 1936 میں دہلی سے جب میں نے کلیم جاری کیا تھا کتنا بلند حوصلہ تھا دل میں اور کتنا زبردست سودا تھا سر میں۔ کلیم کو آسمان صحافت کا آفتاب بنادوں گا۔ اس کا اتنا بلند معیار ہوگا کہ ایشیا اور یورپ دونوں میں اس کی نظیرنہیں مل سکے گی۔لیکن چند ہی مہینے گزرنے پائے تھے کہ حوصلے سرنگوں ہوگئے۔ اول اول تو صرف درجہ اول ہی کے مقالے شائع کیے گئے۔ پھردرجہ دوم کے مقالے بھی باریاب ہونے لگے اورآخر میں دوم سوم کے مضامین بھی چھپنے لگے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ کیوں ہوا؟ بڑی تلخ داستان ہے یہاں لکھے پڑھے ہی ماشاء اللہ کتنے ہیں

اور جو لکھے پڑھے ہیں ان کا مبلغ علم ذوق ادب کیا ہے۔ اور جو دو چار معیاری لکھنے والے ہیں وہ عزت وآسودگی کی زندگی سے کس قدر ہولناک فاصلے پر عمر کی تلخ گھڑیاں گزار رہے ہیں۔ شرم آتی ہے ان باتوں کے بیان کرنے سے اس لیے اگر میں آجکل کے باب میں بڑی بڑی امیدیں نہ دلاؤں اور بلند آہنگی کے ساتھ بڑے بڑے دعوے نہ کروں تو معذور سمجھ کر مجھے معاف فرمایا جائے۔ ہرچند کہ جہاں تک انسانی مساعی کا تعلق ہے ہر ممکن سعی کی جائے گی کہ معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے آجکل کم سے کم ہندوستان کا بہترین جریدہ ثابت ہو۔ لیکن مندرجہ بالا چند سطریں بہ ثبات عقل وہوش اس لیے لکھ دی ہیں کہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آوے۔

راقم جوش

گواہان، عرش، آزاد، بلونت سنگھ

مورخہ 15 جولائی 1948

بمقام دہلی، تحصیل و پرگنہ، دہلی (11)

آزادی سے قبل جوش ملیح آبادی اردو صحافت خاص طور سے اردو کی ادبی صحافت سے جڑے رہے اس لیے انھیں اس راہ کی تمام دشواریوں کا احساس تھا اور انھوں نے صاف صاف اور کھلے لفظوں میں لکھ دیا تھا کہ ایسے حالات اور اردو کے خلاف ہو رہی سازشوں کے درمیان اردو کا رسالہ جاری رکھ پانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

جوش ملیح آبادی نے آجکل کی ذمے داری اگست 1948 سے 1955 تک سنبھالی۔ اس کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد عرش ملسیانی آجکل کے مدیر بنے۔

عرش ملسیانی اپنے مضمون ’آجکل کے 28 برس‘ میں لکھتے ہیں جو آجکل کے جون 1970 کے شمارے میں چھپا تھا:

’’جوش صاحب کی قیادت کافی تھی۔ ان کی مسلسل صحبت دل ودماغ کی کم

مائیگی دور کردیتی تھی......

جوش صاحب کے جانے کے بعد قرعۂ فال مجھ دیوانے پر پڑا۔ بوجھ اور ذمے داری تو پہلے بھی گلے کا ہارتھی لیکن مخالفانہ اور معاندانہ وار کے لیے جوش صاحب ایک مضبوط ڈھال تھے۔اب یہ ذمہ داری میرے کندھوں کا بوجھ بن گئی۔''(12)

عرش ملسیانی 1955 سے لے کر 1967 تک آجکل کے مدیر رہے۔ اکتوبر 1967 میں شہباز حسین آجکل کے مدیر بنے۔اس وقت معاون مدیر راج نرائن راز اور نند کشور وکرم تھے۔ اپریل 1972 تک شہباز حسین نے ادارت کی ذمے داری سنبھالی ان کے بعد مئی 1972 سے مہدی عباس حسینی نے ادارت کا کام اپنے سر لے لیا۔ اپریل 1976 میں شہباز حسین کو دوبارہ آجکل کاایڈیٹر بنایا گیا۔ انھوں نے اپنے دوسرے دور میں 1981 تک آجکل کے ذریعے اردوادب وصحافت کی خدمت کی۔ اپریل 1981 سے راج نرائن راز نے مدیر کا عہدہ سنبھالا۔ راج نرائن راز نومبر 1989 تک اس کے مدیر رہے۔ دسمبر 1989 سے جون 1990 تک انھوں نے مہمان مدیر اوراعزازی ایڈیٹر کی ذمے داریاں اٹھائیں۔

اگست 1990 میں محبوب الرحمٰن فاروقی آجکل کے مدیر بنے۔ آجکل کے اگست 1990 کے شمارے سے رسالے کی قیمت میں بھی اضافہ کیا گیا اور رسالے کی ترتیب اور گیٹ اپ وغیرہ میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔محبوب الرحمٰن فاروقی کے بعد عابد کرہانی نے ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی، جولائی 1992 سے جولائی 1993 تک وہ ایڈیٹر رہے۔

ان کے بعد محبوب الرحمٰن فاروقی اگست 1993 سے دوبارہ مدیر مقرر ہوئے۔ان کے بعد ابرار رحمانی بنے اور ان کے بعد خورشید اکرم نے آجکل کی ذمے داری سنبھالی۔ بعد میں ابرار رحمانی کو دوبارہ آجکل کا مدیر بنایا گیا۔

کبھی کبھی آجکل کا شمارہ کسی مدیر کے نام کے بغیر شائع ہوا ہے۔ جیسے جولائی 1990 کا شمارہ صرف معاون مدیر خورشید اکرم کے نام سے شائع ہوا۔ اگست 2004 کے شمارے میں بھی مدیر کا نام نہیں دیا گیا ہے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر عابد کرہانی کے نام سے شمارہ شائع

کیا گیا تھا۔ عرض ناشر کے عنوان سے اداریہ شائع ہوا تھا جسے ڈائرکٹر، پروفیسراوما کانت مشرا نے تحریر کیا ہے۔

آجکل نے ادبی صحافت میں اس لحاظ سے بھی اپنی ایک منفرد پہچان قائم کی ہے کہ اس رسالے نے اردو ادب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی کافی ضخیم اورخاص نمبرشائع کیے ہیں۔ خاص نمبر کا آغاز گاندھی جی کی شہادت کے بعد گاندھی نمبر اگست 1948 میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد شائع ہونے والے اہم نمبر اس طرح ہیں۔ فروری 1950 میں جمہوریت نمبر، فروری 1952 میں غالب نمبر، مارچ 1952 میں افسانہ نمبر، اگست 1953 میں شعروشاعری نمبر، مارچ 1954 میں خطوط نمبر، اگست 1955 میں کشمیر نمبر، اگست 1956 میں ہندوستانی موسیقی نمبر، نومبر 1956 میں گوتم بدھ نمبر، اگست 1957 میں جنگ آزادی نمبر،اگست 1958 میں مولانا آزاد نمبر، جنوری،1959 میں ڈرامہ نمبر، اگست 1959 میں رقص نمبر، اگست 1960 میں ہندوستانی مصوری نمبر، نومبر 1960 میں نظم نمبر، جنوری 1961 میں جگر نمبر، مئی 1961 میں رابندر ناتھ ٹیگور نمبر، اگست 1962 میں فن تعمیر نمبر، اگست 1963 اور 1964 میں افسانہ نمبر، نومبر 1964 میں جواہر لعل نہرو نمبر، اگست 1965 میں دستکاری نمبر، اگست 1966 میں ڈرامہ نمبر،اگست 1967 میں تحقیق نمبر، اگست 1968 میں اردو نمبر، جنوری 1969 میں بین الاقوامی اطفال برس نمبر، جون 1969 میں ذاکر حسین نمبر، نومبر 1969 میں گرونانک نمبر، فروری 1969 میں غالب نمبر،اکتوبر 1969 میں مہاتما گاندھی نمبر، جون 1970 میں سلور جوبلی نمبر،دسمبر 1970 میں اردو طباعت واشاعت نمبر، فروری 1971 میں غالب نمبر، اگست ستمبر 1971 فلم نمبر، اگست 1972 میں آزادی کا جشن سیمیں نمبر،فروری 1973 میں غالب نمبر،جولائی 1973 میں سیروسیاحت نمبر، اگست 1973 میں اردو نمبر، اکتوبر 1973 میں اردو نمبر (ضمیمہ) جون 1974 میں تاراچند نمبر، نومبر 1974 میں امیر خسرو نمبر، جنوری 1975 میں لوک گیت نمبر، جون 1975 میں میرانیس نمبر، اگست رستمبر 1975 میں خواتین نمبر، فروری 1977 میں خواجہ حسن نظامی نمبر، جون جولائی 1977 میں تمل ناڈو نمبر، نومبر 1977 اقبال نمبر،اکتوبر رنومبر 1978 میں جنگلی جانور نمبر، دسمبر 1978

میں مولانا محمد علی جوہر نمبر، اگست 1980 میں پریم چند نمبر، جنوری 1981 میں ڈاکٹر انصاری نمبر، نومبر 1981 میں سہیل عظیم آبادی نمبر، اگست 1982 میں جمیل مظہری نمبر، فروری 1983 میں چکبست نمبر، نومبر ردسمبر 1983 میں صحافت نمبر، مارچ اپریل 1984 میں میر انیس نمبر، دسمبر 1984 میں صحافت نمبر، جنوری 1985 میں صحافت نمبر، (ضمیمہ) جنوری 1988 میں جدید ہندی کہانی نمبر، مئی 1988 میں اگیئے نمبر، جولائی 1988 میں پنجابی کہانی نمبر، دسمبر 1988 میں خواجہ احمد عباس نمبر، جون 1989 میں سندھی ادب نمبر، جنوری 1992 میں عصمت چغتائی پر خصوصی گوشہ، اپریل 1992 میں گولڈن جوبلی نمبر، فروری1994 میں اختر الایمان نمبر، مئی 1994 میں ڈراما نمبر، اگست 1994 میں معین احسن جذبی نمبر، جنوری 1995 میں بلونت سنگھ نمبر، اپریل 1995 میں جوش ملیح آبادی نمبر، دسمبر 1995 میں رابندرناتھ اشک نمبر، جنوری 1998 میں خلیل الرحمٰن اعظمی پر خصوصی گوشہ، اوراکتوبر 2000 میں علی سردار جعفری کا گوشہ شائع کیا گیا۔

رسالہ آجکل کی عمر 2009 میں 67 سال ہوچکی ہے اور یہ رسالہ آغاز سے ہی اردو زبان وادب کی خدمت میں اہم کردار ادا کرتا رہاہے۔ یہ رسالہ ادبی صحافت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آجکل کی ابتدا حکومت کی جانب سے سرکاری اسکیموں اور پالیسیوں کو عام کرنے کے مقصد سے کی گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت کرنا بھی تھا۔ آجکل میں علم وادب، شعر وشاعری، ڈراما،موسیقی اور تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اور یہ سب آجکل کی ادبی شناخت قائم کرنے میں کافی مددگار ومعاون ثابت ہوئے۔

آجکل کے مارچ1957 کے شمارے میں آجکل کے تعلق سے مختلف ادبا وشعرا کی آرا کو شامل اشاعت کیا گیا تھا۔ اسے یہاں دینا بے جا نہ ہوگا۔

<u>رسالہ آجکل اردو ادب کے معماروں کی نظر میں</u>

■ رسالہ آجکل اردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ

بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پراز معلومات ہوتے ہیں۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگان علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔(فراق گورکھپوری)

- رسالہ آجکل حسن ظاہر اور حسن باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکتہ الآرا ادبی مباحث زینت اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔(جوش ملسیانی)
- آجکل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔آجکل میں یہ گن پایا جاتا ہے۔ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔(اختر اورینوی)
- میں رسالہ آجکل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے اس کو اردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے۔ جنھوں نے اس کو مفید اور جاذب نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔

(خواجہ احمد فاروقی)(13)

آجکل اردو کا ایسا واحد رسالہ ہے جس نے ایسے ایسے موضوعات پر خصوصی نمبر شائع کیے ہیں جن پر ایک مضمون بھی مشکل سے ملتا ہے۔ ان کے علاوہ آجکل میں اطلاعاتی ٹکنالوجی،نئی ایجادات، سائنس اور مغربی ادب سے متعلق چیزیں بھی شامل اشاعت ہوئی ہیں۔ ایک بڑی اہم اور خاص بات یہ ہے کہ آجکل کے صفحات میں ہمیشہ سے نادر تصاویر کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔ ان میں سیاست، سائنس، ادب، اور مختلف شعبہ ہائے زندگی

سے جڑے اشخاص اورمقامات شامل ہیں۔معروف افسانہ نگار جوگندر پال آجکل کے بارے میں رسالے کی 62 ویں سالگرہ پر کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

یوں تو آجکل کے مدیران میں جوش ملیح آبادی، جگن ناتھ آزاد اور بلونت سنگھ جیسی معزز اورنامور ہستیاں شامل رہی ہیں۔لیکن آجکل کی قدروقیمت کاانحصار دراصل ایسے معیار پر ہے جو اس کا ادارہ سالہا سال خود آپ ہی اپنے لیے متعین کرتا چلا گیا۔ اچھے اداروں کا یہی خاصہ ہے کہ ان کے منتظمین، کوئی بھی چھوٹے یا بڑے منتظمین کو عین اپنے اداروں کے معیار کا بنے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔اس اعتبار سے غنیمت ہے کہ آجکل بھی اپنے ہی وضع کردہ معیارات سے برآمد ہوکر اونچا ہوتا رہا۔پچھلی صدی کے خاتمے پر تو ایک پوری آجکل سیریز میں تخلیقی وتنقیدی ہر دو اصناف کے کئی کتابی انتخابات پیش کیے گئے اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے...

آجکل میرے لیے کوئی شے نہیں ایک زندگی ہے۔مجھے اپنے اس چہیتے رسالے کو اس قدر دھوم دھام سے اپنی باسٹھ سالہ زندگی میں داخل ہونے پر دلی مبارکباد پیش کرنا ہے۔اس یقین کے ساتھ کہ آج سے باسٹھ سال بعد بھی میری طرح کوئی بوڑھا اس سواسو سال کے جوان کو اپنی گرمجوش مبارکباد پیش کرنے کا متمنی ہوگا۔''(14)

میں نے جوگندر پال سے ملاقات کی تھی اور ان سے موجودہ اردوصحافت کو درپیش مسائل اور ان کے ادبی سفر پرکافی تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔جس میں انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ آزادی کے بعد یوں تو بڑی تعداد میں رسائل نکلنا شروع ہوئے لیکن کچھ رسائل نے صحافت اورادب کو ایک اچھی سمت اور رفتار دینے میں اہم رول ادا کیا ہے ان میں رسالہ آجکل سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔آجکل نے شروع سے ہی اردو ادب اورصحافت کی بہتر خدمت کی ہے اورآج بھی کررہاہے انھوں نے ادب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ادب آج ایک متوازی زندگی بن گیا ہے اور ہم زندگی سے الگ نہیں ہوسکتے، اس طرح

ادب سے ہمیں رشتہ بنا کر رکھنا ہی ہوگا کیونکہ ادب ہم سے الگ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہمارے آپ کے ساتھ گزرنے والے واقعات اور ہماری زندگی کا آئینہ ہے۔ انھوں نے تحریکوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کچھ تحریکوں سے ادب کو زیادہ فعالیت حاصل ہوئی ہے۔ تعلیم اورادب کے میدان میں ان تحریکوں سے فائدہ پہنچا ہے اور لوگ ادب کی جانب سنجیدگی سے متوجہ ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد جو حالات خراب ہوئے اور بتدریج اردو کو قتل کیا گیا اور اسکولوں سے ایک سازش کے ساتھ اسے ختم کیا گیا اور ساتھ میں انعامات اورایوارڈ دے کر خوش کرتے رہے جس سے اردو زبان کا کافی نقصان ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان ہندی سے کہیں آگے جا چکی تھی لیکن اس زبان کی اسکرپٹ کو جس طرح سے ختم کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں وہ نہایت تشویش کی بات ہے اور اس سمت میں کافی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

رسالہ نوائے ادب: یہ رسالہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کا ترجمان تھا اور سہ ماہی رسالہ تھا۔ اس کی شروعات جنوری 1950 میں ہوئی تھی۔ اس کے مدیر ظہیر الدین مدنی تھے۔ اس کی قیمت فی پرچہ ایک روپیہ، سالانہ تین روپے اورششماہی دو روپے تھی۔ پہلے شمارے میں عرض حال کے تحت مدیر لکھتے ہیں:

> ''وہ کیسی نیک ساعت ہوگی جب 1857 میں انجمن اسلام بمبئی کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور صوبہ کی آبادی کی ایک کثیر تعداد کی تعلیم کا ذمہ اس کے کار پردازوں نے اپنے سرلیا۔ صوبہ بمبئی میں یہ انجمن سرسید کی پکار کی بازگشت تھی۔ لیکن یہ بات قابل دادنہیں کہ اس نے اپنی عمر کے 75 سال کامیابی کے ساتھ ختم کر لیے اور اب اس کا عہد شباب آیا ہے۔ اس کی جوانی کا جوش اس کے نکھار سے عیاں ہے۔ گزشتہ 75 سال میں کئی کار پرداز آئے ہوں گے کئی بار اختلاف رائے ہوا ہوگا لیکن اس کے نصب العین میں فرق نہ آیا۔'' (15)

رسالہ نوائے ادب کے اداریے 'عرض حال' میں مدیر ظہیر الدین مدنی نے کافی تفصیل سے انجمن اسلام کے حالات اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے نوائے ادب

کے مقاصد اور اس کی ضرورت کے تعلق سے لکھا ہے:

''انسٹی ٹیوٹ کی ایک اور قابل قدر کارگزاری رسالے کا اجرا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ میں جو کچھ کام ہوتا ہے اسے برسرعام لانے کے لیے رسالے کی اشاعت بہت ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسٹی ٹیوٹ نے حالات ناساز گار ہونے کے باوجود رسالے کا اجرا کردیا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ علمی دنیا سے انسٹی ٹیوٹ کا رشتہ اور زیادہ مستحکم ہوجائے گا اور زبان وادب کے ماہر ناقد اور محقق رسالہ نوائے ادب کے اجرا کا خیر مقدم کریں گے اور قلمی اعانت میں دریغ نہ کریں گے۔ نوائے ادب کا یہ پہلا شمارہ آپ کے سامنے پیش ہورہا ہے۔ اس میں کئی خامیاں ہوں گی لیکن آئندہ امید ہے کہ ہم تمام خامیوں کو دور کرنے کی حتی الوسع کوشش کریں گے اور اس کے معیار کو بلند کیا جائے گا۔'' (16)

اس پہلے شمارے کے آخر میں یہ اعلان بھی درج تھا:

(1) یہ خالص علمی وادبی رسالہ ہوگا۔

(2) اس میں اردو زبان وادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(3) اس رسالے میں گجرات اور دکن سے متعلق اردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں انھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(4) اردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعے برسرعام لایا جائے گا۔

(5) رسالے کا حجم کم سے کم 96 صفحات ہوگا۔

(6) رسالہ ہرسال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔ (17)

نوائے ادب یوں تو انجمن اسلام کا ترجمان تھا لیکن اس میں کافی معلومات اور خاص طور سے طلبا کے لیے مفید مضامین شائع ہوتے تھے۔ نوائے ادب کی امتیازی خوبی اس میں شائع ہونے والا 'مقالہ نما' تھا۔ اسے اردو حلقے میں کافی پسند کیا گیا۔ اور اسے شروع کرنے پر اردو کے قارئین نے نوائے ادب کی اس کوشش کو کافی عزت وتحسین کی نظر سے دیکھا۔

مقالہ نما کو باقر علی ترمذی مرتب کرتے تھے اور معاونین عالی جعفر اور عصمت جاوید تھے۔ اس کے تحت مقالات کی توضیحی فہرست، اشاریہ، مختلف موضوعات، علمی وادبی شخصیت، کتابیں، تاریخ وسیاست، جغرافیہ، تذکرہ وسیرت نگاری، لسانیات وادب وتنقید، آرٹ (علوم وفنون) اقتصادیات، غرض کہ سبھی موضوع کے تحت مضامین، تبصرے شائع کیے جاتے تھے۔

نوائے ادب کو بعد میں ششماہی کر دیا گیا تھا۔ نوائے ادب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک سال کے پہلے شمارے میں گزشتہ سال کے تمام مقالوں کی تفصیل دی جاتی تھی اور کبھی کبھی تو دس برسوں کے تمام مقالات کی تفصیلات شائع کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو جنوری 1961 کا شمارہ اس میں 1950 سے 1959 تک کے تمام مقالات کی تفصیلات درج ہیں۔

دیگر اہم مجلّے

کریسنٹ: یہ سورت سٹی مسلم اسٹوڈنٹس یونین سورت، گجرات کا ترجمان تھا۔ یہ کافی ضخیم ہوتا تھا اور اردو، انگریزی اور گجراتی تین زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں علمی وتحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ خصوصی طور سے طلبا کی پسند اور ان کی ضرورت کو دھیان میں رکھا جاتا تھا۔

شعلہ وشبنم: یہ ماہنامہ تھا اور دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ تقریبا 64 صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ ترقی پسند ادب کا علم بردار تھا لیکن ترقی پسندی کے علاوہ دوسرے علمی وادبی مضامین بھی اس رسالے کی زینت بنتے تھے۔ اس کے علاوہ فلمی مضامین بھی چھپتے تھے۔ سوال وجواب پر مشتمل کالم سوالنامہ، بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ اس میں فلم وادب عشق ورومان سے متعلق سوالات اور ان کے دلچسپ جوابات شائع کیے جاتے تھے۔ اس رسالے پر کافی تنقید بھی ہوتی تھی کہ یہ رسالہ ادبی ہوتے ہوئے بھی غیر ادبی مواد سے بھرا ہوا ہے۔ لوگوں کا اعتراض تھا کہ اس میں فلمی مضامین نہ شائع ہوں۔

کاروان ادب: بزم ادب اردو سینٹ زیورس کالج بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اور سینٹ زیورس کالج کا ترجمان تھا۔ جریدے میں کالج کے حالات اور رپورٹیں، مختلف خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ ادبی سماجی، سیاسی، موضوعات پر بھی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔

رسالہ اردو ادب: انجمن ترقی اردو ہند کے رسالہ اردو ادب کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند کے پس منظر پر روشنی ڈالی جائے تب ہی رسالہ اردو اور بعد میں رسالہ اردوادب کے اغراض ومقاصد کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

انجمن ترقی اردو ہند کا قیام 4 جنوری 1903 کو ہوا تھا۔ جبکہ اس کے کاموں کا باقاعدہ آغاز 18اپریل 1903 سے ہوا۔ انجمن ترقی اردو ہند کو اردو زبان کی اصلاح، اردو کا فروغ، قدیم نظم ونثر کے ذخیروں کی حفاظت، ادبی کتابوں کی اشاعت، اہم کتابوں کے تراجم جیسے مقاصد کو سامنے رکھ کر قائم کیا گیا تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند کے قیام کے وقت اس کے صدر پروفیسر سرٹاس واکر آرنلڈ تھے جبکہ نائب صدور، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور الطاف حسین حالی تھے اورسکریٹری مولانا شبلی نعمانی تھے۔ ان کے علاوہ مختلف اوقات میں انجمن سے علامہ اقبال، عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی، شادعظیم آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی وحیدالدین سلیم، مولوی محمد اسحٰق علی علوی، سید احمد دہلوی، عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر تاراچند، عبدالماجد دریابادی وغیرہ منسلک رہے تھے۔

مولوی عبدالحق انجمن سے 1912میں وابستہ ہوئے تھے۔ مولوی عبدالحق کی پیدائش 20اگست 1870 کو ہوئی اوروفات 16اگست 1961 کو ہوئی تھی۔ 1912 میں مولوی عبدالحق کو انجمن کا سکریٹری بنایا گیا۔ جب مولوی عبد الحق نے انجمن کا بار سنبھالا تو انجمن کا کوئی سرمایہ نہیں تھا اورانجمن کی حالت نہایت خستہ تھی۔ مولوی عبدالحق اس وقت اورنگ آباد میں رہائش پذیر تھے اس لیے انھوں نے انجمن کا دفتر بھی اورنگ آباد منتقل کرلیا سکریٹری بننے کے بعد انھوں نے انجمن کی ترقی کے لیے سارا زور صرف کردیا اوراس کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اس وقت شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کی مدد لی۔ خاص طور سے رسالہ الناصر لکھنؤ نے انجمن کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس رسالے

میں انجمن کے جلسوں، انجمن کی خبروں اورانجمن کی حمایت میں کافی مضامین شائع ہوئے تھے۔ انجمن کی حالت جب کچھ بہتر ہوگئی تو مولوی عبدالحق نے انجمن کا رسالہ اردو جنوری 1921 میں شروع کیا۔

1947 تک یہ رسالہ اردو کے نام سے ہی نکلتا رہا۔ 1947 کے بعد جب انجمن ترقی اردو پاکستان کا قیام ہوگیاتو ہندوستان میں بھی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> تقسیم ہند کے بعد جو ہولناک واقعات پیش آئے۔ ان کا اثر تہذیبی اور علمی اداروں پر بھی پڑا۔ دہلی میں جب قیامت صغریٰ قائم ہوئی تو انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر مولانا ابوالکلام آزاد آخر وقت میں کتب خانے کی حفاظت کے لیےفوجی انتظام نہ کرتے تو شاید یہ قیمتی خزانہ بالکل برباد ہوجاتا، پھر بھی فوجی گارڈ کے آنے سے پہلے سکریٹری کا سامان اوردفتر اور کتب خانے کا ایک حصہ ضائع ہو چکا تھا۔ جب یہ طے ہوا کہ موجودہ حالات میں انجمن ترقی اردو ہند کا کام ہندوستان اور پاکستان میں بالکل علیحدہ آزاد اور خودمختار حیثیت سے ہوگا۔ تو علی گڑھ میں اس کا صدردفتر قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کے صدر اور قاضی عبدالغفار اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ مجلس نظما کی نئے سرے سے تشکیل ہوئی۔ انجمن کا نیا دستور وضع ہوا اور یکم مئی1950 کے جلسے میں متفقہ طور پر منظور ہوا۔ انجمن کا پندرہ روزہ اخبار ہماری زبان جنوری 1950 سے نکل رہا ہے اوراب جولائی 1950 سے اس کا سہ ماہی ادبی رسالہ اردو ادب شائع کیا جارہا ہے۔ (18)

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے رسالہ اردو ادب کے پہلے شمارے کے مطابق اس رسالے کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے:

1. انجمن ترقی اردو ہند کا یہ سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اوراکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔

2. یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان وادب کے ہر پہلو پر بحث ہوتی ہے حجم کم از کم ڈیڑھ سوصفحات ہوتا ہے۔
3. قیمت سالانہ دس روپے۔ فی پرچہ ڈھائی روپیہ۔
4. مضامین کے متعلق آل احمد سرور صاحب ریڈر شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، 7، بیروو روڈ لکھنؤ سے خط وکتابت کی جائے۔ اور خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق مہتمم انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کو لکھنا چاہیے۔

آزاد ہندوستان کے پہلے'' اردو ادب'' کے ایڈیٹر آل احمد سرور تھے اور اسے انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ شمارہ 152 صفحات پر مشتمل تھا۔

حرف آغاز کے عنوان سے اداریہ تھا جسے آل احمد سرور نے تحریر کیا تھا۔(19) اس کے علاوہ 9 مضامین تھے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

صرف آغاز	ایڈیٹر	5
توازن زندگی اور ادب میں	آل احمد سرور	9
سودا کا ایک قصیدہ	امتیاز علی عرشی	23
حیدرآباد پچاس سال پہلے (ایک روز نامچہ)	مولوی محبّ حسین مرحوم	33
رامائن اور عربی فارسی لفظ	محمد مصطفیٰ خان مداح	50
اندرسبھا (امانت)	محمد حسن، ایم اے	60
غالب کا تفکر اور اس کا پس منظر	سید احتشام حسین	67
مولوی نذیر احمد کے تمثیلی افسانے	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	91
کنڑی ادب	سید شاہ علی	116
اہم مسئلے (اردو میں تصرف کا عمل)	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	126
تبصرے	ایڈیٹر و دیگر حضرات	131

یہ رسالہ اردو ادب، اردو زبان و ادب اور اس میں تحقیق و تنقید کے فروغ کے لیے وقف تھا۔ رسالے نے اردو زبان کی تعلیم وترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو ادب

آزادی کے بعد سے لگاتار شائع ہورہا ہے۔کبھی کبھی اس کی اشاعت کچھ وقتوں کے لیے موقوف ہوئی ہے جیسا کہ جنوری 1961 کے شمارے میں اس اعلان سے پتہ چلتا ہے۔

شذرات

اردو ادب کی اشاعت ادھر کئی سال بے قاعدہ رہی۔آزاد نمبر کی تیاری اور طباعت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ اس کے بعد عام نمبروں کی اشاعت پر بھی اثر پڑا۔ زیرنظر شمارہ 1961 کا پہلا شمارہ ہے تھوڑے وقفے سے اس سال تین اور شمارے شائع ہوں گے اب طباعت کا بہتر انتظام ہوگیا ہے اور قوی امید ہے کہ جولائی، اکتوبر اور دسمبر میں اس سال کے باقی نمبر بھی شائع ہوجائیں گے۔(20)

رسالہ اردو ادب اپنے آغاز کے وقت سے ہی اردو زبان وادب میں کافی اہمیت کا حامل بن گیا تھا۔ اپنے ہم عصر جریدوں میں کافی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''جنوری 1950 سے انجمن کا پندرہ روزہ اخبار ہماری زبان شائع ہورہا ہے اور جولائی سے انجمن نے رسالہ اردو کا بدل رسالہ اردو ادب شائع کرکے اردو صحافت میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ فاضل ایڈیٹر جناب آل احمد سرور نے اپنے حرف آغاز میں رسالہ اردو ادب کے مستقبل سے متعلق جو اشارے کیے ہیں انھیں دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی ہیں۔'' (21)

رسالہ اردو ادب اپنے خاص نمبروں کے لیے بھی کافی مقبول رہا ہے۔ اردو ادب کا 1951 میں حسرت موہانی نمبر شائع ہوا تھا۔ اس نمبر کو معروف تنقید نگار اور رسالے کے مدیر آل احمد سرور نے ہی مرتب کیا تھا۔ اس نمبر میں حسرت کی شاعری اور زندگی پر کئی مضامین شائع ہوئے تھے۔ ان مضامین کو آل احمد سرور،ضیا احمد بدایونی،قاضی عبدالودود، مجنوں گورکھپوری، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر یوسف حسین خان اوراحتشام حسین نے تحریر کیا تھا۔

1982 میں حسرت صدی کے موقع پر رسالہ اردو ادب نے دوبارہ حسرت نمبر شائع کیا۔ یہ نمبر کافی ضخیم تھا اور اس میں حسرت موہانی کی سیاسی زندگی اوران کے آخری 25 برسوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ یہ عظیم خاص نمبر ڈاکٹر خلیق انجم نے ترتیب دیا تھا۔

انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے اردو ادب کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس رسالے نے شروع سے ہی اردو ادب کے تاریخی پہلو ؤں کا احاطہ کیا ہے اور اس جریدے نے ہم عصر منظرنامے کے ساتھ ساتھ زمانہ قدیم کی تاریخی تہذیبی، سماجی اور معاشی صورتحال سے لوگوں کو متعارف کرانے کا کام کیا ہے۔ اردو ادب نے شروع سے ہی اپنی ایک الگ شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس رسالے کی خوش قسمتی ہے کہ اسے آغاز سے ہی کہنہ مشق اور قابل و ذہین اوراردو کے سچے سپوتوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اس رسالے کو جس بلندیوں پر پہنچایا اس سے آج بھی اس رسالے کا کوئی قاری انکارنہیں کرسکتا۔ پروفیسر آل احمد سرور کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں اورخلیق انجم اوران کے بعد اسلم پرویز اس رسالے کے مدیر رہے اورآج بھی یہ رسالہ اسلم پرویز کی زیرادارت کامیابی وکامرانی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

پروفیسر آل احمدسرور نے اردو ادب کا ایک بہتر معیار قائم کرنے کے لیے جہاں اس کی ضخامت، گیٹ اپ اوراس کی نگارشات پر توجہ دی، وہیں اس رسالے کے قارئین کی پسند کا بھی خیال رکھا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اردوادب کو مقبول اوردوسرے رسالوں میں سب سے بہتر بنانے کے لیے اس کے خاص نمبروں پرخصوصی توجہ دی اورایک کے بعد ایک لگاتار بہترین اورضخیم خصوصی نمبر شائع کیے۔

1964 کا شمارہ نمبر 3اور 4 جواہر لعل نہرو نمبر ہے۔ اس کے سرورق پر جواہر نمبر لکھا ہے یہ نمبر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خصوصی نمبر پنڈت نہروکی سوانح۔ ان کی حیات و سیاست اور ان کی زندگی کے تمام تر گوشوں کاتفصیلی احاطہ کرتا ہے۔ اس باتصویر نمبر میں آل احمد سرور، تاراچند، فراق، سعید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر وحیداختر، صابرہ زیدی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے مضامین ہیں۔ اس خصوصی نمبر کی ضخامت 270 صفحوں پر مشتمل تھی۔

سرور صاحب نے 1966 کے شمارہ 4 کو اردو ادب،تخلیق نمبر کے طور پر شائع کیا۔ اس ضخیم خصوصی نمبر میں افسانے، نظمیں، غزلیں، رباعیات، ڈرامے اور ڈائریاں اور مکاتیب وغیرہ شامل ہیں۔ اس خصوصی نمبر میں اردو ادب کی تمام اصناف اور تمام طرح کی تخلیقات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ افسانوں میں حیات اللہ انصاری کا پرانے کوہ کا صحرا، کوثر چاند پوری کا ابر کا ٹکڑا، رام لعل کا فرضی آگ کی لو وغیرہ،نظموں میں اخترالایمان، روش صدیقی، مسعود علی ذوقی، وحید اختر، باقر مہدی، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کی تخلیقات ہیں۔ غزلوں کے حصے میں میکش اکبرآبادی، آل احمد سرور، سلیمان اریب، خلیل الرحمٰن اعظمی، بشیر بدر اور شہریار جیسے عظیم شعرا کی نگارشات شامل اشاعت کی گئی ہیں۔ ڈراموں میں ڈاکٹر محمد حسن کا کتھا کلی، گربچن چندن کا راج نیتی ہیں تو ڈائری کے حصے میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی 'عظیم اور لازوال' کے عنوان سے ڈائری شامل ہے ان کے علاوہ مکتوبات میں علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ خط کو رکھا گیا ہے۔

1969 کا پہلا شمارہ غالب نمبر تھا۔ اس میں آل احمد سرور نے غالب کی عظمت کے نام سے اداریہ تحریر کیا ہے۔ آل احمد سرور کے علاوہ گیان چند جین، عبدالقوی دسنوی، حسن عسکری، ڈاکٹر سید حامد حسین کے مضامین شامل ہیں۔ 1969 کا شمارہ 3 ذاکر نمبر ہے جس میں رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، محی الدین احمد، باقر مہدی، احمد سعید، وحید اختر اور خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ اردو ادب میں گاہے بہ گاہے انجمن کے اخبار' ہماری زبان' میں شائع ہونے والے تبصروں کی فہرست بھی شائع کی جاتی تھی۔ 1969 کے شمارہ 4 میں 1954 کے درمیان شائع ہونے والے تبصروں کو شائع کیا گیا ہے۔ تبصروں کے شائع کرنے کا یہ سلسلہ 1969 کے شمارہ نمبر 2 سے شروع کیا گیا تھا۔ 1950 کے بعد یوں تو رسالہ اردو ادب کے مدیران تین ہی رہے ہیں لیکن 1969 کے شمارہ 4 پر ایڈیٹر کا نام مسعود حسین خاں لکھا ہوا ہے اور 1970 کے شمارہ 1 میں بھی مدیر کا نام مسعود حسین خاں ہی شائع ہوا ہے جبکہ 1971 کے شمارہ 3 میں مدیر کا نام دوبارہ سے آل احمد سرور دیا گیا ہے۔ مدیر کے نام کی تبدیلی کا ذکر نہ تو 1969 کے کسی شمارے میں ہے اور نہ ہی 1970 کے کسی شمارے میں کوئی اطلاع دی گئی ہے۔ شاید ہوسکتا ہے کہ مذکورہ دونوں شمارے آل احمد سرور

کی کچھ دوسری مصروفیت کے باعث پروفیسر مسعود حسین خاں کی ادارت میں شائع ہوئے ہوں۔

سہ ماہی رسالے اردو ادب میں رسالے کی ترقی اور اس کے قاریوں کی تعداد بڑھانے کے لیے خاطر خواہ کوشش کی جاتی تھی۔ 1972 کے شمارہ میں ادبی حلقہ کے عنوان سے اشتہار شائع ہوا ہے۔

ادبی حلقہ

شرائط رکنیت

1. حلقے کی رکنیت کی فیس سالانہ 38روپے یک مشت یا تین قسطوں میں۔
2. حلقہ ممبروں کو ہر سال پچیس روپے کی کتابیں اور انجمن کا پندرہ روزہ ہماری زبان، قیمت 6روپے اور سہ ماہی اردو ادب، قیمت 15روپے کل 46روپے کی مطبوعات پیش کرے گا۔
3. ارکان کو بقدر پچیس روپے انجمن کی مطبوعات میں سے اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے کا حق ہوگا۔
4. اڑتیس روپے کے عوض 46روپے کی مطبوعات مندرجہ بالا صورت میں دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی رکن انجمن کی دوسری کتابیں خریدے گا تو ان پر پچیس فیصد کمیشن دیا جائے گا۔

مزید تفصیلات کے لیے دفتر سے خط و کتابت کیجیے۔

انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔(22)

1973 کے شمارہ 3اور 4(مشترکہ شمارے) سے ادارت کی ذمہ داری خلیق انجم نے سنبھالی اور ان کے مدیر بننے کے بعد ہی انجمن کا دفتر دہلی منتقل ہوگیا۔ اس شمارے کے اداریے میں جناب خلیق انجم تحریر کرتے ہیں:

> انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے اردو کا پہلا شمارہ 1921 میں ڈاکٹر عبدالحق کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ 1947 میں جب دہلی میں انجمن کے مرکزی دفتر اور اس کے کتب خانے کو آگ لگادی گئی تو تمام کاروبار شوق

کے 'اردو' بھی بند کر دیا گیا۔ 1948 میں ڈاکٹر عبدالحق پاکستان تشریف لے گئے تو انھوں نے کراچی سے پھر اردو نکالنا شروع کر دیا ادھر علی گڑھ میں جب انجمن ترقی اردو کا دفتر دوبارہ قائم کیا گیا تو اردو کا نام بدل کر 'اردو ادب' کر دیا گیا۔ اور اس کی ادارت کی ذمہ داری 1950 سے پروفیسر آل احمد سرور کو سونپ دی گئی۔ اس وقت سرور صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ریڈر تھے۔ گویا سرور صاحب نے یہ ذمہ داری تقریبا 24 سال تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھائی۔

ان کے زیرادارت انجمن کے سہ ماہی رسالے نے اردو کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ شاید ہی ہندوستان کا کوئی ادیب اور محقق ایسا ہو جس کے مقالے اس میں شائع نہ ہوئے ہوں۔ اس کے کئی خاص نمبروں نے اپنے موضوع اور اعلیٰ درجے کے مقالوں کی وجہ سے مستقل کتاب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ادارہ اردو ادب سرور صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کرتا ہے پچھلے چند برسوں سے بعض بدانتظامی دشواریوں کی وجہ سے اردو ادب کی اشاعت میں تاخیر ہوتی رہی ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ آئندہ شمارہ وقت پر شائع ہو۔

آخر میں افسوس کے ساتھ ہم معذرت خواہ ہیں کہ یہ شمارہ پچھلے سال کے تین چار شماروں پر مشتمل شمارہ نکالنا پڑا اور اس کی ضخامت بھی پچھلے شماروں سے کم رہی۔ کاغذ کی غیر معمولی گرانی اور کمیابی نے ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا اگر کچھ حالات سدھرے تو انشاء اللہ آئندہ اس کمی کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے گی۔'' (23)

1974 سے شمارے میں کافی نمایاں تبدیلی ہوئی اس کے سائز کو چھوٹا کر دیا گیا اور رسالہ عام کتابی سائز کا شائع ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی قیمت میں بھی ایک روپے کا اضافہ کیا گیا۔ اب رسالے کی قیمت فی پرچہ پانچ روپے اور سالانہ قیمت بیس روپے اور خاص

نمبروں کی قیمت دس روپے ہوگئی۔ یہ سہ ماہی رسالہ پہلے جب علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا تو اس پر یہ تحریر ہوتا تھا۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر پبلشر سید فضل حسین نے لیتھو پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔

جب یہ رسالہ دہلی منتقل ہوا تو اس اعلامیے میں کچھ اس طرح کی تبدیلی درآئی۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند دلّی پرنٹر پبلشر ڈاکٹر ناصر حسین نقوی نے کوہ نور پریس دلی سے چھپوا کر دفتر انجمن ترقی اردو ہند دلّی سے شائع کیا۔

رسالہ اردو ادب 1974 کا شمارہ 1اور 2(مشترکہ شمارہ) خاص نمبر تھا۔ اس میں دہلی کے اردومخطوطات کی وضاحتی فہرست شائع ہوئی تھی اس پروجیکٹ کے ڈائرکٹر ایچ کے کول تھے۔اس شمارے کے مدیر جناب خلیق انجم اداریے میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ’’انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نے وزارت تعلیم وسماجی بہبود حکومت ہند کے تعاون سے دہلی کی لائبریریوں میں محفوظ مخطوطوں کی فہرست ڈاکٹر صلاح الدین سے مرتب کرائی تھی۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اور بہت سائنٹفک انداز پر انگریزی میں یہ فہرست مرتب کی۔ چونکہ یہ اردو اسکالروں کی دلچسپی کی چیز تھی اس لیے میں نے ڈاکٹر صلاح الدین سے درخواست کی کہ وہ اردو میں بھی اس کا ترجمہ کردیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جس محنت سے انھوں نے فہرست مرتب کی تھی اسی محنت سے ترجمہ بھی کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر صلاح الدین کی مرتب کردہ یہ فہرست دوسرے فہرست سازوں کے لیے مشعل راہ بنے گی۔‘‘ (24)

خلیق انجم نے جب رسالہ ’اردو ادب‘ کی ذمے داری سنبھالی اس وقت ہندوستان میں آجکل، کتاب نما، سب رس، سوغات، عصری ادب، شب خون اور شاعر جیسے رسالے نکل رہے تھے اس لیے انھیں سارے رسالوں میں انجمن کے اس قدیم اور علمی و تحقیقی رسالے کو نمایاں اور بہتر بنانے کے لیے کافی کوششیں کرنی پڑیں۔ اس رسالے میں بہتر

کوالیٹی کا کاغذ استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے سرورق کو جاذب نظر بنایا گیا اور اس میں اردو کی بہترین کیلی گرافی کا استعمال کیا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف رنگوں کا بھی استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے سائز میں بھی کمی کی گئی۔ آل احمد سرور کے وقت میں یہ لگاتار شائع ہورہا۔ لیکن بعد میں کچھ مسائل کی وجہ سے اس کی اشاعت کچھ وقفے کے لیے موقوف کر دی گئی۔ ان پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں:

''علی گڑھ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد انجمن کے کئی شعبوں میں نمایاں ترقی ہوئی مثلا ہماری زبان پہلے سے بہتر ہوا۔ اس کے خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ کتابوں کی اشاعت کی رفتار بڑھی۔ انجمن کی کچھ اور پرانی کتابوں کے ایڈیشن شائع کیے گئے۔ کچھ نئی کتابیں چھاپی گئیں۔ لیکن نئے حالات کا 'اردو ادب' پر برا اثر پڑا۔ پروفیسر آل احمد سرور کے زمانے میں 'اردو ادب' پابندی سے شائع ہورہا تھا ہمیں افسوس ہے کہ پابندی قائم نہیں رہ سکی۔ اس کی مختلف وجوہ ہیں لیکن بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ اردو ادب کے خریدار بہت کم ہیں۔ اگر ہمارے پڑھنے والے اس طرف توجہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو کے خریداروں میں اضافہ نہ ہو۔ اس وقت اردو ادب کے اقبال نمبر، امیر خسرو نمبر، اور انیس نمبر تیار ہیں۔ یگانہ نمبر کے لیے ابھی چند مضامین کی ضرورت ہے دو تین مہینے میں تمام نمبر شائع کردیے جائیں گے۔ اور آئندہ پوری کوشش کی جائے گی کہ ہماری زبان کی طرح اردو ادب بھی پابندی سے نکلتا رہے۔'' (25)

1975 کا شمارہ 1 اور 2، مشترکہ شمارہ تھا اور یہ خصوصی نمبر تھا اور یہ تاریخ ادبیات تاجکستان نمبر کے نام سے شائع ہوا تھا۔ 1975 کا شمارہ 3 اور 4 بھی خاص نمبر تھا۔ دہلی منتقل ہونے اور خلیق انجم کے مدیر بننے کے بعد ایک نمایاں تبدیلی یہ نظر آتی ہے کہ خلیق انجم نے رسالے کے ہر شمارے میں اداریہ لکھنا شروع کردیا جبکہ آل احمد سرور کے وقت میں اداریہ باقاعدگی سے شائع نہیں ہوتا تھا۔ 1975 کے بعد رسالے کی اشاعت چار سال تک بند رہی

اور 1979 میں نئے سرے سے شمارہ منظر عام پر آیا۔ اب رسالہ کوہ نور پریس کی بجائے جمال پرنٹنگ پریس سے شائع ہونے لگا۔ 1979 کے شمارہ 1 میں حرف آغاز کے تحت خلیق انجم لکھتے ہیں:

''انجمن کے دہلی منتقل ہونے اور کچھ مالی دشواریوں کی وجہ سے اردو ادب پابندی سے شائع نہ ہوسکا۔ ہم اس کوشش میں رہے کہ پچھلے تمام شمارے شائع کردیں۔ اس کوشش کی وجہ سے اور بھی تاخیر ہوگئی پچھلے دنوں انجمن کی مجلس عاملہ میں یہ معاملہ پیش ہوا اور اتفاق رائے پر اس تجویز کو منظور کرلیا گیا کہ اردو ادب کے جوشمارے شائع نہ ہوسکے انھیں چھوڑ دیا جائے اور 1979 سے نیا سلسلہ شروع کیا جائے۔ ہمارا 'اردوادب' کا آخری شمارہ 1975 کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس کے بعد ہم 1979 کا پہلا شمارہ نکال رہے ہیں اور اب ہماری کوشش ہوگی کہ پوری پابندی کے ساتھ اسے شائع کرتے رہیں۔'' (30 مارچ 1979، خلیق انجم (جنرل سکریٹری) (26)

خلیق انجم نے 1975 کے شمارے میں اطلاع دی تھی کہ اقبال نمبر تیار ہے لیکن کچھ دشواریوں کی وجہ سے وہ شمارہ شائع نہیں ہوسکا، اسے 1979 کے شمارہ 2 اور 3 کے طور پر شائع کیا گیا اقبال نمبر کے حرف آغاز میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

''آزادی ہند کے بعد انجمن کے سہ ماہی 'اردو ادب' میں اقبال پر خاصی تعداد میں مضامین شائع ہوئے ہیں اور اب اردو ادب کا اقبال نمبر شائع کیا جارہا ہے۔'' 30 ستمبر 1979۔'' (27)

خلیق انجم نے جب سے اس رسالے کی ادارت سنبھالی تب سے ہی انھوں نے اردو ادب کی ترقی کے لیے کافی کوششیں کیں اور رسالے کے لگاتار خاص نمبر نکالے۔ اس سے قاری کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور ایک موضوع پر مکمل تفصیلی جانکاری بھی قاری تک پہنچ گئی۔

1982 کا شمارہ 1 اور 2 بھی خاص نمبر تھا جسے حسرت صدی نمبر کی شکل میں شائع کیا

گیا تھا۔1983 کا شمارہ 1 اور 2 بھی خاص نمبر تھا۔ 1983 کے شمارے میں مدیر کا نام خلیق انجم تحریر ہے جبکہ اداریہ ایم حبیب خاں نے لکھا ہے۔1983 کا شمارہ 4 اور 1984 کا شمارہ 1 اور 2 ایک ساتھ مشترکہ شمارے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ ضخیم شمارہ فراق نمبر تھا۔1984 کا شمارہ3 اور 4 بھی خاص نمبر تھا۔ رسالے کے مدیر تو خلیق انجم ہی تھے لیکن رسالہ اب بہ اہتمام ایم حبیب خاں شائع ہونے لگا۔

1985 کا شمارہ 3اور4 فیض نمبر تھا۔ اس شمارے کی قیمت 50روپے رکھی گئی تھی۔ یہ شمارہ 415 صفحات پر مشتمل تھااور 'اردو ادب' کی تاریخ کے سب سے ضخیم شماروں میں سے ایک تھا۔ 1986 سے اردو ادب کی قیمت دس روپے کردی گئی۔

1986۔1987 کے بعد سے اردو ادب کے کچھ اہم نمبروں کی تفصیل اس طرح ہے:

1987 کا شمارہ 2 تا 4۔عبدالغفور شہباز نمبر

1988 کا شمارہ 1 تا 3۔ اشرف صبوحی نمبر

1988 کا شمارہ 4 خاص نمبر

1989 کا شمارہ1اور 2خاص نمبر

1989 کا شمارہ3اور 4خاص نمبر

1990 کا شمارہ1اور 2۔ اختر انصاری نمبر

1992 کا شمارہ3اور 4۔مولوی عبدالحق نمبر

1993 کا شمارہ1۔مولوی عبدالحق نمبر

1993 کا شمارہ 2 تا 4۔راج بہادر گوڑ نمبر 1994 کا شمارہ 1اور2 آنند نرائن ملا نمبر

1995 کا شمارہ1اور 2خاص نمبر

1995 کا شمارہ3اور 4۔قاضی عبدالغفار نمبر

1996 کا شمارہ3,2,1۔شبلی نعمانی نمبر

1997 کا شمارہ 1 تا 4خاص نمبر

1998 کا شمارہ 4(اکتوبر،نومبر، دسمبر)۔ذوق نمبر

1998 میں رسالہ 'اردو ادب' کی قیمت تیس روپے کردی گئی۔ 1998 کے شمارہ 1 یعنی جنوری،فروری، مارچ کے شمارے سے اسلم پرویز صاحب نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے اس شمارے میں ایک طویل اداریہ تحریر کیا اور مولوی عبدالحق کے اداریے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے بہتر مستقبل اور ترقی کے لیے کی جارہی کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب ایک زندہ اورتابندہ روایت کا امین ہے۔ لیکن محض ماضی کی شاندار روایت پر اکتفا کرلینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس روایت کو تازہ دم رکھنے کے لیے اس کی رگوں میں نیا خون دوڑانے کی ضرورت ہے۔ اردو ادب کا تازہ شمارہ بعض نمایاں تبدیلیوں کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ابھی ہماری کوشش آپ کے اندر اپنے بارے میں کچھ توقعات لگانے کی ہیں۔ اگلی منزل ان توقعات کو پورا کرنے کی ہوگی۔'' (28)

اس شمارے سے رسالے میں کمپیوٹر کا استعمال شروع ہوا۔ اس کے علاوہ غالب کے منتخب فارسی کلام کو اردو ترجمے کے ساتھ پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس کے کاغذ میں اور گیٹ اپ میں کافی بہتری لائی گئی۔ اسلم پرویز نے رسالے کی ترقی اور اسے دور جدید سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے ہر ماہ اداریہ تحریر کرنے کی روش اختیار کی۔ اداریے میں نہ صرف اردو زبان وادب بلکہ غیر ملکی ادب،سیاست، سماج،معیشت جیسے موضوعات کا بھی احاطہ کیا۔ اس سے قارئین نے کافی استفادہ کیا اور اس رسالے نے ایک منفرد شناخت قائم کی۔ آج بھی یہ رسالہ اسلم پرویز کی زیرادارت کامیابی سے جاری ہے۔ میں نے ان سے رسالے کے حوالے سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے کافی تفصیلی گفتگو کی اور رسالے کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں اردو کے رسائل کو کامیابی کے ساتھ باقاعدگی سے شائع کرنا ایک جوکھم بھرا کام ہے لیکن انجمن اس رسالے کو ہر ممکن طور پر قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس رسالے کی خاص بات یہ رہی ہے کہ عبدالحق کے وقت سے ہی اس رسالے کو بڑے سے بڑے ادیبوں اور تنقید نگاروں کا

تعاون حاصل رہا ہے اور ہمیشہ ہی اس رسالے نے اپنا معیار برقرار رکھا ہے اورآج بھی ادب کے اسکالروں اور اردوداں حلقے میں یہ رسالہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ اسے اوربہتر اورخوب سے خوب تر بنائیں۔ انجمن کا سہ ماہی رسالہ اردو ادب اور پندرہ روزہ اخبار ہماری زبان آج بھی ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہیں۔

تحریک: مارچ1953 میں دہلی سے اس مشہور رسالے کی شروعات ہوئی تھی۔ اسے پریم گوپال متل نے شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ ترقی پسندی کا مخالف تھا۔ اس رسالے نے شروع سے ہی اپنا الگ اور منفرد معیار قائم کیا۔ یہ رسالہ لگاتار 29 برسوں تک نکلتا رہا۔اس کے مدیران میں مخمور سعیدی اور تمکین کاظمی کا نام بھی شامل رہا ہے۔ اس رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد نوشاد عالم لکھتے ہیں:

> *’’یہ اس وقت کا واحد رسالہ تھا جو ترقی پسند تحریک کے عہد شباب میں تصویر کے دوسرے رخ کو پیش کررہا تھا۔ اس رسالے میں اردو کے نامور ادبا وشعرا کی تخلیقات شائع ہوتی تھی۔تحریک کی آبیاری میں مخمور سعیدی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ جو اس رسالے کے معاون مدیر رہے ہیں۔ اس رسالے نے خاصی شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ افسوس کہ گوپال متل نے اپنی صحت کی ناسازگاری کی وجہ سے اسے 1981 میں ہمیشہ کے لیے بند کردیا اس رسالے کے چند خاص نمبر بھی شائع ہوئے جن میں سلور جوبلی نمبر اہم ہے۔‘‘* (29)

اس رسالے نے خاص نمبروں کی جھڑی لگا دی تھی اور لگاتار 15 خاص نمبر اردو قارئین کو دیے۔ جگر نمبر،اقبال نمبر، غالب نمبر،انقلاب روس نمبر اور سلور جبلی نمبر قابل ذکر ہیں۔ اس رسالے کے بیس سالہ ادب نمبر اور پچیس سالہ ادب نمبر کافی مقبول ہوئے تھے اور ان میں آزادی کے بعد کے اردو ادب کی ایک تفصیلی صورت حال پیش کی گئی تھی۔ ماہنامہ تحریک کے سلور جوبلی نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

> *’’تحریک کا سب سے اہم نمبر اس کا سلور جوبلی نمبر تھا۔ جس میں تقریبا آٹھ*

سوصفحات تھے۔ جس میں پندرہ تنقیدی مضامین، 25 نظمیں پاکستانی ادب پر، وزیر آغا، انور سدید اور جاوید انور کے مضامین، 35افسانے، 84شعرا کی غزلیں، ساجدہ زیدی کا ڈرامہ ممتا کی آگ کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں کے بڑی تعداد میں تراجم شامل ہیں۔تحریک کا یہ نمبر 1978 میں شائع ہوا تھا۔ 1979 میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اسے مخمور سعیدی اور پریم گوپال متل نے ترتیب دیا تھا۔'' (30)

نیادور: ہندوستان کی آزادی کے بعد اور اس سے قبل جاری ہونے والے رسائل کی ایک لمبی فہرست ہے۔ سرکاری انجمنوں اورسرکار کی زیر سرپرستی بھی کافی رسالے وجود میں آئے۔ سرکاری رسائل میں بہت کم ایسے رسالے ہوتے ہیں جو ادب اورصحافت کے میدان میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ سرکاری رسائل میں 'آجکل' اور 'نیادور' دو ایسے رسائل ہیں جو اپنے آغاز سے لے کر آج تک اپنا ایک ممتاز اورمنفرد مقام رکھتے ہیں۔ اترپردیش کے محکمہ اطلاعات ونشریات کے تحت شائع ہونے والا نیادور اپنی گوناگوں خصوصیات کے لیے جانا پہچانا جاتا ہے۔ یہ رسالہ اس لیے بھی ادب اورصحافت میں نمایاں رہا ہے کہ اس رسالے کوسبھی شعبہ زندگی، سبھی علوم وفنون اور ملک کی دیہی وشہری زندگی سے متعلق مضامین کے ساتھ بہتر ادب اورہندوستان کی تعمیر وترقی کے لیے کوشاں رہنے والا ایک ایسا پرچہ ہونے کا شرف حاصل رہا ہے جس نے نہ صرف ادب بلکہ ثقافت، سیاست، مختلف علوم وفنون، آرٹ کلچر، سائنس،اقتصادیات جیسے لاتعداد موضوعات پر ڈھیروں تحقیقی،تنقیدی اورعلمی مضامین شائع کیے ہیں۔ نیادور اس معاملے میں بھی سب سے منفرد ہے کہ اس رسالے نے کسی بھی مکتبہ فکر اورتحریک سے خود کوکبھی وابستہ نہیں کیا بلکہ اس رسالے کا واحد مقصد ادب کی خدمت کرنا تھا۔

نیادور کا پہلا شمارہ اپریل 1955 کومنظر عام پر آیا تھا۔ نیا دور سے قبل اس کا نام اطلاعات تھا جو کہ اتر پردیش سرکار کے محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کا ترجمان تھا۔ اس کی شروعات 1946 میں ہوئی تھی۔ نیادور کی شروعات کے تعلق سے عرفان عباسی لکھتے ہیں:

''اس وقت جون 1956 کا شمارہ پیش نظر ہے جس کے سرورق پر جلد 11 نمبر 6 درج ہے۔ اس اندراج کے مطابق نیادور کا سال اجرا یقینی طور پر 1946 قرار پاتا ہے۔'' (31)

اس سلسلے میں ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''زیدی صاحب (علی جواد زیدی جوجنوری 1957 تک ایڈیٹر تھے) نیادور کے اس وقت بھی ایڈیٹر تھے جب ان کا نام زینت نیادورنہ تھا۔ وہ اس وقت بھی نیادور کے سرپرست تھے جب فائلوں کے انبار میں دبے رہتے تھے۔ نیادور جو کچھ ہے وہ انھیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔'' (32)

ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ نیادور اطلاعات کے علاوہ ہماری آواز کے نام سے بھی کچھ دنوں تک نکلتا رہا ہے:

''آزادی وطن سے پہلے جب برطانوی حکومت تھی اور اترپردیش صوبہ متحد ہوا کرتا تھا تب اس کا سیاسی دارالسلطنت الہ آباد تھا اس وقت انگریزی حکومت نے اپنے کارناموں کی تشہیر واشاعت کے لیے اور جنگ کے لیے زیادہ سے زیادہ ہندوستانی جوانوں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے ہماری آواز کے نام سے اردو ہفتہ وار نکالا تھا جو کہ منسٹری آف وار کا ترجمان تھا۔ یہ غالبا 1942 میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ آج کے عام رسالوں کے سائز کا ہوتا تھا۔ اس کا سرورق آرٹ پیپر پر ہوتا تھا اوراس پر ہندوستان کا نقشہ بنا ہوتا تھا۔ بالکل درمیان میں ساری میں ملبوس ایک عورت بگل بجاتی ہوئی ہوتی تھی۔ ڈیزائن یہی رہتا تھا مگر رنگ بدلتا رہتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر جناب مشیراحمد علوی ناظر کاکوروی تھے۔ پہلے نستعلیق کتابت ہوتی تھی پھر ٹائپ کمپوزنگ سے شائع ہونے لگا۔ اس میں دنیا کے ان تمام ممالک کی خبریں اختصار سے دی جاتی تھیں جہاں جہاں اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی اس کے علاوہ جاپان کے خلاف بہت کچھ چھپتا

تھا۔ عموماً ایک چوہا بنا یا جاتا تھا اور نعرہ ہوتا تھا۔ تیرا میرا دشمن جانی یہ چوہا جاپانی۔ سرورق کے صفحات تصاویر سے مزین ہوتے تھے۔ اکثر آخری صفحے پر کتب و رسائل پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ ایسی نظمیں بھی شائع ہوتی تھی جن کے ذریعے قارئین کو جنگ میں شامل ہونے کے لیے اکسایا جا تا تھا۔ یکم جنوری 1945 کو اخبار میں صفحہ 2 پر فراق گورکھپوری کی کتاب اندازے پر تبصرے ہے جو ناظر کاکوروی نے کیا ہے اس میں ایک جگہ لکھا ہے۔ اردو زبان کو فراق پر ناز کرنا چاہیے۔'' (33)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ 1942 میں نکلنا شروع ہوگیا تھا اور اتفاق سے وہی سال ماہنامہ آجکل کے رسالہ نن پرون کے شروع ہونے کا ہے۔ انگریز حکومت کو اپنے ہارنے اور ہندوستان چھوڑنے کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ ہندوستانیوں کے دل میں زیادہ سے زیادہ جگہ بنانے اور اپنے لیے نرم گوشہ قائم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ ہماری آواز کہنے کو تو ایک سرکاری خبرنامہ تھا لیکن اس میں ادبی مضامین، تبصرے اور نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں جس کی بنا پر اسے رسالہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

جبکہ ڈاکٹر اطہر مسعود خاں جنھوں نے حال ہی میں نیا دور کا ضخیم اشاریہ مرتب کیا ہے لکھتے ہیں:

''حصول آزادی کے بعد ابتدائی دور میں اترپردیش کا محکمہ اطلاعات سرکاری پریس نوٹوں پر مشتمل ایک پندرہ روزہ رسالہ 'اطلاعات' کے نام سے شائع کرتا تھا۔ اس پرچہ میں ان پریس نوٹوں کو بغیر کسی ترمیم کے من وعن شائع کردیا جاتا تھا یعنی اس رسالہ کی حیثیت اس وقت محض سرکاری اطلاعات فراہم کرانے کی تھی۔ مزید یہ کہ اس کی ساری کاپیاں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔ علی جواد زیدی نے ان پریس نوٹوں کی تدوین یا ان کو ایڈٹ کرنے کی ابتدا کی اور معمولی تبدیلیوں کے بعد اس میں ادبی عنصر کا اضافہ کرنے کی کوشش کی اور اس دور کے کچھ قلم کاروں کی تخلیقات شائع

کرنے کی شروعات کی۔ اس طرح 'اطلاعات' میں باقاعدہ ادبی حصے کا اضافہ ہوگیا۔ یہ انھیں کی کوششیں تھیں کہ 'اطلاعات' جو صرف سرکاری اعلانات اور رپورٹوں پر مشتمل ہوتا تھا اب ادبی سفر کی سمت بھی پیش قدمی کرنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد علی جواد زیدی نے وزیراعلیٰ اترپردیش ڈاکٹر سمپورنانند جی کو ایک تجویز پیش کی کہ اطلاعات کا نام تبدیل کرکے اگر نیادور رکھ دیا جائے تو اس کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوجائے گا۔ بہرحال یہ تجویز منظور ہوئی اوراطلاعات اپنے نئے نام یعنی نیادور کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اس طرح نیا دور کا پہلا شمارہ اپریل 1955 میں علی جواد زیدی کی ادارت میں شائع ہوا۔'' (34)

میں نے ڈاکٹر اطہر مسعود خاں سے اس بابت دریافت کیا کہ نیا دور کی شروعات 1955 سے قبل ہوچکی تھی۔جبکہ آپ نے اس کے آغاز کا سال 1955 لکھا ہے۔ اس پر انھوں نے مدلل انداز میں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ صحیح ہے کہ نیادور اطلاعات کے نام سے پہلے شائع ہواکرتا تھا۔ اس وقت بھی علی جواد زیدی ہی اس کے سرپرست تھے لیکن نیادور کے نام سے اس کی باقاعدہ شروعات اپریل 1955 ہی ہے۔یہی وہ تاریخ ہے جب یہ رسالہ اس نئے نام سے اردو ادب میں ایک نئے دور کا اضافہ کرتا ہے۔

نیادور نے آغاز سے ہی اردو ادب کی ممتاز شخصیات کی تخلیقات شائع کی ہیں ان اہم ادبی تخلیق کاروں میں فراق گورکھپوری، پروفیسر محمد مجیب، نیاز فتحپوری، حیات اللہ انصاری، جگن ناتھ آزاد،کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، آنند نرائن ملا، وامق جونپوری، صالحہ عابد حسین، کشن پرسادکول، اپندرناتھ اشک اور اثر لکھنوی وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔

نیادور سرکاری رسالہ ہوتے ہوئے بھی سرکاری قید وبند سے آزاد رہاہے اور اس نے آغاز سے ہی اپنا معیار برقرار رکھا ہے۔ اس رسالے میں شروع سے ہی ادبی ذوق وشوق سے متعلق مضامین، شعری تخلیقات اور متفرق موضوعات پر مبنی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایک علمی اورادبی رسالے کے لیے یہ سب سے اہم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آغاز سے ہی

اپنا الگ مقام بنائے اور ادبی معرکوں اور غیر ضروری بحثوں سے اجتناب کرتے ہوئے ادب کی سچی خدمت کرے۔ آزادی کے بعد ادبی صحافت کی تاریخ شاہد ہے کہ ایسے ہی رسائل باقی رہے ہیں جو ان معاملات میں الجھنے کے بجائے ادب، زبان اور اردو کی سچی خدمت کرتے آئے ہیں۔ ایسے رسالوں میں رسالہ نیادور کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک ادبی اور علمی رسالے سے جو توقع کی جاسکتی ہے وہ سب کچھ اس رسالے میں موجود رہا ہے۔ نیادور کی طباعت، کتابت اور گیٹ اپ بھی اعلیٰ اور عمدہ معیار کے رہے ہیں۔ اس میں بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے علاوہ نئے شعرا اور قلمکاروں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

نیا دور بڑے سائز کے صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ اس میں اداریے کے علاوہ باقی صفحات پر دو کالم ہوتے ہیں۔ اس کے خاص نمبروں کا سائز عام شماروں سے تھوڑا بڑے سائز میں شائع ہوا ہے۔ نیادور کے صفحات کی تعداد عام طور سے تقریباً 50 ہوتی ہے۔

نیادور کے موضوعات اور کالموں میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں نیادور کے مستقل کالموں میں نقد و تبصرہ اور قارئین کے خطوط اور آپ سے ملیے اہم ہیں۔ ان کے علاوہ بچوں کا گوشہ، دنیا کا حال، عصری رسائل، صحت، اتر پردیش کے فنکار، طبی دنیا، پیغامات جیسے موضوعات کے تحت بھی تخلیقات و نگارشات شامل اشاعت ہوتی رہی ہیں۔

نیادور کے سب سے پہلے ایڈیٹر جناب علی جواد زیدی تھے اور سب سے پہلے جوائنٹ ایڈیٹر فرحت اللہ انصاری تھے ان دونوں حضرات نے رسالے کی ترتیب و تزئین پر خاص دھیان دیا اور زیادہ بہتر تخلیقات شائع کرنے کی کوشش کی۔

نیادور کے پہلے شمارے کی قیمت 25 پیسے تھی اور سالانہ چندہ تین روپیہ تھا۔ اپریل 1962 سے نیادور کی قیمت ماہانہ 1 روپیہ اور سالانہ دس روپے ہوگئی۔ نومبر 1991 سے اس کی قیمت تین روپے ہوگئی ہے اور سالانہ چندہ تیس روپے کر دیا گیا۔ اکتوبر 2001 میں اس کی قیمت دس روپے کی گئی تھی اور اب بھی یہ رسالہ اسی قیمت پر دستیاب ہے اور سالانہ قیمت 110 روپے ہے۔

اگست 1957 میں ایڈیٹر سرلا ساہنی اور جوائنٹ ایڈیٹر جناب صباح الدین عمر مقرر

کیے گئے۔ جون 1959 سے صباح الدین عمر ایڈیٹر بنے اور ایک لمبے عرصے تک انھوں نے نیادور کی ادارت سنبھالی۔جنوری 1972 تک صباح الدین عمر نے بطور چیف ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔ ان کے بعد سید خورشید احمد نے ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔ اگست 1979 سے امیراحمد صدیقی ایڈیٹر بنے۔ ان کے بعد شاہنواز قریشی اگست 1989 میں ایکٹنگ ایڈیٹر بنے۔ بعد میں ستمبر 1990 میں انھیں ایڈیٹر کی ذمے داری سونپی گئی۔ شاہنواز قریشی کے بعد سید امجدحسین اگست 1991، نجیب انصاری ستمبر 1997 اور فروری 1998 میں شاہنواز قریشی کو ادارت کی ذمے داری سونپی گئی۔ 2005 سے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نیا دور کے مدیر ہیں اور ان کی زیرادارت نیا دور نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔

وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اس رسالے میں تبدیلیاں بھی کی گئیں لیکن یہ رسالہ آج بھی اپنی رفتار کے ساتھ ادب اور صحافت کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ رسالہ آج دوسرے تمام رسالوں میں سائز، گیٹ اپ اورتزئین کے اعتبار سے بھی اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ نیادور جہاں اپنے بہترین مضامین اورشعری تخلیقات کے لیے جانا جاتا ہے وہیں اس کے خاص نمبروں کا جواب نہیں۔ نیا دور نے ایک سے بڑھ کر ایک خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ خاص نمبروں کے معاملے میں نیادور سرفہرست ہے۔اس رسالے نے اپنے آغاز کے فوراًبعد سے خاص نمبر اور خصوصی گوشے شائع کرنے شروع کردیے تھے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ خاص نمبروں کی یہ خصوصیات رہی ہیں کہ یہ نمبر نہ صرف ادبی شخصیات بلکہ سیاسی، سماجی، سائنسی، قومی وملکی معاملات پر بھی شائع ہوئے ہیں۔ خاص نمبروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اطہر مسعود خاں لکھتے ہیں:

> ’’ہندوستان کی ادبی وصحافتی تاریخ میں وہ چند رسالے جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع ہورہے ہیں، ان میں ایک نیا دور بھی ہے۔ نیادور کی بے مثل علمی، اور ادبی حیثیت کو مشاہیر علم وادب ہردور میں تسلیم کرتے رہے ہیں۔ یوں تو نیا دور کا ہرشمارہ گوناگوں صفات کا حامل اورمتعدد خوبیوں سے آراستہ ہوتا ہے لیکن خاص

> نمبروں کی اشاعت کے معاملے میں نیادور کو یقیناً خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ نیادور نے اکتوبر 1955 سے دسمبر 1999 تک کل 73 خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ واضح رہے کہ نیادور کا پہلاشمارہ اپریل 1955 میں شائع ہوا تھا۔ اس سے قبل یہ اطلاعات کے نام سے نکلتا تھا۔ آزادی کے بعد اطلاعات کا پہلاخاص شمارہ یاخاص نمبرعلی جواد زیدی کی ادارت میں 80صفحات پرمشتمل اگست 1947 میں شائع ہوا تھا۔'' (35)

نیا دور کے خاص نمبروں میں غالب نمبر، احتشام حسین نمبر، جعفرعلی خاں اثر نمبر، مسعود حسین رضوی ادیب نمبر، مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر، منشی نولکشور نمبر، منشی دیا نرائن نگم نمبر، اطفال نمبر، فراق نمبر، اندرا گاندھی نمبر، یوم جمہوریت نمبر، عثمان عارف نمبر، اودھ نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر، قومی یک جہتی نمبر، شیخ علی حزیں نمبر، صباح الدین عمر نمبر، نصف صدی نمبر، آزادی نمبر، اودھ نمبر، علی جواد زیدی نمبر، مولانا محمد علی جوہر نمبر، میر نمبر، شکیل بدایونی نمبرجیسے دستاویزی نمبر شائع کرکے ادب اورصحافت میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ یہ تمام نمبرات آج بھی لوگوں کی الماریوں میں دستاویزی شکل میں حفاظت سے رکھے جاتے ہیں۔ نیادور کا اودھ نمبر کافی ضخیم تھا اور یہ اپنے آپ میں اودھ کی تاریخ وثقافت اورتہذیب کاایک انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں پہلی بار اودھ کے تعلق سے تمام تر مضامین اورتخلیقات شامل کی گئیں۔ اودھ نمبر کے مضامین کو اودھ آئینہ ایام کے نام سے ایک الگ کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا، جس کا ترجمہ ہندی میں بھی کیا گیا۔ نیادور نے خاص نمبروں کے علاوہ مختلف اہم شخصیات پرخصوصی گوشے بھی شائع کیے۔ ان شخصیات میں ڈاکٹر ذاکرحسین، علامہ اقبال، سلام مچھلی شہری، شمیم کرہانی، وجاہت علی سندیلوی، نسیم انہونوی، جمیل مہدی، شیخ علی حزیں اورمنظرسلیم شامل ہیں۔ نیادور ایک باتصویر رسالہ ہے اوراس میں عام رسائل سے ہٹ کر بہت اچھی اور اعلیٰ درجے کی تصاویر شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان تصاویر میں کچھ تصاویریں تو نایاب ہیں اورنیا دور کو یہ فخر حاصل رہا کہ وہ تصویراس رسالے کی زینت بنی۔ نیادور میں حکومت اترپردیش کی کارگزاریوں، حکومت اترپردیش کے اشتہارات اور ریاستی

سرکار کے ذریعے چلائے جارہے مختلف کالموں کے تعلق سے بھی اطلاع دی جاتی رہی ہے۔ ان کے علاوہ نیادور کے خصوصی نمبرات شائع کرنے پر مختلف سیاسی لیڈران اور قابل قدر شخصیات کی مبارکباد کو پیغام کے عنوان سے شائع کیا جاتا رہاہے۔ پیغامات کے زمرے میں اخلاق الرحمٰن قدوائی، اندرا گاندھی، ایم چنا ریڈی، چندر بھان گپتا، پی وی نرسمہا راؤ، روہت نندن، ابوالحسن علی ندوی، کلب صادق، ملائم سنگھ یادو، ہیم وتی نندن بہوگنا، محمد عثمان عارف، مایا وتی وغیرہ کے پیغامات شائع ہوتے رہے ہیں۔ نیادور ویسے تو آغاز کے بعد سے لگاتار شائع ہوتارہا ہے لیکن کبھی کبھی مختلف مجبوریوں کی بنا پر ایک ساتھ کئی کئی ماہ کا شمارہ شائع ہواہے۔ فراق نمبر، اول، مارچ اپریل مئی 1983 اور مئی جون جولائی 1984 فراق نمبر دوم اس کی مثال ہے۔ اس طرح جنوری فروری مارچ 1985 اندرا گاندھی نمبر اور نومبر دسمبر 1987 اپریل تا ستمبر 1988 یادرفتگاں نمبر، بھی مشترکہ شائع کیا گیا اپریل تا ستمبر 1988 کے شمارے میں مدیر نیا دور جناب امیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''نیادور کا یادرفتگاں نمبر حصہ اول حاضر خدمت ہے۔ اس کی اشاعت میں بعض ناگزیر وجوہ کی بناپر قدرے تاخیر ہوئی جس کا ادارے کو شدید احساس ہے۔ نیادور کے خاص نمبروں کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ ان نمبروں کی ملک ہی میں نہیں بیرون ملک میں بھی جو پذیرائی ہوئی اس سے ہمیں بڑا حوصلہ ملا ہے اور یہ سب حکومت اترپردیش کی فراخدلی کا نتیجہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ نیادور کی قیمت برائے نام ہے ورنہ عام شماروں پر عموماًاور خاص شماروں پر خصوصاً زرکثیر خرچ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم حکومت کی فراخدلی اور اس کے وسائل کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور قارئین کے ذوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیادور کو ہمیشہ خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ امید ہے ہمارے قارئین حکومت اترپردیش کے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔'' (36)

جریدہ 'نیادور' اس معاملے میں بھی قابل ذکر ہے کہ اس نے زندہ شخصیات پر بھی

دستاویز نمبر شائع کیے ہیں یوں تو ادبی رسائل مرحوم شخصیات پر ان کی علمی اور ادبی خدمات پر مبنی ضخیم نمبر شائع کرتے ہیں لیکن نیادور قابل تعریف ہے کہ اس نے زندہ اور ادبی حلقوں میں معروف وممتاز شخصیات پر اچھے اور بہترین نمبر شائع کیے اور ایسی شخصیات کی ادبی خدمات سے ان کی زندگی میں ہی ادبی حلقوں کو روشناس کرایا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے حضرات جو اس قابل قدر شخصیات سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جنھیں ان کی ادبی خدمات کی مزید جانکاری حاصل کرنی ہوتی ہے وہ خود ان سے ملاقات کر کے تفصیل سے سب کچھ جان سکتے ہیں۔ مرحوم حضرات پر نمبر شائع کرنے سے کم از کم یہ بات تو ممکن نہیں ہے۔ نیادور نے مارچ، اپریل 1987 میں عثمان عارف نمبر شائع کیا تھا۔ اس کے اداریے میں امیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''اس موقع پر اس امر کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دوتین سال قبل تک نیا دور میں صرف مرحوم شعرا وادبا کے فن وشخصیت پر ہی مضامین شائع ہوتے تھے مگر ہم نے اس روایت کو توڑا ہے اور ادب کی زندہ قدآور شخصیتوں کے بارے میں بھی مقتدر اہل قلم حضرات کو لکھنے کی دعوت دی اور اس طرح ایک نئی روایت کی بنیاد پڑی جسے بہ نظر استحسان دیکھا گیا۔'' (37)

ادبی رسائل کے ساتھ یہ ایک المیہ رہا ہے کہ وسائل ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے اور اہم رسالے کے شماروں کو لگا تار نکلنے میں دشواری ہوئی ہے۔ آجکل، اردوادب اور نیا دور یہ سبھی رسائل اس طرح کی دشواریوں سے گزرے ہیں اور ان جریدوں کے کئی شمارے ایک ساتھ منظر عام پر آئے ہیں۔ اس کی وجوہات کئی ہوسکتی ہیں۔ وسائل کی کمی، ادارتی بورڈ کا نہ ہونا، مضامین اور تخلیقات کا وقت پر نہ پہنچنا وغیرہ، نیادور کا جنوری فروری مارچ 1986 کا شمارہ مشترکہ شمارہ تھا۔ ایڈیٹر نے 'اداریہ' یعنی اپنی بات میں لکھا ہے:

> ''بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر نیادور کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی ہے۔ جس کا ہمیں افسوس ہی نہیں شرمندگی بھی ہے۔ اب ہمارے لیے اور

کوئی چارہ نہیں کہ اس کے تین چار مشترکہ شمارے نکال کر اس کی اشاعت
کو معمول پر لے آئیں۔ اس کے لیے ہم اپنے قارئین سے انتہائی
معذرت خواہ ہیں۔'' (38)

اسی طرح اپریل تا نومبر 1986 کا شمارہ بھی مشترکہ تھا اداریے میں ایڈیٹر رقم طراز ہیں:

'' نیادور کی اشاعت میں تاخیر کے لیے ہم بار بار اپنے مخلص قارئین سے
معذرت کر چکے ہیں بہت سوچ سمجھ کر ادارے نے آٹھ ماہ کا مشترکہ شمارہ
نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ہم نیادور کو ماہ بہ ماہ آپ کی خدمت میں
پہنچاسکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ خریداروں کی مدت
خریداری مزید چھ ماہ بڑھائی دی جائے تا کہ ان کو کوئی نقصان نہ برداشت
کرنا پڑے۔ امید ہے کہ ہمیشہ کی طرح آپ کا بھرپور تعاون ہمیں
حاصل رہے گا۔'' (39)

ماہنامہ نیادور یوں تو حکومت اتر پردیش کا ترجمان ہے لیکن اس رسالے نے حکومت کی حصولیابیوں اور کامیابیوں سے زیادہ ادب اور صحافت کو عام کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی انھیں کوششوں کے لیے نیا دور نے ضخیم خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ نیادور کی خاص بات یہ بھی رہی ہے کہ خاص نمبر کے لیے ایک سال پہلے سے تیاری اور کوشش شروع کردی جاتی تھی اور موضوع سے متعلق۔ تمام مضامین اور نگارشات جمع کی جاتی تھی۔ نیادور اگست میں آزادی نمبر اور جنوری میں یوم جمہوریہ نمبر شائع کرتا رہا ہے۔ ان دو خصوصی نمبروں کے مضامین پڑھ کر ہمیں ہندوستان کی آزادی اور جمہوریت سے متعلق کافی نئ اور اہم معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی آزادی اور یوم جمہوریہ منانے کا اس سے بہترین طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ اپنے قارئین کو بھی بہترین مضامین اور ملکی اور غیر ملکی حالات کے بارے میں اطلاع دی جائے۔ ان کے علاوہ ایسے نمبروں میں ادبی مضامین بھی خاطر خواہ تعداد میں شامل کیے جاتے تھے۔ نیا دور نے جہاں ہندوستان کے سماجی اور سیاسی افکار سے متعلق نمبر شائع کیے وہیں فراق نمبر، غالب نمبر، اور عبدالماجد دریابادی نمبر،

امیر خسرو نمبر اور احتشام حسین نمبر جیسے خالص ادبی نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ مارچ اپریل مئی 1983 میں فراق نمبر اول شائع ہوا تھا۔ اداریے میں مدیر لکھتے ہیں:

''نیادور کا فراق نمبر حاضر خدمت ہے۔ ہم پورے ایک سال سے فراق گورکھپوری جیسی اردو زبان وادب کی قدآور شخصیت کے شایان شان اس خصوصی نمبر کو نکالنے میں منہمک تھے۔ اس مقصد میں ہمیں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ تو قارئین کرام کریں گے۔ ہاں یہ ضرور عرض کیا جاسکتا ہے کہ حکومت اتر پردیش کی فراخدلی سے وہ وسائل ادارہ نیادور کو حاصل ہیں۔ ان سے ہم نے بھر پور فائدہ اٹھایا ہے اور اس نمبر کو خوب سے خوب تر بنانے کی ہرامکانی کوشش کی ہے اور ڈھائی سو سے زیادہ صفحات کا یہ نمبر آپ کے سامنے ہے۔ہمیں یقین ہے کہ جس طرح نیا دور کے دوسرے خصوصی نمبروں کو ملک کے ارباب نظر نے سراہا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ نمبر سراہا جائے گا۔'' (40)

نیادور کے خاص نمبروں نے رسائل کی صحافت میں اپنی جو شناخت قائم کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ نیادور اس معاملے میں بھی نمایاں رہاہے کہ اس نے ایسے خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں جو نیا دور سے پہلے کسی دوسرے نے شائع نہیں کیے ہیں۔ یہاں پر منشی نول کشور نمبر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں:

''منشی نول کشور نمبر نیادور کا ایک بہت اہم نمبر ہے۔ جس میں اردو کے اس عظیم ناشر اور ان کی اردو خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اس میں تقریبا 37 ادبی اور تنقیدی مضامین منشی نولکشور اور ان کی مطبوعات اور مختلف پہلوؤں پر شامل ہیں۔ یہ پہلا نمبر ہے جو کسی اردو پبلشر کے بارے میں شائع ہوا۔'' (41)

نیادور کے منشی نول کشور نمبر کو امیر احمد صدیقی نے مرتب کیا تھا اور جوائنٹ ایڈیٹر شاہنواز قریشی تھے۔ امیر احمد صدیقی اداریے 'اپنی بات' میں لکھتے ہیں:

''نیادور کا منشی نول کشور نمبر حاضر ہے۔ کسی خاص نمبر کے لیے مواد کی فراہمی

اور اس کی اشاعت کے لیے جن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے انھیں کچھ وہی حضرات جانتے ہیں جنھوں نے ان پر خارواديوں میں کبھی قدم رکھا ہے۔...... آج اس عظیم انسان کے 145ویں یوم ولادت کے موقع پر ماہنامہ نیادور کا یہ خصوصی نمبران لوگوں کی خدمت میں پیش کر کے مسرت محسوس کرر ہا ہوں جو علوم مشرقیہ کی قدیم روایات کے دلدادہ ہیں۔ ہمارا یہ خصوصی نمبر بہت تاخیر سے ضرور شائع ہورہا ہے جس کے لیے ہم قارئین نیادور سے معذرت خواہ ہیں لیکن جب یہ نمبر آپ دیکھیں گے تو خود اندازہ کرلیں گے کہ اس کی تیاری میں وقت لگنا ناگزیر تھا یایوں کہہ لیا جائے ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا'' مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ خصوصی نمبر اس تاخیر کی تلافی بھی کردے گا۔ اس نمبر میں صاحب نظر، یہ بھی دیکھیں گے کہ اس میں بعض ایسی نایاب اور نادر چیزیں شامل ہیں جنھیں نیادور پہلی بار شائع کرنے کا فخر حاصل کررہاہے۔ ہمیں یہ دعویٰ تونہیں کہ نیادور کا یہ خصوصی نمبر ہرلحاظ سے حرف آخر ہے لیکن اتنا تو یقینی طور سے کہاجاسکتا ہے کہ اس سے بہتر نمبراب تک ہندوستان میں کسی رسالے نے شائع نہیں کیا۔'' (42)

ہندوستان کی آزادی کے وقت اور اس کے فورا بعد نکلنے والے رسالوں میں بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے پچاس سال تک لگا تار شائع ہونے کااعزاز حاصل کیا ہو۔ نیادور لکھنؤ، آجکل دہلی، سب رس حیدرآباد اورممبئ کا شاعر قابل ذکر ہیں کہ ان تمام رسالوں نے اردو ادب اورصحافت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں اور اپنے مضامین، خاص نمبروں اورتخلیقات کے ذریعے اردو کی ادبی صحافت کو ایک نئی پہچان عطا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ آزادی کے بعد کے جوحالات تھے اور جہاں ترقی پسندی کا زوال ہورہا تھا ایسے وقت میں رسائل کو جاری رکھنا بڑا دقت طلب اورصبرآزما معاملہ تھا، لیکن نیادور نے ایسے وقت میں بھی قارئین کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہمیشہ ہمیشہ اردو کے

قارئین کو بہتر اور شاہکار ادبی تخلیقات سے نوازا۔ آزادی کے بعد کے ایسے ہی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے نیادور کے مدیر شاہنواز قریشی اگست 1998 کے شمارے میں لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد 1960 کے قریب جب ترقی پسند تحریک پر انحطاط آیا ہمارا ادب عوام سے دور ہوتا چلا گیا۔ ہمارے قلم کاروں اور دانشوروں نے عوام کے تئیں بڑے حقارت آمیز رویے کا مظاہرہ کیا۔ نئی علامت نگاری بلکہ علامت پرستی اور تجدیدیت نے ادب کی ریڈرشپ پر بڑا منفی اثر ڈالا۔ جس کے نتیجے میں ادب کی ریڈرشپ دن بہ دن ختم ہوتی چلی گئی۔ پریم چند، منٹو، کرشن چندر، فیض، مخدوم اور ساحر وغیرہ کو جو ریڈرشپ اور مقبولیت تھی وہ بعد کے لکھنے والوں کو ان کے رویے اور اسلوب کی بدولت میسر نہیں آسکی۔ اس طرح ہمارا ادب ہندوستان کے سماجی حقائق سے دور ہونے لگا اور ذہنی نفسیاتی گتھیوں اور جنسی گھٹن میں الجھتا چلا گیا۔ ہمارے علامت نگار اور تجریدیت پرست انگریزی اور فرانسیسی ادب اور وہاں کے افکار و خیالات کے تو دن رات حوالے دیا کرتے تھے۔ مگر اپنے ملک کی زبانوں کے ادب سے بالکل بے خبر نظر آتے تھے۔ اسی طرح اپنے ملک کے سماجی حالات و مسائل اور ملک کی ترقیوں پر بھی نظر ڈالنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب کا دائرہ اور ریڈرشپ دونوں محدود ہوکر رہ گئے۔'' (43)

مدیر نیا دور شاہنواز قریشی کی مذکورہ بالا باتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ادب کی مختلف تحریکوں سے جہاں اردو ادب اور زبان کو فائدہ حاصل ہوا ہے وہیں ادب کا دائرہ محدود بھی ہوتا چلا گیا۔ اردو ادب کے قارئین ادب کی تحریکوں کے زیر اثر ایک بے حسی اور نت نئی تحریکوں اور اِزم وِزم کی وجہ سے ادب سے دور اور لاتعلق ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تحریکوں سے ہونے والے فائدے کو بھی پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔ مثال کے طور پر علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک نے تو اردو ادب کے دامن میں بیش بہا خزانوں کا اضافہ کیا ہے لیکن اور بھی تحریکوں سے ادب پر منفی اثرات مرتب ہوئے اور قارئین ادب

سے دور ہونے لگے۔ ایسے ہی وقت میں ہلکی پھلکی اورشوخ تحریروں کے ساتھ ڈائجسٹوں نے اردو حلقے میں قدم رکھا اور لوگوں نے اس کی بڑی پذیرائی کی اور آگے چل کر پاپولر ادب کے نام سے جانا گیا۔ ادب کے ایسے معرکوں اورتحریکوں کے دور میں بھی نیا دور نے اپنی ثابت قدمی اور ادب وزبان، اردو کی نشرواشاعت اورصحافت کی ترقی کے جذبے سے اپنا لوہا منوالیا۔ نیادور نے اپنے سفر کی ہرکامیابی کو بہت ہی زبردست انداز میں منایا ہے۔ ایسی ہی ایک بڑی کامیابی تھی نیادور کی اشاعت کے پچاس برس۔اس موقع پر نیادورنصف صدی نمبر کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس نصف صدی نمبرکو 1946 سے رسالہ اطلاعات کے وقت سے پچاس سال بعد 1995 میں شائع کیا گیا تھا جبکہ رسالہ اطلاعات بطور نیا دوراپریل 1955 سے شائع ہوناشروع ہواتھا۔ مارچ اپریل مئی 1995 کامشترکہ شمارہ تھا۔ اس کے اداریے 'اپنی بات' میں ایڈیٹرسید امجد حسین لکھتے ہیں:

> ''چاہے وہ کوئی دور ہو، نصف صدی قبل جب بڑے زور وشور سے ترقی پسندتحریک جہدآزادی کے مطالبے کولے کرآگے بڑھی تھی تو اس وقت بھی اور پھرچھٹی دہائی اور ساتویں دہائی میں سارتر کے اثرات کے تحت جدیدیت کارجحان بھی انسانی حقوق کی آواز بلند کرتارہا اور اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی سمت سے بھی ہوائیں چلیں کسی رنگ کا پھول کھلے، کسی طرح کا موسم ہو، وہی تہذیب وتمدن زندہ اور باقی رہتا ہے جو انسانی حقوق کا علمبردار ہوتا ہے۔ پریم چند کےلفظوں میں وہی ادب کسوٹی پر کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، جوہمیں جگائے، سلائے نہیں، پریم چند کی اس تعریف پر اردو ادب ہمیشہ کھرا اترا اورگزشتہ پچاس برس کی سماجی سیاسی اورفکری تاریخ ہماری ادبی تخلیقات کے ذریعے مرتب کی جاسکتی ہے۔
>
> نیادور نے بھی اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کیےاوران پچاس برسوں میں ادب کی ہر جہت کو نصف صدی نمبر کے ذریعہ آپ کی خدمت میں

پیش کیا جارہا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں اطلاعات سے نیادور نے اس منزل تک سفر کیا ہے۔ اس کی ہیئت بھی بدلی اور رنگ روپ بھی بدلا ہے۔ وقت کی گرد نے اسے دھندلایا نہیں ہے بلکہ ابٹن کا کام کیا جس سے یہ نکھرتا ہی چلا گیا اور یہ اظہار حقیقت ہے خود شناسی نہیں کہ آج نیادور کو ادبی ماہناموں میں یقیناً ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ اس کے خصوصی نمبروں نے صحافت میں تاریخ سازی کی ہے۔'' (44)

نیادور حکومت اتر پردیش کا اردو ماہنامہ ہوتے ہوئے بھی ایک خالص ادبی رسالہ تھا۔ اس نے جہاں اتر پردیش کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی عکاسی کی ہے وہیں ملک کی قومی یک جہتی اور اردو زبان وادب اور اردو صحافت کی تعمیر وترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ نیادور نے اپنے آغاز سے ہی ادبی اور صحافتی معیار کو برقرار رکھا ہے۔ ادب کو سماجی ترقی کے زینے کے طور پر استعمال کرنے میں نیادور کا نام ہمیشہ سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔ نیادور کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حضور سہسوانی لکھتے ہیں:

نصف صدی

ہے نیادور نام تو میرا
اہلیت میں مگر پرانا ہوں
جو ہے جاری وہی زمانہ ہوں
خدمت فن ہے کام تو میرا
ادنیٰ خادم زبان اردو ہوں
زندہ رکھنا اسے ہے کام مرا
اس کے حق میں ہے مہر پیام میرا
وہ ہے اک پھول تو میں خوشبو ہوں
سچ تو یہ ہے کہ میرے دامن پر
اہل فن جو گہر سجاتے ہیں

بحرِ عرفاں سے کھوج لاتے ہیں
اس لیے میں ادب کا ہوں محور
گن کے گزرے ہوئے ہر اک دن کو
پالیا ہے پچاس کے سن کو(45)

نیا دور نے اردو ادب کے مختلف رجحانات اورموضوعات کو اپنے صفحات میں جگہ دی ہے۔ نیادور نے اپنی صاف ستھری اور بہترین صحافت کے ذریعے ایک اعلیٰ معیار پیش کیا اورادب کی ترقی اورصحافت پر طاری جمود کوختم کرنے کی کوشش کی اور اردو کی ادبی صحافت جو آزادی کی جنگ اورتقسیم کے بعد دگرگوں ہوگئی تھی اسے ایک نئی زندگی عطا کی۔ نیادور کے ادبی سفر میں ممتاز دانشور اوراديب شامل رہے ہیں۔ نیادور کے مدیران علی جواد زیدی، امیراحمد صدیقی، شاہنواز قریشی، صباح الدین عمر، سید امجد حسین، وضاحت حسین رضوی وغیرہ قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے اپنی دوسری مصروفیات کو پس پشت ڈال کر اپنی بے پناہ کوششوں اور کاوشوں کے ذریعے نیا دور کوممتاز اور بہتر بنانے کی کافی کوششیں کیں۔ نیادور نے آزادی کے بعد نکلنے والے رسائل کے لیے راستہ ہموار کیا اور نیا دور کی طرز پر کئی دوسرے رسائل بھی شائع ہوئے جو کسی ادبی تحریک یا ازم سے وابستہ نہیں تھے۔ ماہنامہ نیادور آج بھی اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر اردو کے ادبی حلقے میں کافی مقبول ومعروف ہے۔ آج بھی اردو کے قارئین اس رسالے کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ نیادور آج اردو زبان اورادبی صحافت کی ترقی کی راہ پر نہایت شان سے گامزن ہے۔

سوغات: سہ ماہی سوغات کی شروعات جنوری 1959 میں ہوئی تھی۔ جدیدیت کا علمبردار یہ رسالہ بنگلور سے نکلتا تھا۔ اس کے مدیر محمود ایاز تھے اور اس کی مجلس ادارت میں مغنی تبسم، خلیل مامون، عزیز اللہ بیگ شامل تھے۔ اس رسالے نے ادب کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سوغات کا نئی نظم نمبر کافی اہمیت رکھتا ہے اور جدید نظم کے موضوع پر اس کی دستاویزی حیثیت ہے۔ اس نمبر کو پاکستان سے 1962 میں شائع کیا گیا تھا۔

جولائی 1959 کے شمارے میں محمود ایاز، سلیمان اریب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''امکان بھرکوشش کر رہا ہوں کہ اس پرچے کو صرف ایک عام رسالہ نہیں بلکہ ایک ادارے کی شکل دے سکوں۔ بیسوں چیزیں ذہن میں موجود ہیں لیکن اس پتھریلی زمین اور ہمت شکن ماحول میں(یہ بات بنگلور کے لیے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے لیے لکھ رہا ہوں)اس پودے کو شجر سایہ دار بننے میں کافی وقت لگے گا۔ یہ بہر حال اپنے بس کی بات تو صرف محنت اورکوشش ہے نتیجہ کب نکلے گا اور کیا نکلے گا اس کی فکر کیوں کریں۔ مورخہ 16 جولائی 1959۔''(46)

یہ رسالہ تین ادوار میں شائع ہوا تھا۔ پہلی بار شائع ہونے کے کچھ برسوں بعد بند ہوگیا۔ دوسری بار اسے ستمبر 1971 میں شائع کیا گیا تھا۔کچھ مجبوریوں کے تحت اسے دوبارہ بند کردینا پڑا۔ اور تیسری دفعہ یہ رسالہ ستمبر 1991 میں جاری ہوا۔محمود ایاز کی سرپرستی میں فروری1997 میں آخری شمارہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد نومبر 1997 میں محمود ایاز نمبر شائع کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ اپنی ضخامت، اپنے ادبی رویوں، اپنی تلخ وترش تحریروں کے لیے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ڈاکٹر انیس صدیقی لکھتے ہیں:

''سوغات نے اصول و معیار کے معاملے میں مفاہمت کیے بغیر، ہرتحریک ورجحان اور ادبی گروہ بندی سے سوغات کو آزاد رکھا، سوغات نے اردو دنیا کو نہ صرف جدید ادبی رجحانات سے واقف کروانے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں بلکہ اس کام کا سنگ بنیاد سوغات نے ہی رکھا، سوغات کا شمار اردو دنیا کے ان چند رسالوں میں ہوتا ہے جن کے بغیر اردو ادب کی ترقی اور اس کی افہام وتفہیم کا تصور محال ہے۔''(47)

محمود ایاز نے مہنگائی کے دور میں بھی کافی ضخیم اور معیاری ادبی رسالہ شائع کیا اور اس کا ہر شمارہ ایک خاص نمبر ہوتا تھا۔ہندوستان کے ساتھ پاکستان میں بھی اس کے سیکڑوں قاری تھے اور اس رسالے کے قارئین کا اپنا ایک ادبی حلقہ تھا، جس میں کافی بڑی تعداد میں ادیب وشاعر اور صحافی حضرات شامل تھے۔

سہ ماہی فکر و نظر: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا سہ ماہی رسالہ فکرونظر 1960 میں شروع ہوا۔خالص تحقیقی نوعیت کے اس رسالے کو منظر عام پر لانے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان اور ڈاکٹر نظیر احمد کی کوششوں کا عمل دخل تھا۔ ان کے بعد اس رسالے کی ادبی اہمیت تھوڑی کم ہوگئی لیکن ادھر کچھ برسوں سے اس کے مضامین اور مشمولات میں کافی بہتری آگئی ہے۔شروع کے دنوں میں شبیر احمد خاں نوری، پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے سماجی، ادبی، لسانی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

سہ ماہی فکر و نظر کا مارچ جون 1975 کا خصوصی شمارہ سائنس پر شائع ہوا ہے جسے مرزا سعید الظفر چغتائی نے مرتب کیا ہے۔ اِس شمارے کے مدیر پروفیسر خورشید الاسلام ہیں۔

اس رسالے کی مجلس ادارت میں ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی، آل احمد سرور، ڈاکٹر ایم سعید الظفر چغتائی، ڈاکٹر نسیم انصاری، ڈاکٹر سلامت اللہ خاں، پروفیسر محمد انس، پروفیسر جلال الدین، پروفیسر محمد شفیع وغیرہ شامل رہے ہیں۔

اِس خصوصی شمارے میں طبعیات، برقیات، ریاضیات، ارضیات، فلکیات، جغرافیہ، حیوانیات اور سرجری وغیرہ سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ شمارے میں ہر مقالے سے پہلے مصنف کا تعارف اور مقالے کی تلخیص بھی دی گئی ہے۔فکر ونظر ایک اعلیٰ درجے کا علمی وتحقیقی رسالہ رہا ہے۔ زبان وتعلیم اور ادب وفنون کے حوالے سے اس رسالے میں اکثر و بیشتر وقیع مقالات شامل کیے جاتے رہے ہیں۔

'فکر ونظر' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رسالہ ہے لیکن یہ لیتھو پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج سے شائع ہوتا رہا ہے۔

رشید احمد صدیقی، اسلوب احمد انصاری، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو وغیرہ بھی رسالے سے جڑے رہے ہیں۔

فکر ونظر کے اکتوبر 1967 کے شمارے پر غلطی سے جلد 8 چھپ گیا تھا۔اس میں شمارہ مسلسل 29 چھپ گیا ہے جبکہ 28 ہونا چاہیے۔ نمبر1 چھپ گیا ہے جب کہ نمبر4 ہونا چاہیے۔

1972 کے شمارے میں مسعود حسین خاں کا نام بطور مدیر درج ہے۔اس سال کا شمارہ 1اور 2 مشترکہ شائع ہوا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی، پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد مہدی انصاری کے مضامین شامل ہیں۔اس وقت میں رسالے میں اداریہ شائع نہیں ہوتا تھا۔ اس رسالے میں تصوف، فلسفہ وغیرہ پر بھی مضامین شائع ہوئے ہیں۔

اِس کے مدیران میں شہریار، خورشیدالاسلام، مسعود حسین خاں، آل احمد سرور وغیرہ، قابل ذکر ہیں۔ 1996 میں فکر ونظر کا حالی نمبر شائع ہوا تھا جس کے مدیر شہریار تھے اور مدیر معاون محمد صابر، اِس شمارے کے اداریے میں شہریار صاحب نے اپنی ادارت کے حوالے سے باتیں کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ساڑھے تین سال قبل فکر ونظر کی ادارت کے فرائض کے لیے منتخب کیا گیا۔ میں نے مجلس ادارت کی پہلی میٹنگ میں یہ تجویز رکھی کہ جاری ہر شماروں کے علاوہ ہر سال خاص شمارہ بھی شائع کیا جائے جو عام طور سے علی گڑھ تحریک سے وابستہ اہم شخصیات میں سے کسی ایک کے کارناموں کے جائزے کے لیے مخصوص ہو۔مجلس ادارت نے اتفاق رائے سے اسے منظور کرلیا۔ ابوالکلام آزاد نمبر، ناموران علی گڑھ کے تیسرے کارواں کا دوسرا حصہ اور یہ حالی نمبر اسی اہم فیصلے کا نتیجہ ہیں۔'' (48)

اِسی خصوصی شمارے کے اداریے میں فکر ونظر کے 1992 میں شائع ہونے والے آئندہ شمارے کے متعلق یہ اعلان بھی ہے کہ 1992 میں نذیر احمد پر خصوصی شمارہ شائع کیا جائے گا۔

اِس خاص شمارے میں روایتی موضوعات کے علاوہ حالی کے فن اور شخصیت پر کچھ اہم اور نئے موضوعات پر بھی مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ حالی اور شیخ سعدی، حالی اور نقد غالب، حالی کے چند مطبوعہ نادر خطوط، حالی اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جیسے نئے موضوعات پر بھی مضامین ہیں۔ مسدس حالی، حالی کی تنقید، مقدمہ شعر و شاعری کی معنویت بھی اس میں شامل ہیں۔

اس شمارے کے قلم کاروں میں آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، یوسف سرمست، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین، قاضی جمال حسین، اسلوب احمد انصاری، وارث کرمانی، عتیق احمد صدیقی، خلیق احمد نظامی، نورالحسن نقوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شمارے میں محمد ضیاء الدین انصاری کا ایک خاص مضمون نقش حالی بھی شامل ہے جس میں مولانا حالی کی تصانیف اور ان کی خدمات پر شائع کتب اور مضامین کا مکمل اشاریہ دیا گیا ہے۔ اِس طرح کے مضامین، خاص نمبروں کی خوبصورتی میں اور اہمیت میں مزید اضافہ کردیتے ہیں۔شہریار اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ یہاں ایک تجربہ کار صحافی نظر آتے ہیں۔بعد میں انھوں نے شعر وحکمت سے اپنے صحافیانہ جوہر بکھیرے۔

فکر ونظر کا ایک اور خصوصی شمارہ عربی ادب نمبر 1979 میں شائع ہوا تھا جو شمارہ 1 تا 4 پر مشتمل تھا۔ جلد 16 ہے۔ اِس کے مدیر خورشیدالاسلام ہیں اور نائب مدیر محمد صابر۔ اِس شمارے پر مسلسل شمارہ 55 لکھا ہے۔

اِس شمارے میں عربی کے نامور شعرا اور ادیبوں کی شخصیت اورفن پر بڑے ہی کارآمد مضامین شائع کیے گئے ہیں۔

امرؤالقیس، متنبّی، جریر، فرزدق، المنفلوطی، توفیق الحکیم کی شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اِس شمارے میں اِس موضوع پر تمام جمع شدہ مضامین کو شائع نہیں کیا گیا تھا بلکہ اِس کے بعد والے شمارے میں آدھے مضامین کو شائع کیا گیا ،جبکہ اس سلسلے میں رسالے میں بھی اعتذار کے تحت اطلاع دی گئی ہے۔ڈاکٹر عبدالباری، ڈاکٹر خالدعلی خاں، ڈاکٹر محمد راشد ندوی، ڈاکٹر حافظ غلام مرتضیٰ، حافظ غلام مصطفٰے وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔اِس کے بعد والے شمارے میں جو جولائی۔ دسمبر 1982 کا ہے۔عربی شاعری کے حوالے سے 2 مضامین شامل ہیں۔

کتاب نما: کتاب نما کی تاریخ اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالنے سے قبل مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی تاریخ پر نظرڈالنا ضروری ہے کیونکہ کتاب نما کے ارتقا اور اس کے رسالے کی شروعات کن محرکات کے تحت ہوئی ان کا جاننا ضروری ہے۔ مکتبہ جامعہ کی شروعات 1922 میں ہوئی

تھی۔ شروعاتی دور میں مکتبہ نے ایک شعبے کے طور پر کام شروع کیا لیکن بعد میں اسے لمیٹڈ کمپنی کا درجہ دے دیا گیا۔

مکتبہ نے اشاعت اور تالیف کا اتنا کام انجام دیا ہے کہ جس کے لیے جامعہ ملیہ یونیورسٹی کی ترقی میں اس کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا۔ مکتبہ نے شروع ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان میں مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرنی شروع کیں۔ جامعہ ملیہ کے دلی منتقل ہونے کے بعد جامعہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکرحسین نے مکتبہ سے دیوان غالب شائع کروایا تھا۔ مکتبہ جامعہ سے ترجمے کے بھی کئی اہم اورقابل قدر کام انجام دیے گئے ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے سستی اور کم قیمت پر کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا جس سے بہت ساری کارآمد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ مکتبہ جامعہ سے 1930 اور 1940 کی دہائی میں شائع ہونے والے اہم قلمکاروں میں مولانا اسلم جیراج پوری،ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابدحسین، جناب سعید انصاری، ڈاکٹر عبد العلیم مرحوم، ڈاکٹر خالدہ ادیب خانم وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔

مکتبہ جامعہ نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اپنا ماہنامہ رسالہ بھی شروع کیا۔ 1926 میں بچوں کا رسالہ پیام تعلیم شروع کیا گیا تھا۔ 1947 تک مکتبہ جامعہ نے مختلف موضوعات پرتقریبا 500 کتابیں شائع کیں تھیں۔ 1947 میں ملک کی تقسیم اور ہندوستان کی آزادی کے وقت رونما ہونے والا قہر مکتبہ جامعہ پر بھی نازل ہوا اور اس کا ایک بڑا سرمایہ تباہ ہوگیا۔

مکتبہ کا دوسرا دور 1950 سے شروع ہوتا ہے اسی سال مکتبہ جامعہ کو ایک لمٹیڈ کمپنی کی حیثیت دی گئی۔ 1950 میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے نئے سرے سے تقریبا 300 کتابیں مرتب کر کے شائع کردی تھیں۔ مکتبہ جامعہ کے پہلے مینجنگ ایڈیٹر حامد علی خاں تھے۔ انھوں نے مکتبہ جامعہ کو نئی شناخت دینے میں اہم رول ادا کیا۔ ماہنامہ کتاب نما نے جناب حامد علی خاں کی موت پر اپنے جنوری 1964 کے شمارے میں کچھ یوں اظہار خیال کیا تھا:

’’ ہمیں یہ افسوس ناک خبر شائع کرتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ مکتبہ جامعہ

کے سابق منیجنگ ڈائریکٹر جناب حامد علی خاں صاحب کا حرکت قلب بند ہوجانے سے 5دسمبر 1963 کو پیرس میں انتقال ہوگیا۔ افسوس جامعہ اپنے اس عالی دماغ رکن سے محروم ہوگئی۔ مکتبہ جامعہ پر حامد صاحب کے بڑے احسانات تھے۔ آج سے 41سال قبل پہلے 1922 میں مکتبہ آپ ہی کی کوششوں سے قائم ہوا تھا 1922 سے 1958 تک جس محنت اور لگن سے حامد صاحب نے مکتبہ جامعہ کو سنوارا تھا اسے بھلایا نہیں جاسکتا 1947 کے فسادات میں مکتبہ کا لاکھوں روپے کا ذخیرہ خاک ہوجانے پر اسے دوبارہ قائم کرنا بلکہ اسے لمٹیڈ کمپنی کی شکل دلا دینا آپ ہی کا کام تھا۔'' (49)

حامد علی خاں کے بعد مکتبہ کی ذمے داری غلام ربانی تاباں کو سونپی گئی۔ انھوں نے بچوں کا رسالہ پیام تعلیم دوبارہ نئے جوش کے ساتھ شائع کیا اور ایک نیا ادبی علمی رسالہ کتاب نما کے نام سے شروع کیا۔ غلام ربانی تاباں کے بعد شاہد علی خاں نے مکتبہ کی کمان سنبھالی اور تقریبا تیس سال تک اس سے جڑے رہے۔ تیس برسوں میں انھوں نے مکتبہ کو اپنی انتھک کوششوں اپنی سمجھ اور عقل وفراست سے اردو زبان وادب کا ایک عظیم اشاعتی مرکز بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ مکتبہ بھی نشیب وفراز سے گزرتا رہا ہے لیکن آج بھی ہر سال تقریبا 100 سے زیادہ کتابیں مکتبہ سے شائع ہورہی ہیں شاہد علی خاں نے 2006 میں مکتبہ کو خیر باد کہہ دیا۔ ان کے بعد مکتبہ جامعہ کی حالت تھوڑی خراب تو ہوئی ہے لیکن اب بھی یہ ایک اہم اشاعتی ادارہ ہے۔ ابھی حال ہی میں مکتبہ کی خستہ حالت پر ایک سمینار میں ڈاکٹر انوار احمد پاشا نے کہا کہ ایک ایسا اشاعتی ادارہ جس نے آزادی سے قبل اور اس کے بعد اردو زبان وادب اور دوسرے موضوعات پر کتابوں کی ایک بڑی تعداد شائع کی ہے اس کی ایسی حالت کیوں ہوئی اور ان حالات کے لیے کیا وجوہات ہیں اور مکتبہ کی حالت کو درست کیسے کیا جائے۔ ان تمام معاملات پر آگے بڑھ کر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے اور اس کے بعد مکتبہ کو نئے سرے سے فعال بنانے کی کوشش کی جائے۔ مکتبہ جامعہ کو اور بہتر

بنانے کی کوششیں ہورہی ہیں اورآنے والے وقت میں مکتبہ جامعہ یقیناً اپنی پرانی شناخت حاصل کرلے گا۔

ماہنامہ کتاب نما کی شروعات یوں تو آزادی سے قبل ہوئی تھی لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر اس رسالے کو بند کردیا گیا تھا۔ اس رسالے کی دوبارہ شروعات جون1960 سے ہوئی تھی۔ اس کے پہلے مدیر ریحان احمد عباسی تھی اورنگراں غلام ربانی تاباں تھے۔کتاب نما کے آزادی سے قبل شروع ہونے اور اس کے دوسرے دور کے بارے میں مارچ 1965 کے شمارے کا اداریہ ملاحظہ ہو:

> ''ہمیں خوشی ہے کہ کتاب نما جون 1960 کے شمارے سے جب سے یہ آزادی کے بعد سے دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اب تک نہایت باقاعدگی اور پابندی سے شائع ہورہا ہے اور اس کی اشاعت بھی بڑھا کر پہلے سے پانچ گنا کردی گئی ہے۔ ہماری برابر یہ کوشش ہے کہ یہ نہ صرف اسی طرح زیادہ سے زیادہ شائع ہوتا رہے بلکہ اس میں کچھ صفحات کا بھی اضافہ کرکے اسے زیادہ مفید اور موثر بنایا جائے۔ہمیں امید ہے کہ اگرآپ کی ہمدردی اور پرخلوص تعاون اسی طرح ہمارے شامل حال رہا تو ہم جلد ہی اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجائیں گے۔'' (50)

جنوری 1964 تک کتاب نما کا اداریہ بغیرعنوان کے شائع ہوتا رہالیکن فروری 1964 میں اداریےکواشاریے کے نام سےلکھا جانے لگا۔

کتاب نما اور مکتبہ جامعہ کے تعلق سے تصدیق نامہ شروع کے شماروں میں اس طرح شائع کیا جاتا تھا۔

کمپنی کے سرمایہ کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصے دار

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اسلام جم خانہ کنیڈی سی فیس ممبئی۔

شری مالک رام بویجہ، ہندوستانی سفارت خانہ برسلز، بلجیم

میں سید ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔

19 فروری 1964 دستخط احمد ولی پبلشر

کتاب نما کی اس وقت قیمت فی پرچہ 10 نیے پیسے تھی اور سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔

کتاب نما کے اس وقت کے پبلشر سید احمد ولی تھے اور ان کے ذریعے یہ اعلان بھی شائع ہوتا تھا۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمٹیڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

ان کے علاوہ فارم IV بھی اس طرح شائع کیا جاتا تھا۔

فارم IV حسب قاعدہ۔8۔ بابت کتاب نما نئی دہلی

1. مقام اشاعت۔ جامعہ نگر نئی دہلی،
2. وقفہ اشاعت۔ ماہنامہ
3. پرنٹر کا نام۔سید احمد ولی۔قومیت۔ ہندوستانی۔ پتہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔
4. پبلشر کا نام۔سید احمد ولی۔قومیت۔ ہندوستانی۔ پتہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی
5. ایڈیٹر کا نام۔ریحان احمد عباسی۔قومیت۔ ہندوستانی۔ پتہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔
6. مالکان کے نام وپتے مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی، چیئرمین، پروفیسر محمد نجیب، جامعہ نگر نئی دہلی ڈائرکٹر (1) سید مجتبیٰ حسین زیدی(2) ڈاکٹر عبدالعلیم(3) مسٹر ایم آر چناۓ (4) مسٹر ایم ایچ ہاشمی (5) ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں(6) مرزا محمود بیگ (7) کرنل بشیر حسین زیدی(51)

ماہنامہ کتاب نما کی شروعات خالصتاً ادب کی خدمت کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ اس رسالے کے صفحات سب کے لیے یکساں طور پر وقف تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ ساتھ جدید تر رجحانات سے متاثر قلمکاروں کی نگارشات بھی کتاب نما کا حصہ بنتی رہی ہیں۔ کتاب نما میں سب سے زیادہ توجہ مکتبہ جامعہ اور جامعہ ملیہ سے متعلق خبروں کو دی

جاتی تھی۔ کتاب نما میں شروع کے اداریوں کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر اداریوں میں کوئی نہ کوئی اطلاع دی گئی ہے۔ مئی 1964 میں غلام ربانی تاباں کتاب نما کے منیجنگ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس سے قبل ان کا نام کتاب نما میں بطور نگراں شائع ہوتا تھا۔ مئی 1964 کے شمارے میں اپنے پہلے اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

''مکتبہ جامعہ اپنی معیاری اور صاف ستھری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ایک نمایاں مقام تو رکھتا ہی ہے لیکن اس میں بھی جو خصوصیت اور برتری اسے بچوں کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مکتبہ جامعہ نے نہ صرف یہ سلسلہ شروع کرنے میں پہل کی بلکہ اس نے اپنی کتابوں کے ذریعہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ ان کے پڑھنے سے بچوں کو بہترین سماجی اور سیاسی مواد بہم پہنچا کر ان میں عمدہ تعمیری ذہنیت پیدا کرنے کے وسائل فراہم کیے جائیں۔ بچوں کی صالح اور تعمیری ذہنیت بنانے میں رسالہ پیام تعلیم کا بھی بڑا ہاتھ رہاہے۔ یہ رسالہ مکتبہ جامعہ کے اہتمام سے 1926 میں نکلنا شروع ہواتھا۔ 1956 میں چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے اس کی اشاعت بند کردی گئی تھی۔ ہمیں اب یہ اعلان کرتے ہوئے انتہائی خوشی ہورہی ہے کہ مکتبہ جامعہ نے بچوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اسے دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پیام تعلیم کا پہلا پرچہ جولائی 1964 میں منظر عام پر آیا ہے۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کے ادارتی فرائض بچوں کے پرانے ساتھی پیام تعلیم کے سابق ایڈیٹر جناب محمد حسین حسان صاحب انجام دے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مکتبہ کے اس اقدام کو ہر جگہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔'' (52)

ماہنامہ کتاب نما دوسرے تمام رسائل کے برخلاف چھوٹی کتابی سائز میں شائع ہوتا ہے لیکن اس چھوٹی سائز میں بھی یہ رسالہ دوسرے رسالوں سے کسی بھی طرح کم نہیں

ہے۔اس وقت قیمت فی پرچہ 30 پیسے اورسالانہ تین روپے جبکہ لائبریریوں کے لیے سالانہ ایک روپے تھی۔ فروری 1976 سے قیمت فی پرچہ 50 پیسے ہوگئی اورسالانہ 5روپے جبکہ لائبریری کے لیے دو روپے۔ کتاب نما عموما 32 صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اس کے صفحات کم ہوگئے ہیں لیکن بعد میں دوبارہ اسے 32 صفحات کا ہی شائع کیا گیا تھا:

> ''گزشتہ مہینے کا کتاب نما کسی مجبوری کی وجہ سے 24 صفحات کا ہی شائع کیا گیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہم موجودہ شمارہ 40 صفحات کا شائع کررہے ہیں۔ اس کے بعد آئندہ حسب سابق یہ 32 صفحات پر ہی شائع ہوتا رہے گا۔'' (53)

1971 میں ادارت کی ذمے داری ولی شاہجہاں پوری نے سنبھالی اور مینجنگ ایڈیٹر شاہدعلی خاں مقرر ہوئے۔ شاہدعلی خاں اس سے قبل ممبئی میں مکتبہ جامعہ کی شاخ میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ کتاب نما کے خاص نمبروں کی اپنی الگ شناخت رہی ہے۔ کتاب نما نے خاص نمبر اس طرح مرتب کیے ہیں کہ وہ کوئی رسالہ نہ بن کر ایک مخصوص موضوع یا شخصیت پر مکمل کتاب یا دستاویز بن گئی ہے۔ کتاب نما کے خاص نمبروں میں گو پی چندنا رنگ نمبر، مولانا عبدالوحید صدیقی نمبر اور خلیق انجم نمبر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مئی 1976 میں ''ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق'' پرایک خاص شمارہ شائع ہوا تھا۔ یہ شمارہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل منفرد تھا۔ اس شمارے میں ہندوستان میں تمام اہم یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق اوران کے موضوعات کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔ یہ شمارہ سیدفرحت حسین نے مرتب کیا تھا۔ اس ضخیم اور منفرد خصوصی نمبر کے اداریے میں سیدفرحت حسین نے اس نمبر کی ضرورت اورمقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اس بات پر گفتگو کی ہے کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق کا کیا معیار ہے اور یہ کہاں تک اردو ادب اورزبان کی ترقی میں معاون ثابت ہورہی ہیں۔ اگست 1976 کا شمارہ

خواتین کے افسانوں پر مشتمل خصوصی نمبر تھا جسے صغریٰ مہدی نے مرتب کیا تھا۔ یہ شمارہ 100 صفحات کا تھا۔

کتاب نما نے آغاز سے ہی نئی ٹکنالوجی اور آفسیٹ مشینوں کا استعمال شروع کردیا تھا۔ جنوری 1965 کے اداریے میں لبرٹی آرٹ پریس کے افتتاح اور اس کی افادیت پر اداریہ لکھا گیا تھا۔ اس آرٹ پریس کو مکتبہ جامعہ نے خریدا تھا اور اس میں ایک آٹومیٹک آفسٹ مشین کا اضافہ بھی ہوا تھا۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اب یہ آفسیٹ مشین بند پڑی ہے اور وہاں مکتبہ جامعہ کا کام نہیں ہوتا۔ کتاب نما میں جائزے کے عنوان سے تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ ادبی خبریں کالم کے تحت مختلف ادبی سرگرمیوں کے تعلق سے دی جاتی ہیں۔شروعاتی دور میں ادبی خبریں ظل عباس عباسی مرتب کرتے تھے۔

کتاب نما کے مختلف شمارے مشترکہ بھی شائع ہوئے ہیں۔ جیسے اکتوبر نومبر 1979 کا شمارہ مشترکہ شائع ہوا ہے اس سے قبل ستمبر اکتوبر 1969 کا شمارہ بھی مشترکہ شمارہ تھا۔ کتاب نما نے فروری 1979 میں نہرو نمبر شائع کیا ہے۔ اس سے قبل مارچ 1969 میں غالب سے متعلق دستیاب کتابوں پر مشتمل ایک شمارہ شائع ہوا تھا۔ جنوری 1976 میں مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی نمبر شائع ہوا تھا۔'اردوادب 77-1976 میں' شائع ہوا تھا۔ جسے محمود عالم نے مرتب کیا تھا۔1981 میں دھنپت رائے نواب پریم چند نمبر شائع ہوا۔ مرتب کردہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ 1981 میں ہی ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر شائع ہوا تھا۔ جسے ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے مرتب کیا تھا۔ کتاب نما میں کبھی کبھی اشاریہ بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ جیسے اپریل 1978 میں اگست 1976 سے دسمبر 1977 تک شائع کیے گئے کتاب نما کے مضامین کا اشاریہ شائع کیا گیا ہے۔ جولائی 1978 میں مشرقی علوم والسنہ پر تحقیق مرتب ڈاکٹر سید حامد حسین،1978 میں ہی ایک خصوصی شمارہ شائع ہوا تھا۔ جس کا موضوع تھا اقبال جامعہ کے مصنّفین کی نظر میں۔ اسے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مرتب کیا تھا۔ستمبر 1977 میں مرزا دبیر نمبر شائع ہوا تھا۔یوں تو کتاب نما کے خصوصی نمبر بے مثال ہیں لیکن کتاب نما کے خصوصی گوشوں کا بھی جواب نہیں۔ دسمبر 1988 میں گوشہ انور سدید

شائع ہوا، جنوری 1990 میں گوشہ مرزا ادیب، فروری 1990 میں گوشہ وامق جونپوری شائع ہوا تھا۔اگر خاص نمبروں کی بات کریں تو نومبر 1990 میں علی سردار جعفری نمبر۔ جون 1991 میں ڈاکٹر خلیق انجم نمبر شائع ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کتاب نما کے اہم خصوصی نمبروں میں، وہاب اشرفی نمبر، مولانا عبدالوحید صدیقی نمبر،ڈاکٹر عابد حسین نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، گوپی چند نارنگ نمبر، پروفیسر آل احمد سرور نمبر، پروفیسر نثار احمد فاروقی نمبر، خواجہ حسن نظامی نمبر، عابد علی نمبر، خواجہ احمد فاروقی نمبر قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ کتاب نما کے صفحات ہر طرح کے قارئین کے لیے کھلے رہتے تھے اور قاری اپنی رائے بلا جھجک دیتا تھا اور اسے من وعن شائع کیا جاتا تھا۔ کتاب نما اس معاملے میں بھی منفرد ہے کہ اس میں کافی نئے نئے کالموں کو وقت اورحالات کی مناسبت سے شروع کیا جاتا رہاہے۔ جون 1971 سے ایک نیا کالم حاصل مطالعہ شروع کیا گیا تھا۔ اس بابت ایڈیٹر کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ’’کتاب نما کی اشاعت کا واحد مقصد پڑھنے والوں کو تازہ مطبوعات سے آگاہ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے اقتباس، تعارف اور تبصرے غرضیکہ جو کچھ کتابوں کو مقبول بنانے کے لیے کیا جاسکتا ہے کیا ہے۔ اب ہم یہ کالم اس لیے شروع کررہے ہیں کہ قارئین کتاب نما جو کتابیں پڑھتے ہیں اور ان کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں اس سے دوسرے بھی واقف ہوتے رہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ کتابوں کی مقبولیت کا علم بآسانی ہوسکے گا۔ مگر دوسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ کتابیں بھی روشنی میں آجائیں گی جو اشتہاروں اور تبصرہ نگاروں کی حدود سے باہر ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے اس سلسلے کو پسند کیا جائے گا۔ ہم یہ تو نہیں چاہتے کہ کسی کتاب کو قارئین کے درمیان موضوع بحث بنا کر مباحثے اورمناظرے کے دروازے کھول دیں۔ مگر متضاد لیکن سنجیدہ رایوں کی اشاعت سے ہمیں انکار نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں جو کچھ شائع ہوگا وہ

مراسلہ نگار کی ذاتی رائے ہوگی۔ ادارے کا اتفاق یا اختلاف ضروری نہیں۔ایڈیٹر۔''(54)

کتاب نما کا یہ کالم حاصل مطالعہ اپنی منفرد رایوں اور تجزیوں کی وجہ سے کافی مقبول ہوا اس میں کوئی بھی قاری کتابوں پر اپنی رائے دینے کے لیے آزاد تھا۔ اس لیے نئی کتابوں کے بارے میں دوسرے افراد بھی جان جاتے تھے اور مختلف قلم کاروں کے لیے بھی یہ کالم سود مند ثابت ہوا۔ ان کی کتابوں پر مختصر اور جامع تبصرے شائع ہوتے تھے جس سے اس کتاب کے مصنف یا شاعر کو اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کا اندازہ ہوجاتا تھا اور اس میں بہتری کے مشورے اور نکات مل جاتے تھے۔ کتاب نما میں کبھی کبھی اداریے بھی نہیں شائع ہوئے ہیں پہلے پہل اداریہ بلاعنوان شائع ہوتا تھا بعد میں اسے اشاریے کا نام دیا گیا۔ شاہدعلی خان کے ادارت سنبھالنے کے بعد اسے اپنی بات کے عنوان سے لکھا جانے لگا ماہنامہ افکار کراچی کے مہمان اداریے کے طرز پر دسمبر 1987 سے ایک بالکل نیا اور اچھوتا طریقہ اپنایا گیا اور اس شمارے سے اداریہ مہمان مدیر ترتیب دینے لگا۔ بطور مہمان مدیر ماہنامہ کتاب نما کا پہلا اداریہ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا تھا اور پہلا اداریہ اردو زبان اور اردو ادب کے موضوع پر تحریر کیا گیا تھا۔ اس بابت اطلاع دیتے ہوئے شاہدعلی خاں لکھتے ہیں:

''پچھلے شمارے میں ہم نے اپنے قارئین تک یہ اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ دسمبر کے کتاب نما سے ہم اداریوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کررہے ہیں،سہولت کی خاطر اسے مہمان اداریہ کہہ لیجیے۔ اس سلسلے سے ہمارا مقصد اپنے پرانے موقف کی تصدیق ہے کہ کتاب نما کے صفحات یکساں طور پر سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ ادب میں نظریاتی بحثیں ہوتی رہنی چاہئیں بقول شخصے جولوگ اصولوں اور نظریات کی خاطر نہیں لڑتے وہ کرسی،منصب اور ٹھیکے کے لیے لڑتے ہیں۔ ہم نے کتاب نما کو اب تک کسی فرد، کسی گروہ، کسی جماعت، کسی مخصوص اور محدود تصور کی تبلیغ کا وسیلہ نہیں بننے دیا۔ یہ بات ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کتاب نما نے اردو

> کی پوری دنیا اس کے غیر منقسم ورثے اور روایت کی ترجمانی کو اپنا نصب العین سمجھا ہے۔ ہمیں نہ کسی شعبہ علم سے بیر ہے نہ کسی ادبی اور علمی حلقے سے۔ تمام انسانی علوم، سماجی علوم، سائنسی علوم، اسی طرح ادبی اظہار کے تمام اسالیب جو اردو دنیا میں مروج ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین تک ان سب کی رسائی ہو۔
>
> اسی مقصد کے پیش نظر ہم نے کئی مختلف الخیال ادیبوں کو مہمان اداریہ لکھنے کی دعوت دی ہے۔کتاب نما کے لیے یہ واقعہ بیک وقت فخر ومسرت کا موجب ہے کہ اردو کے بزرگ ترین نقاد اور دانشور آل احمد سرور کے اداریے سے اس سلسلے کا آغاز ہورہاہے۔ یہ اداریہ دوقسطوں میں شائع ہوگا۔ ہم یہ اطلاع بھی دیتے چلیں کہ سرور صاحب کے بعد سردار جعفری نے مہمان اداریے کا وعدہ ابھی سے کرلیا ہے ان اداریوں کے واسطے سے ہمیں یقین ہے کہ ہم صحت مند، اختلاف اور ہرطرح کی مصلحت سے خالی عملی اورفکری اتفاق کی ایک نئی روایت کوفروغ دے سکیں گے۔'' (55)

ماہنامہ کتاب نما کے مہمان مدیر کا اداریہ اتنا زیادہ مقبول ہوا کہ صرف اس اداریے کو پڑھنے کے لیے لوگ کتاب نما کے خریدار بنے۔ کتاب نما کے مہمان مدیر کا اداریہ لکھنے کے لیے ہرمکتبہ فکر اور اردو ادب وزبان تعلیم وصحافت کی قابل قدر شخصیات کی نگارشات حاصل کی گئیں اورانھیں کتاب نما کے صفحات میں جگہ دی گئی۔ ماہنامہ کتاب نما نے مہمان مدیر کا اداریہ شروع کرکے ایک نئی روش قائم کی اور اس سے ایک ہی جیسی تحریروں اورموضوعات سے لوگوں کو چھٹکارا ملا۔ مہمان مدیر کے اداریے میں اردو تعلیم،تعلیم نسواں،اردو ادب اورزبان، اردو صحافت، اردو اخبارات کے مسائل، اردو رسائل کے مسائل، جیسے اہم موضوعات پر اداریے تحریر کیے گئے۔

ماہنامہ کتاب نما کے سرورق پر 1978 سے یہ جملہ شائع ہونے لگا نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا یقین۔ اس کے علاوہ اس دور کے کچھ شماروں

کے سرورق پر کتاب نما کے موضوعات کے عنوانات شائع کیے جاتے تھے۔ تنقیدیں، تجزیے، سفرنامے، انشائیے، تبصرے، کہانیاں اور ادبی خبریں۔ کتاب نما کے شمارے دیکھنے سے ایک بات اور سامنے آئی کہ کبھی کبھی اداریہ شمارے کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ مارچ 1988 کے شمارے میں اداریہ شمارے کے آخر میں صفحہ 95 پر شائع کیا گیا ہے۔ جون 1988 کے اداریے اپنی بات میں مدیر کتاب نما جناب شاہد علی خاں کتاب نما کی کامیابی پر یوں رقم طراز ہیں:

''ہم اس واقعے پر خوش بھی ہیں اور حیران بھی کہ کتاب نما کی مقبولیت نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے پچھلے شمارے مئی 1988 کی کاپیاں اسٹالز پر پہنچتے ہی ختم ہوگئیں۔ ہمارے ایجنٹ مزید کاپیوں کے لیے لکھتے رہے براہ راست دفتر کو پڑھنے والوں کے خطوط ملتے رہے ہم نے کسی نہ کسی طرح ان فرمائشوں کی تکمیل کی۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہمیں بعض قارئین سے معذرت کرنی پڑی۔ ہم کرتے بھی کیا دفتر کے ریکارڈ میں جو کاپیاں محفوظ رکھی جاتی ہیں ہمارے لیے انھیں بچائے رکھنا بھی ممکن نہ رہ گیا۔ بہرنوع ہم اپنے پڑھنے والوں کا شکریہ اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔'' (56)

پروفیسر مشیرالحق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کو دہشت گردوں کے ذریعے 10 اپریل 1990 کو ہلاک کردینے کے بعد ان کے سانحہ ارتحال پر کتاب نما نے مئی 1990 میں خصوصی گوشہ شائع کیا تھا۔ اس شمارے میں سابق وزیراعظم راجیو گاندھی کا پیغام بھی شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ مختلف قابل قدر ادبی اور سماجی شخصیات نے بھی گہرے دکھ کا اظہار کیا تھا جسے کتاب نما میں جگہ دی گئی تھی۔ راجیو گاندھی کا پیغام اس طرح تھا:

''آپ کے شوہر کی لرزہ خیز ہلاکت سے ہمیں شدید صدمہ ہے۔ آپ کے شوہر، ہماری مشترکہ ثقافت اور سیکولرزم کا ایک سچا اور ممتاز نمونہ تھے۔ ایک شریف النفس انسان کی زندگی کا اس طرح ختم کیا جانا ایک ایسا المیہ ہے جسے بیان کرنا مشکل ہے۔ اس حادثے پر ہمارے پاس الفاظ نہیں مگر میں

آپ کو یقین دلا تا ہوں کہ دکھ کی اس گھڑی میں میری بیوی اور میں آپ کے رنج وغم میں شریک ہیں۔ (سابق وزیراعظم راجیو گاندھی)۔'' (57)

آل احمد سرور کا پیغام کچھ یوں تھا:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اس سانحہ عظیم پر آپ کی تعزیت کروں جو آپ پر گزر گیا۔ یہ بات تو تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ ظالم ایک ایسے شخص کی جان لے لیں گے جس نے تین سال ان کے خطے میں خدمت کی اور جس کی انسانیت،شرافت، ہمدردی، دلسوزی اور جذبہ خدمت سے دنیا واقف تھی۔ جمعہ کی شام کو معلوم ہوا کہ ظالموں نے انھیں اغوا کرلیا۔ رہ رہ کر یہ امید بندھی رہی کہ شاید ان کی رہائی کی کوئی صورت نکل آئے بار بار خیال آتا تھا کہ سری نگر میں آپ پر کیا گزری ہوگی............ کل صبح آخر یہ اعلان ہوگیا کہ ان سفاک اور بے رحم اور ظالم ہاتھوں سے انسانیت، تہذیب، علم وادب، شرافت سب کا قتل ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ان حالات میں صبر کی تلقین بھی سنگدلی ہے۔ صرف یہی عرض کرسکتا ہوں کہ خدا کی مرضی یہی تھی۔ اس لیے اس کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے۔ بندے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ کل سوچتا رہا کہ تدفین ہی میں شریک ہوجاؤں مگر میری ہمت نہ پڑی۔ یہ منظر کیسے دیکھتا خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم کی تربت کو عنبری کرے اور ان کی روح کو اپنے آغوش رحمت میں جگہ دے آمین۔ میری بیوی اس غم میں آپ کی شریک ہے۔حکومت کی غفلت اور سستی کی بھی شکایت ہے اس سے پہلے سے ان کی حفاظت کا پورا انتظام کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کے اس طرح جان دینے کو شہادت سمجھتا ہوں۔'' (58)

میں نے یہ طویل اقتباس اس لیے دیا ہے تاکہ ماہنامہ کتاب نما کے مختلف اور ہمہ جہت اوصاف سامنے آسکیں کتاب نما اس معاملے میں منفرد ہے کہ اس میں وفیات اور مکتبہ جامعہ

کے ممبران سے متعلق خبریں کافی تفصیل اورخصوصی طور سے شائع کی جاتی تھیں۔ گاہے بگاہے مختلف اطلاعات بھی دی جاتی رہی ہیں۔ جامعہ ملیہ کی تاسیس کا موقع ہو یا مکتبہ جامعہ کی نئی آفس کا افتتاح اس طرح کی خبریں اہم سرخیوں کے ساتھ جگہ پاتی رہی ہیں۔

کتاب نما میں بطور مہمان مدیر اداریہ لکھنے والوں میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، منور رانا، جہانگیر رضا وارثی، مظہر مہدی، صدیق الرحمٰن قدوائی، سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، سراج اجملی، آل احمد سرور، سہیل انجم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مہمان مدیر کے طور پر کئی قلمکاروں نے دو دفعہ بھی اداریہ تحریر کیا ہے۔

شاہد علی خاں 2006 میں ریٹائر ہوگئے اوران کے بعد ہمایوں ظفر زیدی نے ادارت سنبھالی۔ جناب شاہد علی خاں نے ایک طویل عرصے تک کتاب نما میں بطور منیجر اور بطور مدیر خدمات انجام دی۔ ستمبر 2006 کے شمارے میں شاہد علی خان نے کتاب نما اور پیام تعلیم کے محترم قارئین کو الوداعی سلام کے عنوان سے اپنی سبکدوشی کی اطلاع دی ہے۔ انھوں نے اس اعلان میں اپنی خدمات اور کتاب نما کی ترقی اور کامیابی پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ مذکورہ شمارے میں لکھتے ہیں:

’’کتاب نما اور پیام تعلیم کے محترم قارئین کو الوداعی سلام۔ کتاب نما ستمبر 2006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور اس کے ذیلی اداروں کتاب نما اور پیام تعلیم سے میرے تعلق کی روداد بہت طویل ہے مکتبہ جامعہ کی دہلی اور ممبئی شاخ میں تقریباً اٹھارہ برس گزارنے کے بعد مکتبہ کے مرکزی دفاتر، جامعہ نگر نئی دہلی کی نگرانی کا فریضہ 1970 میں میرے سپرد کیا گیا۔ اس وقت تک پیام تعلیم نے تو اردو خواں بچوں کے حلقے میں اپنی ایک مستقل حیثیت بنالی تھی اور یہ مختصر سا رسالہ اردو میں بچوں کے ادب کا ایک سرگرم ترجمان بن چکا تھا۔ لیکن کتاب نما کی صورت ماہ بہ ماہ شائع کی جانے والی صرف ایک فہرست کتب کی تھی اور اس نے کسی ادبی رسالے کا انداز اختیار نہیں

کیا تھا۔ 1976 سے میری ان حقیر کوششوں کا آغاز ہوا جن کے نتیجے میں کتاب نما کو ایک باقاعدہ علمی وادبی رسالے کی شکل ملی۔ شروع سے میری توجہ اس امر پر مرکوز رہی کہ کتاب نما کسی ایک حلقے یا گروہ یا مکتب فکر یا نظریے کی اشاعت وتشہیر کا ذریعہ بن کر نہ رہ جائے۔ اس غیر جانب دارانہ رویے کے باعث بہت جلد کتاب نما کو اردو کی علمی اورادبی روایت سے شغف رکھنے والے عام اورخاص قارئین میں قبولیت حاصل ہوگئی اور ہرسطح، ہر حلقے کے اردو قارئین اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ کتاب نما کو اردو دنیا اور اردو کلچر کے ایک نقیب کے طور پر جانا جانے لگا۔

مکتبہ جامعہ، کتاب نما اور پیام تعلیم کے تعلق سے میرے عملی رابطوں کا سلسلہ آئندہ شمارے کے ساتھ ختم ہورہا ہے اور میں اب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی ذمے داریوں سے سبکدوش ہورہاہوں۔ اس ادارے سے میرا وسیع اور طویل رشتہ میری اپنی زندگی کا حاصل رہا ہے۔ اس رشتے کے طفیل مجھے پوری اردودنیا کی محبت اورخلوص کا لازوال تحفہ ملا اور اپنی بساط بھر میں نے اردو کی علمی، ادبی روایت اور اردو تہذیب وثقافت کے فروغ میں اپنا حقیر رول بھی ادا کیا۔ یہ سعادت میرے لیے معمولی نہیں اور اس کی قیمت کا احساس میرے شعور میں ہمیشہ جاگزیں رہے گا۔

رخصت کی اس گھڑی میں میرا دل مکتبہ جامعہ لمٹیڈ کے سرپرستوں اور کتاب نما اور پیام تعلیم کے قدرشناسوں کے لیے شکر کے جذبے سے بھرا ہوا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ ادارہ اور اردو کے یہ رسالے اس نعمت الطاف سے بھی محروم نہ ہوں۔ میں ان تمام رفقائے کار کا بھی ممنون ومتشکر ہوں جن سے میرا تعارف مکتبہ جامعہ کے واسطے سے ہوا۔ شاہد علی خاں۔ مدیر۔'' (59)

اس شمارے سے قبل اگست 2006 کے شمارہ میں مجلس ادارت (صدر) کے کالم میں صدیق الرحمٰن قدوائی کا نام شائع ہونے لگا۔ اس سے پہلے جولائی 2006 میں یہ کالم خالی

تھا اورصرف شاہد علی خاں اور محفوظ عالم کا نام مدیر اور معاون مدیر کے کالم میں شائع ہوتا تھا۔ نومبر 2006 میں ہمایوں ظفر زیدی نے ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔ دسمبر 2006 میں اداریہ مہمان مدیر نے نہیں بلکہ خود مدیر نے تحریر کیا ہے جناب ہمایوں ظفر لکھتے ہیں:

''اردو زبان وادب کی اشاعت ہمارے لیے ایک تہذیبی مشن اورایک اجتماعی نصب العین کی تکمیل کا موثر ذریعہ بھی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری موجودہ دنیا کی طرح ہمارا علمی اور ادبی معاشرہ بھی نظریاتی تنازعوں اور محدودوابستگیوں کی ضد پر ہے۔ ہم نے کتاب نما کے دروازے ان تمام سمتوں میں کھلے رکھے ہیں جدھر سے تازہ ہوا کے جھونکے اندرآتے ہیں۔ کلاسیکیت،ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے باہمی اختلافات اور مباحث ہمارے لیے اسی وقت تک قابل قبول ہوں گے جہاں ان میں کسی طرح کی تلخی کا شائبہ نہ ہو، گفتگو کی سطح علمی اور معیاری ہو، ہمارے وجدان میں اتنی لچک ہو کہ ہم نظریاتی رنگارنگی کا خیرمقدم کرسکیں اور ہمیں صرف اپنے یاصرف کسی ایک نقطہ نظر کی برتری اورصحت پر اصرار نہ ہو۔

بیسویں صدی اوراب اکیسویں صدی کی ذہنی زندگی کو بنانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے منصوبوں کا ایک خاکہ مرتب کیاتھا۔ اس خاکے میں رنگ آمیزی کا ایک راستہ کتاب نما کے صفحات سے ہوکربھی جاتا ہے۔ہم آپ سب کا اس راستے پر استقبال کرتے ہیں اورآپ کے سرگرم تعاون کے خواستگار ہیں۔

میری ادارت میں شائع ہونے والا کتاب نما کا یہ دوسرا شمارہ ہے۔ پچھلے شمارے میں ایک ایسا مضمون بھی اتفاقاً شائع ہوگیا جو مطبوعہ تھا اور اردو کے ایک موقر ماہنامے میں ابھی کچھ عرصہ پہلے چھپا تھا اس فروگزاشت پر معذرت خواہ ہوں۔انتظامیہ میں تبدیلی اور میری عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔ ہمایوں ظفر زیدی 11 نومبر 2006۔'' (60)

کتاب نما کے حوالے سے میں نے جناب شاہد علی خاں سے ملاقات کی تھی۔

جناب شاہد علی خاں اب کافی ضعیف ہو چکے ہیں اور انھیں سماعت کا بھی عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ پھر بھی انھوں نے مجھ سے کتاب نما کے تعلق سے کافی تفصیلی گفتگو کی انھوں نے کہا کہ کتاب نما کسی تحریک یا کسی بھی اِزم سے وابستہ نہیں رہا ہے اور اس میں ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات کے شعرا اور تخلیق کاروں کی نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں۔ اپنے منفرد گیٹ اپ اور اعلیٰ معیار کے لیے یہ رسالہ آغاز سے مقبول رہا ہے۔ جناب شاہد علی خاں جو اب نئی کتاب پبلشر کے نام سے اپنا اشاعتی کاروبار دیکھتے ہیں کتاب نما کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کتاب نما ایسے وقت میں جاری ہوا تھا جب ترقی پسندی اور جدیدیت میں جیسے ایک جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ہمارا مقصد ایسے وقت میں نہایت واضح تھا۔ ہمیں کسی سے بیر نہیں تھا اور ہم بس اردو زبان وادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور ہم نے شروع سے ہی یہ اعلان کیا تھا کہ کتاب نما کے صفحات سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور جب ہم نے مہمان مدیر کا کالم شروع کیا تو اس کی زبردست پذیرائی ہوئی اور یہ اداریہ آج بھی موضوع بحث ہے اس کے لکھنے والوں میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر، معروف صحافی، قلم کار، اہم سماجی وادبی شخصیات شامل رہی ہیں۔

شاہد علی خاں کی مذکورہ بالا باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں کتاب نما سے کتنا لگاؤ رہا ہے اور وہ آج بھی اس کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ آج بھی کتاب نما کسی تحریک یا نظریے سے قطع نظر خالصتاً ادب کی خدمت کرنے میں مصروف ہے۔

شیرازہ: دوماہی شیرازہ کا پہلا شمارہ مارچ اپریل 1962 میں شائع ہوا تھا۔ اس کی مجلس مشاورت میں جیالال کول، صاحبزادہ حسن شاہ، رام ناتھ شاستری تھے۔ نگراں علی جواد زیدی، مدیر مسئول محمد یوسف ٹینگ۔ اس رسالے کو بعد میں ماہانہ کر دیا گیا تھا۔

مئی 1962 میں شیرازہ کا تیسرا شمارہ شائع ہوا ہے۔ شیرازہ ایک خالص علمی اور تحقیقی رسالہ رہا ہے اور ریاست جموں وکشمیر کی تہذیب و ثقافت، ادبی اور علمی سرگرمیوں پر مبنی مضامین اِس رسالے کی زینت بنتے رہے ہیں۔ رسالے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتا ہوا یہ اداریہ ملاحظہ کریں جو مئی 1962 کے شیرازہ میں شائع ہوا ہے:

شیرازہ اردو زبان میں ضرور شائع ہوتا ہے لیکن اسے اردو زبان کے دوسرے رسالوں کی طرح ایک عام علمی اور ادبی رسالہ سمجھ لینا غلط ہوگا۔ ہم نے اس معیار کو نہیں اپنایا ہے کہ اِس میں بہت سی نظمیں، غزلیں اور افسانے ہوں، کچھ مزاحیہ مضامین ہوں اور کبھی کبھار دوایک مقالے بھی شائع ہوجائیں، شیرازہ، ایک خالص علمی اور تحقیقی رسالہ ہے اور اِس کا ایک واضح مقصد ہے۔ ریاست کی ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کو ہر خطے اور علاقے کے ارباب نظر اور صاحبان ذوق تک پہنچانا۔ اگرچہ ریاست کے تمام علاقوں میں ثقافتی یگانگت و ہم رنگی کی لہر دوڑی ہوئی ہے پھر بھی مخصوص ثقافتی اکتسابات کی بدولت کشمیری، ڈوگری اور لداخی علاقوں کے اردگرد کچھ مخصوص دائرے بھی بن گئے ہیں۔ ان کے علاوہ پنجابی، پہاڑی، دری وغیرہ کو بھی آئین میں علاقائی زبانوں کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ زبانوں کے اِس رنگارنگ مجمع میں اردو ایک بین علاقائی رابطہ کا کام دیتی ہے۔ اس لیے ایک علاقے کی تخلیقات سے دوسرے علاقہ والوں کو آگاہ کرنے کے لیے شیرازہ نے بھی اردو کو ہی وسیلہ بنالیا۔ لیکن اردو اُس کا ظاہری لباس ہے۔ اصلیت میں مواد اِس لباس کے نیچے ہی ہے۔ مواد کے لیے شیرازہ، ریاست میں بولی اور سمجھی جانے والی سبھی زبانوں مثلاً فارسی، کشمیری، سنسکرت، ہندی، پنجابی، ڈوگری، لداخی وغیرہ کے ادب، ان کے ثقافتی محرکات اور علاقائی فنون و تاریخ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ شیرازہ کا عقیدہ ہے کہ ادب اور ثقافت جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں اور شیرازہ اسی مقصد کے حصول کا ایک آلہ کار۔ وہ ایسے مضامین کے ذریعے ایک زبان کو دوسری زبان کے قریب، ایک فن کو دوسرے فن کے نزدیک اور ایک علاقے کی روایات کو دوسرے علاقے کی روایات کے مستقل لانے کی لگاتار کوشش کرتا رہے گا۔

یہ ریاست جموں وکشمیر کا اپنا رسالہ ہے اور اسے اس خصوصیت پر ناز ہے۔
آپ سب کے تعاون سے ہمیں اُمید ہے کہ یہ رسالہ اپنی منفرد شان کے
اعتبار سے ہندوستان کے سبھی رسالوں میں ممتاز حیثیت قائم رکھے گا۔(61)

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اِس رسالے میں جموں وکشمیر کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ اردو ادب و شاعری اور تنقید و تحقیق پر مشتمل مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ رسالے کے پریم چند نمبر، سمپوزیم نمبر، جموں وکشمیر میں صحافت نمبر، نوجوان نمبر، لل دید نمبر وغیرہ شائع کیے ہیں۔

نوجوان نمبر اِس معاملے میں منفرد و ممتاز ہے کہ اِس خصوصی نمبر میں ریاست کے نوجوان قلمکاروں کی تصنیفات کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اکتوبر 1979 اور ستمبر 1980 میں شائع شدہ نوجوان نمبر میں مجید مضمر، پریمی رومانی، زاہد مختار، یوسف سلیم، ریاض رفاعی، محبوبہ وانی وغیرہ کی تخلیقات شامل ہیں اور یہ کہنا یہاں بے جا نہ ہوگا کہ اُس وقت کے نوجوان نمبر میں شامل یہ قلمکار آج کہنہ مشق اور ممتاز قلمکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ شمارہ محمد احمد اندرابی نے ترتیب دیا ہے۔

شیرازہ میں ہندوستانی تاریخ وتمدن اور ثقافت و ادب، فن تعمیر، آرٹ، مصوری وغیرہ موضوعات پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

کتاب: اردو رسائل کی تاریخ میں ایک اہم نام ماہنامہ کتاب لکھنؤ کا ہے۔ اس کی شروعات دسمبر 1962 میں ہوئی تھی۔ اسے عابد سہیل نے جاری کیا تھا۔اس رسالے کی مجلس مشاورت میں احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، عابد سہیل، جیسے نامور صحافی شامل تھے۔اس رسالے کا خاص نمبر بہت مقبول ہوتا تھا۔عام شمارہ 75 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا جبکہ خاص شمارے کے صفحات کی تعداد130-100 تک ہوتی تھی۔ 1973 میں تین حصوں پر مشتمل اس کا خاص نمبر شائع ہوا تھا۔ اس خاص نمبر کا تیسرا حصہ جنوری 1973 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس وقت رسالے کے مدیر شمیم الدین تھے۔ اداریے میں انھوں نے اتر پردیش سرکار کی اردو کے کاموں کے لیے تعریف وتوصیف کی ہے اور لکھا

ہے کہ یو پی سرکار نے بہت کم وقت میں اردو زبان اور ادب کی جس طرح سے آبیاری کی ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔اس خاص نمبر میں ایک اپیل شائع کی گئی تھی۔

کتاب کے قارئین اور ہمدردوں سے ایک اپیل

گذشتہ دس برسوں کی موت و زندگی کی جدوجہد میں کتاب کی کامیابی بڑی حد تک آپ کے تعاون اور مدد کی مرہون منت رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ بھی آپ کتاب کو اس سے محروم نہ رکھیں گے۔لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ رسالہ کے قارئین کی تعداد میں خاصا بڑا اضافہ کیا جائے۔ اس اضافے کے بغیر رسالہ کے مالی حالات کبھی درست نہیں ہو سکتے کیونکہ اشتہارات کا دارومدار تعداد اشاعت اور صرف تعداد اشاعت پر ہوتا ہے۔"(62)

آزادی کے بعد بڑی تعداد میں شائع ہونے والے اردو جریدوں میں ماہنامہ کتاب لکھنؤ کو ایک بے حد معیاری رسالہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اس میں ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات زیادہ شائع ہوتی تھیں۔کتاب کے لیے مستقل طور پر لکھنے والوں میں حیات اللہ انصاری، رام لعل، غیاث احمد گدی، کوثر چاند پوری جیسے افسانہ نگاروں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ کتاب میں غیر ملکی ادب کے ترجمے بھی شائع کیے جاتے تھے۔ جنوری 1973 میں میکس فانڈر گریوں کی جرمن کہانی کا ترجمہ بعنوان 'ایک بری خبر' شائع ہوا تھا، اس کے علاوہ یوسف جوہری کی مصری کہانی کا ترجمہ خواب سے حقیقت تک بھی اس میں شامل ہے۔ افسانوں کے علاوہ ماہنامہ کتاب لکھنؤ میں نظمیں، غزلیں، ڈرامے، طنز و مزاح، تبصرے وغیرہ بھی شائع ہوا کرتے تھے جو کہ ایک معیاری رسالے کے لیے ضروری ہیں۔

ماہنامہ کتاب کا ایک بہت ہی اہم کالم 'تلخ، تند، شیریں' کے عنوان سے تھا۔ جنوری 1973 کے خاص شمارے میں شفیع مشہدی نے اس کالم کے تحت اردو رسائل کے مسائل کے عنوان سے بہت ہی کارآمد باتیں لکھی ہیں:

"نئی دہلی میں چند ادیب دوستوں کی ایک غیر رسمی نشست میں اردو کے

ادبی رسائل کی مالی مشکلات کے پیش نظر ان کے مستقبل کے موضوع پر گفتگو کے دوران ایک تجویز سمجھ میں آئی جسے بغرض اشاعت میں بھیج رہا ہوں۔

ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن ہے یا تاریک، اس بحث سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے جو اقدامات کیے ہیں اور لاکھوں روپے بطور گرانٹ دیے ہیں اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آرہا ہے۔

کئی ریاستوں میں حال ہی میں اردو اکیڈمی کا قیام ہوا ہے۔ مرکزی حکومت نے ایک کثیر رقم کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کی بھی تشکیل کی ہے۔ اور انجمن ترقی اردو کو بھی حکومت سے مالی اعانت ملتی رہی ہے۔ یہ تمام انجمنیں اردو کی ترقی و بقا کے لیے کیا کررہی ہیں، یہ ایک اختلافی بحث ہے جس کے منفی ردعمل بھی ہوسکتے ہیں لہٰذا اس سے پرہیز کرتے ہوئے ہم ایک معقول تجویز سامنے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ انجمنیں اس پر غور کرسکیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان وادب کی ترقی اور بقا کا انحصار کافی حد تک اس زبان کے رسائل پر ہوتا ہے۔خصوصاً ادبی رسائل ہی کسی ادب کو وہ فورم ادا کرتے ہیں جہاں صحت مند ادبی رجحانات کی نشوونما ہوتی ہے۔ دوسرے رسائل تجارتی انداز کے یا سطحی ذوق کے ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے مالی مشکلات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔مگر خالص ادبی رسائل کو ایک محدود باشعور طبقے کی اعانت ہی مل پاتی ہے، جس کے باعث وہ اپنی کفالت کرنے سے معذور رہتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسائل بند ہوجاتے ہیں۔ یوں تو ہر باشعور شخص کا فرض یہ ہے کہ وہ ان رسائل کی حتی المقدور اعانت کرے، مگر شاید یہ چند افراد کے ہی بس کی بات ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ترقی اردو بورڈ، ریاستی اکیڈمیاں اور انجمن ترقی اردو ہند کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ادبی رسائل کو

سالانہ گرانٹ کے طور پر ایک معقول رقم دیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کے فنڈ کا اس سے بہتر استعمال ممکن نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان انجمنوں اور اکیڈمیز کے لیے ہم مندرجہ ذیل تجویز رکھنا چاہتے ہیں۔ (1) ترقی اردو بورڈ نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، اور ریاست کی اردو اکیڈمی سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اردو کے ادبی رسائل کو ایک معقول رقم سالانہ گرانٹ کے طور پر دینا منظور کریں۔(2) یہ گرانٹ صرف ادبی رسائل کو دی جائے۔ یہ گرانٹ ان ادبی رسائل کو دی جائے جو پچھلے پانچ یا تین سال سے مسلسل نکل رہے ہیں اور جو تجارتی مقصد کے لیے نہیں شائع ہو رہے ہیں بلکہ جن کا مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت ہے۔ (3) یہ گرانٹ اس وقت تک ہی دی جائے جب تک رسالے کو مالی اعانت کی ضرورت ہو اور جب تک وہ ادبی معیار کی شرائط کو پورا کرتا ہے۔(4) یہ اعانت کن رسائل کو ملنی چاہیے اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ادبا کی صف سے معتبر حضرات کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو پوری دیانت داری سے مستحق رسائل کی درخواست پر سفارش کر سکے۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک جامع تجویز بنائی ہے جس کی تفصیلات بعد میں دی جائیں گی۔ میں اس خط کے ذریعہ ارباب نظر کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ وہ اس طرف توجہ دیں اور خطوط کے ذریعے اس مطالبے کی تائید کریں تا کہ انجمنوں پر دباؤ ڈالا جا سکے کہ وہ اپنی سرد مہری و بے نیازی کو چھوڑ کر اردو کے ادبی رسائل کی طرف توجہ دیں۔ میں اپنا پتہ بھی دے رہا ہوں تا کہ کوئی صاحب مجھ سے براہ راست رابطہ قائم کرنا چاہیں تو مجھے خط لکھ سکتے ہیں۔ شفیع مشہدی C.46 قدوائی نگر، نئی دہلی۔'' (63)

ماہنامہ کتاب کی کچھ اشاعتیں

افسانہ نمبر، صفحات: 234، افسانے: 31، سالنامہ 1966 میں آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری،

فراق، محمد حسن، مجید امجد، قاضی عبدالستار وغیرہ کی تخلیقات شامل ہیں۔ سالنامہ 1967 میں شاعری پر ایک پر مغز سمپوزیم شائع کیا گیا ہے جس میں برصغیر کے اہم نقادوں اور شاعروں نے حصہ لیا تھا۔ منتخب افسانہ نمبر، نئی ہندی کہانی نمبر، علی عباس حسینی نمبر، مراٹھی کہانی نمبر جیسے عظیم خصوصی شماروں کے لیے کتاب کو یاد کیا جاتا ہے۔ اس رسالے نے ترقی پسندی کو ایک نئی سمت دی اور شاعروں، ادیبوں کی ایک بڑی تعداد کتاب کے توسط سے منظر عام پر آئی۔ جو بعد میں اردو ادب کے افق پر آفتاب و ماہتاب کی مانند جلوہ گر ہوئے۔

ماہنامہ کتاب کے جون 1973 اور شمارہ نمبر 116 کے اداریے میں مدیر نے جو باتیں لکھی ہیں وہ اردو رسائل کی صورتحال اور ان کی بے بسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

> ''بیشتر تخلیقات کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن border line cases کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ انھیں قبول کیا جائے تو کس معیار پر اور مسترد کیا جائے تو کس معیار پر؟ کتاب کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایسی تخلیقات تو بہر حال شائع کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی چیزیں بھی جن میں کوئی اچھوتا پن ہو، زندگی کو کسی نئے زاویے سے دیکھا گیا ہو، چاہے وہ سارتر کی طرح پیرس کے کسی مخصوص کیفے کی کسی مخصوص سیٹ کے پاس کسی مخصوص کھڑکی سے باہر نظر آنے والی دنیا ہی کیوں نہ ہو شائع کر دی جاتی ہیں۔ بس تحریر کی تازگی، وسیع معنوں میں زندگی سے اس کا تعلق اور زبان و بیان کے بنیادی ڈھانچے کا کم از کم احترام ضروری ہے۔ موخرالذکر عنصر کی کمیوں کو ادارہ خود بھی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، بشرطیکہ اول الذکر چیزیں کسی تخلیق میں موجود ہوں۔ اس سب کے باوجود مدیر کتاب بھی کسی بھی دوسرے جریدے کے مدیر کی طرح اقربا پروری، دوست نوازی، گروپ بازی اور جانب داری کے الزام سے بھلا کیسے بچ سکتا ہے۔'' (64)

ماہنامہ کتاب ایک ایسے وقت میں نکالا گیا تھا جب ترقی پسندی اور جدیدیت کے

رجحانات بہت عام ہو چکے تھے اور اردو ادب دوصفوں میں تقسیم ہو چکا تھا، ماہنامہ کتاب نے ایسی صورتِ حال میں دونوں مکتبۂ فکر کو اپنے صفحات میں جگہ دے کر ایک نئی مثال قائم کی اور ماہنامہ کتاب کو ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان فاصلہ کم کرنے کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''اس پرچے نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی آویزش کو کم کرنے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ اس دور میں جب ان دونوں رجحانات کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھا جاتا تھا کتاب کے صفحات دونوں کے لیے فراخدلی سے کھلے تھے۔ اس کی خصوصی اشاعتوں میں افسانہ نمبر اور سالنامے قابل ذکر ہیں، افسوس کہ سو شمارے نکال کر عابد سہیل کی ہمت جواب دے گئی۔ بہر حال اس پرچے نے ادبی تاریخ کے ایک خاص موڑ پر بے حد اہم کردار ادا کیا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔'' (65)

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مظفر حنفی نے کتاب کے صرف سو شماروں کے بارے میں لکھا ہے جبکہ ماہنامہ کتاب کے 125 سے زیادہ شمارے شائع ہوئے تھے۔ شمارہ نمبر 116 کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کا شمارہ نمبر 120 بھی میری نظر سے گزرا ہے جس میں کوثر چاند پوری، انور خاں، جمیل احسن شاہجہاں پوری، اکھلیش انجم، کے افسانے اور ڈاکٹر وحید اختر کا ایک طویل مقالہ بعنوان آگ کا دریا۔ وجودیت کے اثرات بھی شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ سلام مچھلی شہری، شہریار، شاہد ماہلی، انور مسعود، شمیم انور، ظہیر غازی پوری، اختر علیم، کرشن کمار وغیرہ کی شعری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔

شب خون: ہندوستان کی آزادی کے بعد جن اہم رسائل نے اردو ادب میں نئی تحریکوں اور نئی اقدار کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں رسالہ شب خون سرفہرست ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے سانحہ کے بعد جب ترقی پسندی کا زور ٹوٹنے لگا تھا تو برصغیر کے لوگوں میں ایک عجیب سی بے چینی اور بے حسی پیدا ہونے لگی تھی انسانیت رحم دلی، مذہب سے لوگوں کا اعتبار ختم ہونے لگا تھا۔ لوگوں نے لگاتار یہ تیسری بڑی تباہی دیکھی

تھی۔ پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم اور پھر ہندوستان کی آزادی اور تقسیم یہ تینوں اتنے بڑے سانحے تھے جس نے پوری انسانی تاریخ کو ہلا کر رکھ دیا۔ خاص طور سے ہندوستان کے بٹوارے نے اردو ادب پر کئی نمایاں اثرات مرتب کیے۔ جہاں زندگی کے سبھی شعبے متاثر ہوئے وہیں ان سارے واقعات کا اثر ادب اور صحافت پر بھی پڑا۔ ہندوستان کی تقسیم اور ادب پر اس کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے منظر اعظمی لکھتے ہیں:

> ''تقسیم ہند کے خونیں واقعات میں ڈوب کر جب نئی نسل ابھری تو مذہبیت اور انسانیت پر سے اس کا اعتبار متزلزل ہو گیا تھا۔ سائنسی ترقیوں اور صنعتی ماحول نے ایک طرف تو مشینی آسائشیں مہیا کیں تو دوسری طرف مہلک تباہ کن اور زہریلے ہتھیاروں کے بھیانک انجام نے اسے اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کر دیا۔ مزید یہ کہ ہندوستانی سماج کی نفسانی اور معاشی اور جنسی گھٹن کی فضا میں اس نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا۔ ادب میں اجتماعیت کے تصور کی افادیت میں اس کا شک بڑھتا گیا اس نے مذہبی، سماجی اور اخلاقی اقدار کی شکست وریخت کا نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ اس کے زہر کو اپنے رگ وپے میں اتار لیا۔ اور چونکہ نظریہ، عقیدہ، نصب العین، آدرش، وابستگی اور نئی صبح کی بشارتوں اور خوابوں کا طلسم بکھر رہا تھا اس لیے کسی طے شدہ فنی راستے پر اس کا چلنا ممکن نہ رہا۔ اس لیے اس نے ادبی اجتماعیت پسندی اور کسی طے شدہ فنی راستے سے وابستگی اور وفاداری کو یکسر رد کر دیا۔'' (66)

ادب اور زندگی کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں رہے، اس لیے زندگی کے مختلف نشیب وفراز کا اثر ادب پر پڑنا ضروری تھا اور ادب کبھی صحافت سے الگ نہیں رہا۔ ہم ادب اور صحافت کے درمیان کوئی واضح فرق نہیں ثابت کر سکتے۔ ادب میں جہاں نئے تجربے شروع ہوئے وہاں ادب کے ساتھ ساتھ صحافت میں بھی جدیدیت کے اثرات صاف اور واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ ترقی پسندی کے دور میں ایک ہی جیسے موضوعات

کی شاعری اورنگارشات سے لوگ اب باہر نکلنا چاہتے تھے اور ایسے ہی وقت میں جدیدیت کی شروعات ہوتی ہے۔ جدیدیت کی شروعات کا سہرا شمس الرحمٰن فاروقی کے سر بندھتا ہے۔ انھوں نے الہ آباد سے اپنا رسالہ شب خون جون 1966 میں شروع کیا۔ شب خون کی ترتیب وتدوین شمس الرحمٰن فاروقی ہی کر رہے تھے۔ لیکن اس کے مدیروں میں مختلف لوگوں کے نام شائع ہوتے رہے۔ شب خون کے پہلے شمارے میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا نام بطور مدیر شائع ہوا ہے۔ سرورق پر شمارے میں شائع ہونے والے قلم کاروں کے نام شائع ہوئے، جن میں پہلا نام پروفیسر سید احتشام حسین کا ہے۔ ان کے علاوہ فراق گورکھپوری، حبیب احمد صدیقی، اپندر ناتھ اشک، رام لعل، خلیل الرحمٰن اعظمی، مسیح الزماں، سلیمان اریب، عمیق حنفی دوسرے قلم کار ہیں جن کی تخلیقات شمارے میں شائع کی گئی تھیں۔ شب خون کے پہلے شمارے کے اداریے 'کچھ باتیں' میں مدیر شب خون کی غرض وغایت اور مقاصد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں علمی وادبی رسالوں کی تعداد بہت کم ہوتی جارہی ہے۔ گنتی کے چند ایسے جریدے رہ گئے ہیں جو چراغ راہ بن کر راہ ادب کو روشن کرنے کی کوشش کررہے ہیں مگر تعداد کی کمی اور روشنی کا فقدان ان دونوں وجوہ سے بھی بہت ناکافی ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف ان ہی لوگوں پر نہیں جو اردوزبان سے بیگانگی برتنے میں فخرمحسوس کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں پر بھی ہے جو اپنے کو اردو دوست سمجھتے اور کہتے ہیں اس لیے کہ کوئی ادبی تنظیم ایسی نہیں جو تمام بکھرے ہوئے دانوں کو ایک رشتہ میں پرودے، مختلف ومتعدد اہل فکر کے افکار ومحسوسات کو ایک اچھی صورت میں منظر عام پر لاسکے، پرانے لکھنے والوں کی اچھی تخلیقات، چھاپے اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرے، یہ کمی اردودوستوں کے ہر دیار میں محسوس کی جارہی ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ الہ آباد کے کچھ باہمت ادیبوں اور ادب دوستوں نے یہ ماہنامہ نکالنے کی فکر کی۔ نوجوان اور

> جوانوں کی اس مختصر محفل میں دوایک بوڑھے بھی شریک کیے گئے جن سے رہنمائی ومزید تعاون کی درخواست کی گئی۔ بوڑھوں نے بھی لبیک کہا مگر احساس وعمل کی منزل میں جو چیز سب سے زیادہ سدراہ تھی وہ وہی تھی جس کو دنیا نے ستارعیوب وقاضی الحاجات سمجھا ہے۔ اپنے اپنے طور پر سبھی اس مرحلے کو طے کرنے کے طریقے پر غور کررہے تھے، مگر باوجود خلوص وفکر کے مالی دقت کی مہم سر ہوتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ ارباب علم وفن کی اس کشمکش کو دور کرنے کے لیے جمیل فاروقی (پرنسپل قدوائی گرلز کالج) الہ آباد نے اپنی آواز بلند کی۔ نہایت متین وحوصلہ افزا لہجہ میں اطمینان دلایا کہ اگر صرف روپیہ کی کمی سے یہ کارخیر رک رہا ہے تو آپ لوگ اس کی فکر میں وقت نہ ضائع کریں اس کا انتظام ہوجائے گا۔ چنانچہ اسے آواز غیب سمجھ کر کشتی منجدھار میں ڈالی جارہی ہے۔'' (67)

پہلاشمارہ منظرعام پر آنے کے بعد اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے کالموں میں فروغ فکر، صہبائے آبگینہ گداز، زمانہ بڑے شوق سے سن رہاہے۔ قصہ جدید وقدیم، کہتی ہے خلق خدا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعد میں ان میں سوانحی گوشے، اورادبی خبروں پر مبنی کالم اخبار واذکار کااضافہ ہوگیا۔ فروغ فکر کے تحت تنقیدی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ شب خون کے دوسرے شمارے میں فروغ فکر کے تحت ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر سید محمد عقیل، محمد احمد فاروقی اورشمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ صہبائے آبگینہ گداز کے تحت شعری نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ شب خون کے دوسرے شمارے میں فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، جمیل مظہری، شہریار، عمیق حنفی، یعقوب عثمانی وغیرہ کی شعری تخلیقات شامل اشاعت ہوئی ہیں۔ زمانہ بڑے شوق سے سن رہاہے کالم کے تحت افسانے شائع کیے جاتے تھے۔ شب خون کے دوسرے شمارے جولائی 1966 میں راجندرسنگھ بیدی، رفیعہ منظورالامین، واجدہ تبسم کے افسانے ہیں۔ ان کے علاوہ جان کالیر، پی پرم راجو اور جارج لوئی بورہس کی کہانیوں کے اردوترجمے بھی شائع کیے گئے ہیں قصہ قدیم وجدید کے

تحت کتابوں پر تبصرے اور شعری سرگرمیوں پر مبنی خبریں پیش کی جاتی تھیں۔ کہتی ہے خلق خدا، کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کیے جاتے تھے۔

شب خون کے لیے تشکیل دی گئی مجلس عاملہ میں شمس الرحمٰن فاروقی، جمیلہ فاروقی (بیگم شمس الرحمٰن فاروقی) ترتیب وتزئین، ڈاکٹر سید اعجاز حسین (مدیر) جعفر رضا (نائب مدیر) اور پروفیسر احتشام حسین وغیرہ شامل تھے۔ شب خون کے اولین شماروں کے مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین، نائب مدیر جعفر رضا، ناشر، سید رشید قادر، مشیر اعزازی گردھر بھارگر تھے۔ شب خون کے پہلے شمارے کی قیمت ایک روپے اور سالانہ دس روپے تھی شب خون کے پہلے شمارے کے اداریے میں رسالے کا نام شب خون تجویز کرنے کے تعلق سے بھی ڈاکٹر اعجاز حسین نے تحریر کیا ہے۔ شب خون کا پہلا نام تیشہ تجویز ہوا تھا لیکن بعد میں متفقہ فیصلے سے شب خون پر اتفاق رائے ہوا۔ شب خون جدیدیت کی تحریک کے زیراثر شروع کیا گیا تھا اور ہندوستان میں زیادہ تر تحریکیں مغربی ادب سے مستعار لی گئی ہیں۔ شب خون کے اجرا کی تقریب بھی بہت شاندار طریقے سے منعقد کی گئی تھی۔ اس تقریب پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید اعجاز حسین شب خون کے دوسرے شمارے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ’’بہر حال تاریک فضا میں ایک جگنو نظر آیا۔ شب خون منظر عام پر آ گیا۔ اجرا کی رسم افتتاح کے سلسلہ میں 19 اپریل کو ایک ایسا جشن منایا گیا جس جشن کی مثال کم ازکم الہ آباد کی ادبی دنیا میں مشکل سے ملے گی، دانش وروں کے ہجوم میں مختلف زبانوں کے نمائندے شریک تھے، ہندی، انگریزی، بنگلہ، اردو فارسی، عربی، فرانسیسی زبانوں کے جاننے والے گزدر ریستوران کے پرفضا وخوبصورت سبزہ زار پر رسالے کا استقبال کرنے میں سرگرم تھے۔ جہاں تک ہم کو یاد ہے الہ آباد کے مشہور سول لائن کے اس دلکش لان پر اس سے پہلے کوئی علمی وادبی جلسہ اس اہتمام سے کبھی نہیں ہوا تھا۔ الہ آباد میں تین سو سے زیادہ اہل علم کا ایک رسالہ کے خیر مقدم کو جمع ہونا آسان بات نہ تھی۔ صرف اجتماع ایسی بڑی بات نہ تھی، ہر شخص کی رسالہ کی

اشاعت وکامیابی کی فکر وخواہش نے ادارہ کو امید افزا فضا میں سانس لینے کا موقع دیا۔

ہندوستان کے مایہ ناز نہرو خاندان کے چشم وچراغ رتن کمار نہرو صاحب (وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی) نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ اردو کے مشہور ومعروف شاعر فراق گورکھپوری نے خیر مقدم کے لیے لب کشائی کی۔ ملک کے مایہ ناز نقاد پروفیسر احتشام حسین نے صدر کا تعارف کراتے وقت ان کی ہمہ گیر شخصیت اوران معلومات کا ذکر کیا جو موصوف کو دنیا کے مختلف ومتعدد مقامات کی زبان دوست نامور ہستیوں سے حاصل ہوئی ہیں۔ صدر کی بیگم صاحبہ نے رسالہ کی ابتدائی کامیابی پر اپنی دعاؤں کے ساتھ ادارہ کو مبارکباد دی۔ مدیر رسالہ شب خون نے صدر کو پہلا شمارہ نذر کرتے ہوئے رسالہ کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی، ساتھ ہی ساتھ جمیلہ فاروقی کی کامیابی پر ان کو مبارکباد پیش کی۔

پرچے کا پہلا شمارہ انگریزی محاورہ گرم کیک کی طرح ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اب ہم دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کے امکانات پر غور کررہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمت افزائی اور دلچسپی ان قنوطیوں کے دعوؤں کا ابطال کرتی ہے جن کے خیال کے مطابق آج کی ادبی فضا اس قدر مسموم ہوچکی ہے کہ اس میں کسی سنجیدہ اردو ادبی پرچہ کا سانس لینا ممکن نہیں۔'' (68)

جدیدیت پر یوں تو عام طور سے الزامات عائد کیے جاتے ہیں کہ اس میں انسان کی بے بسی، تنہائی، مایوسی اور ناکامی کی باتیں کی گئی ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل درست بھی نہیں ہے۔ اس میں انسانی محبت کی داستان بھی ہے اس میں غیر ضروری تحریکوں، رجحانات سے اجتناب برتا گیا ہے۔ زندگی کو اپنی مرضی سے گزارنے کا مقصد اورواضح اشارہ بھی ہے۔ انسانی نفسیات کے حقائق کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ شب خون کو جدیدیت کا علمبردار کہا جاتا ہے لیکن اس پرچے کے اولین شماروں سے ہی ترقی پسند قلمکاروں، احتشام حسین، محمد حسن،

فراق گورکھپوری جیسے متعدد قابل قدر ادیبوں اور شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے مکتبہ فکر کے ادیب اور نئے لکھنے والے بھی شب خون کے سفر میں ساتھ رہے ہیں۔ شب خون کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ یہ عام ادبی مجلوں سے منفرد اور ممتاز تھا عام مجلوں میں جہاں روز مرہ زندگی اور ایک جیسے ادب کی باتیں کی جاتی تھیں۔ وہیں شب خون میں ان چیزوں کے ساتھ ساتھ عالمی ادب اور غیر ملکی ادب کا خاصا مواد دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ مجلّہ بھی مغربی طرز کا تھا۔ اردو زبان اورصحافت میں اس نئے تجربے کو ہاتھوں ہاتھ قبول کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شب خون نے بہت جلد اپنا الگ ادبی حلقہ قائم کرلیا۔ شب خون ایسے وقت میں ادبی افق پرجلوہ گر ہوا تھا جب ہندوستان میں ادب کے تئیں لوگوں کا رویہ تبدیل ہونے لگا تھا۔ ہندوستان میں ادبی رسائل بھی اس وقت بہت کم تعداد میں نکل رہے تھے ادبی رسائل کے نام پر آجکل، شاعر، نیادور، سب رس، کتاب، سوغات، کتاب نما جیسے رسائل کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں کچھ رسائل کی پہنچ محض ایک ادبی حلقے تک ہی محدود تھی۔ باقی جو دوسرے رسائل تھے ان میں وہی ایک جیسی چیزیں پڑھ کر لوگوں میں بوریت کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسے دور میں شب خون نے ادبی حلقے کو ایک نئے اور جدید رویے سے روشناس کرایا اور ہندوستان کے اردو ادب اور ہندوستان کی اردوصحافت میں جیسے ایک نئی رفتار آ گئی۔

خورشید الاسلام اپنی کتاب 'اردو ادب آزادی کے بعد'' میں جدیدیت اور شب خون پرتبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دراصل اس وقت ہندوستان میں ادبی رسائل کا قحط سا تھا۔ اس کمی کو شب خون کی اشاعت نے پورا کیا۔ شب خون ساتویں دہے کے وسط میں جاری ہوا۔ رسالے نے جدید تر رجحانات کی ترویج واشاعت کو بہت بڑھاوادیا اور نئے لکھنے والوں کاایک خاصا بڑا گروہ اسی رسالے کے ذریعے سامنے آیا۔ اس رسالے کے ذریعے جن شعرا نے اہمیت حاصل کی ان میں عمیق حنفی کوخصوصیت حاصل ہے۔ ان کی شہرت کا آغاز اس بحث

سے ہوا جو شب خون کے صفحات پر ان کے اور احتشام حسین کے درمیان کئی ماہ تک چلتی رہی۔'' (69)

شب خون کا سفر، شمارہ ایک سے لے کر شمارہ 299 پر محیط ہے۔ 293 سے 299 تک کا شمارہ مشترکہ شائع ہوا تھا۔ یہ ضخیم شمارہ جون تادسمبر 2005 کا تھا اور شب خون کا آخری شمارہ تھا۔ اس شمارے میں شب خون کی 40 سال کی زندگی کے نشیب وفراز اور 40 سالہ سفر کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ شب خون کا جس شاندار ڈھنگ سے اجرا ہوا تھا اسی طرح اس رسالے کا آخری شمارہ بھی ایک دستاویز ی حیثیت رکھتا ہے اور اس سفر کے آخری پڑاؤ پر اس ضخیم شمارے سے گذشتہ 40 سال کی ایک واضح تصویر سامنے آجا تی ہے۔ شب خون نے آغاز سے اختتام تک اپنا منفر د معیار قائم رکھا۔ شب خون کا ہرشمارہ اپنے آپ میں مکمل اور معیاری ہوتا تھا۔ شب خون نے ایک بھی خاص نمبر نہیں شائع کیا ہے لیکن اس کا ہرشمارہ خاص نمبر کی اہمیت رکھتا ہے۔ شب خون کی فائلوں کے مطالعے سے ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ایک ہی قلم کار کی تخلیقات یا نگارشات کو لگا تار شائع کرنے سے اجتناب برتا گیا ہے قاری کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے ہر مہینے نئے قلم کاروں کو بھی جگہ دی جاتی رہی ہے۔ شب خون کے ادبی مباحثوں کو ہمیشہ یادرکھاجائے گا۔ شب خون کے ذریعہ شمس الرحمٰن فاروقی نے تن تنہا اپنی ساری کوششیں صرف کردیں۔ حکومت ہند کے اعلیٰ عہدے پر رہتے ہوئے بھی انھوں نے اس کے لیے کافی وقت نکالا اور ریٹائر منٹ کے بعد پورا وقت اس ادبی رسالے کی آبیاری میں گزارا۔ جناب فاروق ارگلی لکھتے ہیں:

انڈین پوسٹل سروس کی مصروف ترین ملازمت کے ساتھ اتنے سارے کارنامے انجام دینا اور علم وادب کی دنیا میں اپنی شخصیت کو لافانی بنالینا فاروقی صاحب کی کرشمائی شخصیت کا کمال ہے۔ دنیا ئے ادب انگشت بدنداں ہے کہ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے شب خون جیسا عہد ساز اور طاقتور رسالہ جاری کیا جس کے ذریعے انھوں نے جدیدیت کی اس شدت سے تبلیغ کی کہ پورے ایک دور کو بدل کر رکھ دیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے برپا کردہ انقلاب نے تخلیق وتصنیف کے دھارے موڑ دیے۔ انھوں نے سرمایہ ومحنت کی کشمکش کے اشتراکی رجحان کے خلاف آواز بلند کی جس کی مادیت اورنظریات جبر نے ان کے خیال میں تخلیقی ادب کو خطابت اور صحافت بنادیا تھا۔ انھوں نے اردو میں علامتی،ایمائی، اورتجریدی تخلیقی رجحان کوفروغ دیا جس میں غزل چیستاں بن گئی اورافسانے سے کہانی غائب ہوگئی۔اس کے لیےشمس الرحمٰن فاروقی پر ایک مخصوص نظریاتی طبقہ توڑ پھوڑ اور ادبی تخریب کاری کاالزام بھی عائد کرتا ہےلیکن یہ الزام اگرصحیح بھی ہے تو بھی فاروقی کی جدیدیت پسندی اورشب خون کی اہمیت پرحرف نہیں آتا بلکہ یہ اس تخریب کے بعد ایک نئی تعمیر کے آغاز میں ان کے قائدانہ کردار کی تاریخی علامت ہے۔شب خون نے بہت سے نئے قلم کار دیے۔ان جدید قلم کاروں نے کہانیوں کے بغیر جو کہانیاں لکھیں انھیں کہانی کا نام نہ دے کر بے نام ادبی صنف کے نام سے ہی کیوں نہ یاد کیاجائے لیکن یہ تبدیلی کے عبوری دور کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔‘‘(70)

فاروق ارگلی کی مندرجہ بالا باتیں یقیناً درست ہیں۔ انھوں نے نہایت صاف اور سیدھے لہجے میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ فاروقی سے شب خون کو الگ بھی کردیں تب بھی شمس الرحمٰن فاروقی کے ادب میں اتنے کارنامے ہیں جن کے بغیر اردو کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ یوں تو پاکستان میں تقسیم کے کچھ برسوں کے بعد ہی جدید شاعری اور افسانوں کی شروعات ہوچکی تھی۔لیکن ہندوستان میں جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے کا سہرا شمس الرحمٰن فاروقی ہی کے سرجاتا ہے۔ 1966 میں ہی ہندوستان میں جدیدیت کو باضابطہ طور سے منظّم سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ شب خون سے قبل کتاب اور سوغات بھی اس تحریک کے پیش رو تھے لیکن شب خون کی اشاعت نے ان رسائل کی کوششوں کو ایک نئی سمت دی، ایک نئی مضبوطی دی اور انتہاپسندانہ جدیدتر رجحانات کوفروغ

دینے میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔ شب خون کے صفحات پر شائع کیے گئے شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصروں کی اپنی الگ ادبی اہمیت ہے ان کے تبصروں میں جو صاف گوئی، جو گہرائی اور جو تنقیدی عنصر دکھائی دیتا ہے وہ اس دور کے دوسرے تبصروں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ وحید اختر لکھتے ہیں:

> ''پاکستان میں تو 1960 سے پہلے ہی جدید تر میلانات اپنی جگہ بنا چکے تھے لیکن ہندوستان میں انھیں شب خون کے اجرا نے عام کیا۔ 1960 کے بعد جو نئی نسل ابھری اسے ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند سیاسی سماجی نظریات سے کوئی ہمدردی نہ تھی... شب خون کے صفحات پر ساتویں دہائی کے وسط میں ادب کے متعلق ایک نئی بحث چھڑی جس کے فریق تھے احتشام حسین اور عمیق حنفی.. 1960 کے بعد جو انتہا پسندانہ جدید میلانات مقبول ہوئے ان کی تشہیر میں شب خون کو خاص اہمیت حاصل ہے... شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون کے ذریعے اپنی اہمیت منوائی۔ ان کے تبصروں میں جو بے باکی، معروضیت، بے مروتی اور صاف گوئی ہے اس نے اردو میں رسمی تبصروں کے برخلاف ایک صحت مند روایت کو آگے بڑھایا۔''(71)

انھوں نے تبصروں کو ایک اہم تنقیدی صنف میں شامل کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ شب خون کے بند کرنے کا اعلان اور آخری شمارے کے اعلان کے بعد بڑی تعداد میں برصغیر کے اہم افراد نے شب خون کے بند ہونے پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور ہر ممکن کوشش کی کہ یہ رسالہ بند نہ ہو۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی خرابِ صحت کی وجہ سے شب خون کو بند کرکے جدیدیت کی روح کہے جانے والے اس رسالے کا سفر تمام کردیا۔ ادبی شمارے آج بھی بڑی تعداد میں نکل رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے تمام شہروں سے ادبی رسائل شائع ہورہے ہیں۔ لیکن شب خون جیسا عہدساز اور منفرد رسالہ شاید دوبارہ نہ شائع ہو۔ اس کے قاری ہمیشہ اس کی کمی محسوس کرتے رہیں گے۔ یہ ایسا واحد رسالہ تھا جس میں اردو کے ساتھ یکساں طور پر مغربی ادب پر بھی مواد شائع کیا جاتا تھا اور اس منفرد اور تاریخی

رسالے کی ضرورت اور کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔

گفتگو: سہ ماہی گفتگو کا پہلا شمارہ 1967 میں شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو اداریہ:

> یہ گفتگو کا پہلا شمارہ ہے۔ اِس میں گفتگو تخلیقی سطح پر ہے۔ پرانی سے پرانی صنف رباعی اور غزل، نئی سے نئی صنف، اکھڑے اکھڑے لہجے اور کھردری لفظی تحریروں کی آزاد نظمیں، طویل افسانے اور مختصر افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مضامین، سماجی اور سیاسی موضوعات اور محض داخلی سرگوشی، ہرجائی انداز اور پسپا ہوجانے کی کیفیت، غرض سب ایک دوسرے سے مصروف گفتگو ہیں۔ یہ خاموش گفتگو اوراق پر سنی جائے گی اور قاری اِس میں شریک ہے۔
>
> ایسے مضامین اور خطوط کی اشاعت سے احتراز کیا گیا ہے جن کا انداز معاندانہ، منہ چڑانے اور گالی بکنے کی خو کی تسکین کا سامان تھا۔
>
> ممکن ہے کہ اِس کی وجہ سے پیش نظر اشاعت میں چٹخارے کی کمی نظر آئے لیکن اپنے ادبی اور نظریاتی اختلافات کو باقی رکھتے ہوئے اور اپنے نقطۂ نگاہ پر اصرار کرتے ہوئے ایک ادبی سنجیدگی اور علمی وقار برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔(72)

گفتگو کے پہلے شمارے میں فراق ومخدوم پر مضامین شائع ہوئے ہیں۔آخر شب کے ہم سفر ناول کی پہلی قسط بھی ہے۔

ظ انصاری، جگن ناتھ آزاد، قمر رئیس، ساحر لدھیانوی، فیض، راہی معصوم رضا، ن م راشد، ندا فاضلی، قاضی عبدالستار، کرشن چندر، احتشام حسین، سجاد ظہیر، اختر الایمان وغیرہ کی تحریروں کے علاوہ غیرملکی ادیبوں کی تخلیقات کے تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ شمارے میں سردار جعفری نے اِس بات پر خصوصی توجہ دی ہے کہ رسالہ دیگر رسالوں سے منفرد ہو اور قاری کو بھرپور دلچسپ مواد ملے ۔اس کے دوسرے شمارے میں سردار جعفری، رسالے کے اداریے، پیش گفتار کے تحت لکھتے ہیں:

”اردو کے اور رسائل کی طرح گفتگو بھی فقیرانہ انداز سے نکلا ہے۔ اس میں کام کرنے والوں نے ادب اور زبان کی خدمت کو ایک مشن بنا کر کام کیا ہے۔ اس کے قلمی معاونین کے دلوں میں یہی شعلہ روشن ہے جن میں ترقی پسند اور غیرترقی پسند رجعت پرست نہیں) پرانے اور نئے ہر طرح کے ادیب شامل ہیں۔گفتگو کا ایک حلقہ احباب بھی ہے جو ادیبوں، دانشوروں اور فنکاروں پر مشتمل ہے۔ وہ قلمی تعاون کے ساتھ ساتھ ملی امداد بھی کرتے ہیں۔ابتدائی سرمایہ انھوں نے اپنی جیب سے فراہم کیا ہے۔ (73)

اسی شمارے میں تیسرے شمارے کی جھلک بھی پیش کی گئی ہے جس میں دیوندر اسر، جوش ملیح آبادی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، عصمت چغتائی ، خواجہ احمد عباس، سلمیٰ صدیقی، جیلانی بانو،رشید حسن خاں وغیرہ کی تحریریں شائع کی گئی تھیں۔اس شمارے کے آخر میں کافی سارے اشتہارات بھی شائع ہوئے تھے۔

گفتگو محض ایک رسالہ نہ ہوکر تحریک تھا۔ سردار جعفری نے اِس رسالے سے اپنی صحافتی خدمات کا لوہا منوایا۔ ترقی پسندی کی حمایت میں شائع ہونے والا یہ رسالہ ان معنوں میں قابل ذکر ہے کہ اِس میں ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ جدید رجحان سے متاثر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات بھی شامل اشاعت ہوتی رہی ہیں۔ رسالے کا ایک خاص کالم مشاہیر سے ملاقات تھا جس میں اہم مشاہیر کے انٹرویو شائع ہوتے تھے۔ پیش گفتار کے تحت اداریہ شائع ہوتا تھا۔قرۃ العین حیدر کا ناول قسط وار شائع ہوا ہے ۔شمارے میں ناول، غزلیں،نظمیں، افسانے، خبریں غیرملکی ادب کے تراجم وغیرہ شائع ہوتے تھے۔تبصرے بھی شامل اشاعت ہوئے ہیں۔رسالے کے آغاز سے ہی اس میں ترقی پسندی اور جدیدیت پر اہتنراز آمیز مضامین شائع ہوئے ہیں۔گفتگو کا غزل نمبر خاصا مقبول ہوا تھا۔

شعر وحکمت: اس علمی ادبی اورتہذیبی مجلّے کے پہلے دور کا آغاز 1970 میں ہوتا ہے۔شعر وحکمت کا پہلا شمارہ جنوری 1970 میں منظر عام پر آیا تھا۔ پہلے دور میں1970 سے 1975 تک شائع ہوا۔ شروع میں اس رسالے میں شاعری پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی لیکن بعد میں فکشن پر مبنی

مضامین بھی شائع ہونے لگے۔شعر وحکمت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ناظم علی اپنی کتاب 'حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد' میں لکھتے ہیں:

''یہ ادارہ شعر وحکمت کا ترجمان تھا۔یہ رسالہ 1970 سے1975 تک نکلتا رہا۔ شروع میں اس میں شاعری کی تنقید پر مبنی مضامین شائع کیے جاتے رہے لیکن بعد میں افسانے بھی شائع کیے جانے لگے۔اردو میں جدیدیت کو فروغ دینے میں اس رسالے نے اہم کردار ادا کیا۔ہندوستان و پاکستان کے تمام نئے لکھنے والوں کا اس کو تعاون حاصل تھا۔'' (74)

شہر یار جتنے عظیم شاعر تھے اتنے ہی اچھے صحافی بھی رہے۔ انھوں نے مغنی تبسم کے ساتھ مل کر اس رسالے کی شروعات کی اور ایک معیاری ادبی صحافت کا نمونہ پیش کیا۔ اس جریدے میں ترقی پسند، جدید اور ما بعد جدید تحریکوں اور رجحانات سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ سہ ماہی شعر وحکمت کا ہر شمارہ خصوصی نمبر ہوتا تھا۔شعر وحکمت میں ترتیب وتزئین پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔شعر وحکمت نے ن م راشد پر خصوصی نمبر اور عشرت آفرین، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ پر خصوصی گوشے شائع کیے ہیں۔

علمی ادبی اور تہذیبی مجلّے شعر وحکمت کے دور دوم کا آغاز 1987 میں ہوتا ہے۔ 1987 کے شمارے میں اِس کے مرتبین شہر یار اور مغنی تبسم ہی ہیں۔ معاونین میں شفیق فاطمہ شعریٰ، علی ظہیر کے نام ہیں۔ ایڈیٹر کے طور پر اختر جہاں کا نام لکھا ہے۔شمارے میں میراجی پر خصوصی گوشہ شامل ہے۔حرف آغاز کے تحت شعر وحکمت کی اشاعت کے تعلق سے مدیر لکھتے ہیں:

''آج سے چند برس پہلے شعر وحکمت کا اجراعمل میں آیا تھا۔ اِس کے سات شمارے شائع ہوئے۔ ناگزیر وجوہات سے اسے بند کردینا پڑا۔لیکن جنون اور عشق اپنی جگہ سلامت رہے۔ اب ہم ایک نئے حوصلے اور امنگ کے ساتھ اِس کا احیا کررہے ہیں۔ سبب یہ بھی ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں ادب دوست قاری شعر وحکمت کو بھولے نہیں تھے۔ اِس کی کمی شدت

> سے محسوس کر رہے تھے۔ انھیں کے تقاضوں اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ ہم
> دوبارہ اِس کارزیاں پر معمور ہوئے ہیں کہ ادب کے واسطے زندگی میں معنویت
> پیدا کریں۔'' (75)

شعر وحکمت میں نظریاتی اختلافات کے باوجود کئی اہم مضامین وتخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ ادب میں تنوع اور وسعت کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے شہریار اور مغنی تبسم نے اِس اہم رسالے کی وقعت اور ادبی اہمیت پر خاصی توجہ دی ہے اور اِس رسالے کے ہر شمارے کو ایک دستاویزی شمارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے یہ رسالہ تمام ادبی رسالوں پر سبقت لیے ہوئے ہے۔ اِس کا ہر شمارہ ایک خصوصی نمبر نظر آتا ہے۔

شعر وحکمت نے نئی اور عصری شاعری پر زیادہ توجہ دی ہے۔ جدید تر شاعروں، ہم عصر تنقید و ہم عصر ادب پر شعر وحکمت نے نہایت علمی وتحقیقی مضامین شائع کیے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر وحکمت کے پہلے شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مشمولات کے اعتبار سے پرچہ درجہ اول کی چیز ہے۔ اداریہ بہت عمدہ ہے۔ پرچہ پڑھے لکھے آدمیوں کا معلوم ہوتا ہے۔ (76)

شعر وحکمت جدید شاعری کی تشریح وتعمیر کے لیے وقف کیا گیا تھا۔عمیق حنفی، بلراج کومل، منیر نیازی، شاذ تمکنت، اختر الایمان، شمیم حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد علوی، صادق، مصحف اقبال توصیفی، خورشید جامی، ظفر اقبال، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کی تحریریں تواتر سے شائع ہوتی رہی ہیں۔

عصری ادب: معروف ترقی پسند رسالے عصری ادب کی شروعات جنوری 1970 میں ہوئی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے ترجمان اس سہ ماہی رسالے کو معروف تنقید نگار محمد حسن نے جاری کیا تھا۔عصری ادب میں مدیر کی جگہ سید بہاء الدین کا نام شائع ہوتا تھا جبکہ یہ رسالہ محمد حسن کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔1972 کے تیسرے شمارے کا اداریہ ملاحظہ ہو جس سے اس کی شروعات کا پتہ چلتا ہے:

> ''عصری ادب کی زندگی کے اڑھائی سال پورے ہوئے۔ یہ مختصر زندگی بھی

نشیب و فراز سے خالی نہیں تھی لیکن ستم و جو ر ناخدا کس سے کہیں اور کیوں؟البتہ ادب میں اس ننھی سی آواز کو دوستوں سے جوحوصلہ ملا اور ادبی حلقوں میں جو پذیرائی نصیب ہوئی اس کا شکریہ واجب ہے۔'' (77)

عصری ادب کے مضامین میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔اہم قلم کاروں میں باقر مہدی، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، ظفر صہبائی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، محمد حسن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔عصری ادب نے دوسرے ترقی پسند جرائد سے منفرد روش اپنا کر ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ ساتھ جدید ادبا و شعرا کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دی۔رسالے نے اعلیٰ ادبی معیار قائم کرنے کی کوشش کی اور محمد حسن اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ڈاکٹر شعیب رضا وارثی عصری ادب کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عصری ادب نے ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے کے لیے ان تمام نظریات اور اصول وضوابط کا اعادہ کیا جن پر تحریک کی بنیاد تھی۔ ادب کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے، اس پر مذاکروں اور مضامین کے ذریعے عصری ادب قارئین تک معلومات بہم پہنچاتا رہا۔تحریک کا ایک مقصد ملک میں فرقہ واریت کے خلاف محاذ قائم کرنا بھی تھا۔ اس رسالے نے اس طرف توجہ دی اور فرقہ واریت پر متعدد اچھے مضامین اور افسانے و نظمیں چھاپیں۔فرقہ پرستی کے انسداد کے لیے ادیبوں کو متحرک کیا اور اس بات پر زور دیا کہ وہ مختلف قسم کے تعصّبات جو ہمارے ملک کی فضا کو مسموم کر رہے ہیں، کو اپنا موضوع بنائیں۔'' (78)

عصری ادب نے ترقی پسندی کو نئے سرے سے جلا بخشنے کا کام کیا اور ترقی پسند ادب سے لوگ متنفر ہوکر جہاں نئے اور جدید ادب کی طرف رخ کرنے لگے تھے وہ دوبارہ محمد حسن کے اس کارواں میں شامل ہوگئے۔اس جریدے نے ترقی پسندی کے بنیادی اصولوں کا احاطہ کیا اور ترقی پسندی کے مقاصد کو ایک بار پھر واضح کیا اور یہ جتانے کی کوشش کی کہ ترقی پسندی کی موت نہیں ہوئی ہے بلکہ یہ رجحان لافانی ہے اور یہ تحریک

ادب کی سب سے اہم تحریک ہے جس کے بغیر ادب کو ادھورا تصور کیا جائے گا۔سماجی مسائل، معاشی صورتِ حال،ظلم و استحصال، جبر و استبداد کے موضوعات پر پھر سے قلم اٹھایا جانے لگا اور ترقی پسند نظریات سے متاثر تحریریں سپردقلم کی جانے لگیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ محمد حسن نے جدیدیت کو ترقی پسندی سے الگ نہیں تصور کیا بلکہ اس کی توسیع قرار دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جدیدیت سے ترقی پسندی کو فائدہ ہی ہوا ہے اور یہ ترقی پسند ادب کے مخالف نہیں ہے۔اس رسالے نے ادبی صحافت کو ایک نئی سمت عطا کی اور روایتی تحریروں کے بجائے منفرد تحریریں بھی اس اہم جریدے کے صفحات میں شائع ہوئیں، جن سے ترقی پسند ادب کے تنوع کا احساس ہوتا ہے اور لوگ ایک بار پھر ترقی پسند ادب کی طرف مائل ہونے پر مجبور ہوئے۔

ترقی پسند تحریک کو عام کرنے میں پروفیسر قمر رئیس کے 1978 میں جاری کیے گئے عصری آگہی اور نیا سفر کا نام بھی قابل ذکر ہے۔عصری آگہی ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ جدید رجحان پر مبنی موضوعات کو بھی جگہ دیتا رہا ہے۔

فن اور شخصیت: یہ ایک ایسا رسالہ تھا جس کا ہر شمارہ ایک خاص نمبر ہوتا تھا۔اس تاریخ ساز رسالے کو صابر دت نے بمبئی سے 1975 میں شروع کیا تھا۔اس کے مدیران میں صابر دت اور گوپی چند نارنگ شامل تھے۔اس کے کچھ خاص نمبروں میں گنیش بہاری طرز نمبر،مہندر ناتھ نمبر، جاں نثار اختر نمبر،کملیشور نمبر،غزل نمبر، آپ بیتی نمبر،فیض احمد فیض نمبر،قتیل شفائی نمبر، نرگس دت نمبر، ساحر لدھیانوی نمبر، خواجہ احمد عباس نمبر،فکر تونسوی نمبر،احمد فراز نمبر، ڈاکٹر وزیر آغا نمبر، خدیجہ مستور نمبر،احمد ندیم قاسمی نمبر، انتظار حسین نمبر،غزل نمبر قابل ذکر ہیں۔

ادبی چوپال: یہ سہ ماہی رسالہ لکھنؤ سے جاری کیا گیا تھا۔اس کے مدیر انور ندیم تھے اور اس پرچے کا پہلا شمارہ جولائی 1976 میں شائع ہوا تھا جو جولائی، اگست، ستمبر پر محیط تھا۔ پہلے شمارے کے اداریے میں انور ندیم لکھتے ہیں:

> ’’ادبی چوپال کے پیچھے نہ کسی ...... کا ہاتھ ہے، نہ کسی چور دروازے سے
> آنے والی دولت کی فراوانی۔ ہاں خلوص محنت،لگن اور سچائی کی مشعلیں

ہیں ان کے ساتھ اور جذبہ ہے ان مشکلوں کو ہمیشہ روشن رکھنے کا، سیاسی انتقام کی آگ ہے نہ جلی بھنی عظمتوں کی ٹھنڈی راکھ، نہ کرسیوں کی ہوس ہے نہ کرسی نشینوں کو ذلیل و رسواد یکھنے کی آرزو، زندگی، ادب اور صحافت ان تین دائروں میں اوروں کی کوششوں سے ابھرنے والے اچھے، سجل اور خوبصورت نقوش پر پردہ ڈالنے کی بیماری ہے۔نہ ادبی چوپال کی راہ سے کسی ایک یا دو چار یا دس بیس لوگوں کے لیے کوئی خاص امیج بنانے کی بہت ہی خطرناک خواہش ہے۔'' (79)

ادبی چوپال ایک ایسا رسالہ تھا جس میں ادب کے ساتھ ساتھ دوسری دلچسپیوں سے متعلق مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔فلم، آرٹ،موسیقی، رقص وغیرہ پر بھی مواد اس پرچے میں شامل اشاعت ہوتا تھا۔ادبی چوپال کے پہلے شمارے میں غیر ضروری صفحات کے عنوان سے وہ خطوط شائع کیے گئے تھے جو انور ندیم کو مختلف ادبا وشعرا نے نیک خواہشات کے طور پر ارسال کیے تھے۔ ان میں آل احمد سرور،گوپی چند نارنگ،باقر مہدی،شارب ردولوی، علی جواد زیدی، گیان چند جین،عصمت چغتائی، محمد حسن، جوگندر پال، بشیر بدر، ندافاضلی وغیرہ کے خطوط شامل تھے۔

جواز: سید عارف اور نشاط انوار نے مالیگاؤں سے1977 میں یہ رسالہ شروع کیا تھا۔ ماہنامہ 'جواز' کے شمارے تاخیر سے بھی شائع ہوئے ہیں۔کچھ خصوصی نمبر بے حد مقبول رہے ہیں۔برصغیر کے تمام اہم قلم کاروں کی تحریریں رسالے میں چھپتی تھیں۔

سہ ماہی معیار: اس کی شروعات جدیدیت سے متاثر ہوکر کی گئی تھی۔ اس اہم جریدے کو شاہد ماہلی نے 1977 میں شروع کیا تھا۔رسالے میں نشاط شاہد کا نام بطور مدیر اور شاہد ماہلی کا نام بطور مرتب شائع کیا جاتا تھا۔اس رسالے کا دوسرا شمارہ دسمبر 1977 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس لحاظ سے پہلا شمارہ ستمبر 1977 میں شائع ہوا ہے۔اس دوسرے شمارے میں جدید غزل، جدید ہندی ادب، سماجی ادب اور مغربی ادب،جدید ہندوستانی مصوری پر مضامین شائع کیے گئے تھے۔اس کے علاوہ پاکستانی ادب پر بھی خاطر خواہ مواد پیش کیا گیا

تھا۔ معیار نے اپنے نام کی مناسبت سے واقعی ایک اعلیٰ معیار قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ شاہد ماہلی نے جریدے کو منفرد اور جاذب بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ معیار کے اس دوسرے شمارے کی ضخامت تقریباً 400 صفحات پر مشتمل تھی۔ اس شمارے میں شاہد ماہلی نے بڑے دلچسپ اور منفرد انداز میں معیار کی غرض و غایت بیان کی ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم

معیار کا پہلا شمارہ مدیران کی ادبی دیوانگی کا پہلا اظہار تھا۔ اس اظہار نے موجودہ ادبی ہوش مندیوں کو نہ صرف چونکایا بلکہ انھیں محفوظ حصاروں سے باہر نکلنے کے لیے مجبور بھی کیا۔ معیار میں شامل مواد کی فراہمی میں جس معیار کی تلاش پر زور دیا گیا تھا وہ پہلے شمارے کے تبصروں سے ظاہر ہے۔ معیار کی تلاش ہر بدلتے ہوئے عہد کی جائز تفہیم کے لیے ضروری ہے جسے ہم نے اپنے طور پر محسوس کیا اور پیش کر دیا...

میں نے پرچہ کیوں نکالا؟ یہ اس قسم کا سوال ہے کہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کبھی کبھی سگریٹ کیوں پی لیتا ہوں۔ دہلی میں ضرورت سے زیادہ مہنگی ہونے کے باوجود لوگ شراب کیوں پی لیتے ہیں۔ کوئی پتنگ بازی کرتا ہے تو کوئی کبوتر بازی کرتا ہے۔ کوئی جوا، سٹہ، اور تاش کیوں کھیلتا ہے۔ کوئی کرکٹ، فٹبال اور ہاکی کیوں کھیلتا ہے۔ میں پرچہ نکالتا ہوں۔ پرچہ بذات خود ایک تخلیق ہے، ایک ایسا خاکہ ہے جس میں رنگ بھرنا ہوتا ہے لیکن ہر تخلیق کے بعد جیسے کچھ ادھورا رہ جاتا ہے۔ شاید وہی احساس مجھے ہے۔''(80)

معیار کے کچھ شماروں کے مطالعے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ رسالے میں پرانے رجحان کے خلاف ایک احتجاج، ایک بغاوت کا جذبہ تھا۔ اس کی تخلیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی پرستی کے خول سے باہر آ کر ایک نئے ادب کی بنیاد کس طرح ڈالی جائے اور نئے ادب میں کن باتوں کا ہونا ضروری ہے، ایک اچھا اور معیاری ادب کیسا ہونا چاہیے، ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں اس رسالے نے زبان، اسلوب اور

انداز کی سطح پر کافی تجربے کیے۔

سہ ماہی تناظر: اس سہ ماہی رسالے کی شروعات ستمبر 1977 میں ہوئی تھی۔اس کے مدیر بلراج ورما تھے۔شعیب رضا خاں وارثی نے اس ترقی پسند جدید رسالے کے جاری ہونے کا سال 1980 لکھا ہے۔ملاحظہ ہو:

> ''بلراج ورما کی زیر ادارت نکلنے والا یہ جریدہ اعتدال پسند جدیدیت کا ترجمان تھا۔سات آٹھ شمارے ہی نکل سکے۔1980 میں جاری ہوا تھا۔''(81)

جناب شعیب رضا کی نظر سے شاید تناظر کے شروع کے شمارے نہیں گزرے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ اس سہ ماہی جریدے کے صرف آٹھ ہی شمارے نکلے تھے۔ میری نظر سے اس کا 24 واں شمارہ بھی گزرا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ درمیان میں اس کی اشاعت منقطع ہوگئی ہو اور دوبارہ اسے پھر جاری کیا گیا ہو۔مئی 1990 تا جون1991 پر مشتمل اس کا شمارہ کافی ضخیم تھا اور یہ جریدے کی چوبیسویں پیش کش تھی جو ایک ساتھ چھ شماروں پر مشتمل تھی۔بلراج ورما نے اس کے اداریہ معروض میں رسالے سے متعلق کچھ یوں لکھا ہے:

> ''ہم دعویٰ نہیں کرتے کہ آج تک تناظر کی مختلف جلدوں میں جو کچھ بھی شامل رہا ہے وہ سب کا سب ایک دم ادب عالیہ قرار دیے جانے کا مستحق ہے مگر اتنا ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ وہ اچھا خاصا اور صحت مند ادب تھا۔ ادبی صحافت کے منظرنامے پر تناظر نے اپنا پہلا قدم ستمبر 1977 میں رکھا تھا۔ چھ سو صفحات پر مشتمل اس سلسلے کی پہلی کتاب جو ایک انتھالوجی کے طور پر رونما ہوئی تھی ان تمام اصناف سخن کا سفینہ تھی جو اردو زبان و ادب کو ہمیشہ ہی عزیز رہے ہیں۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہمارا ہر نیا قدم ترقی پسند ہندوستان کے ادب، آرٹ اور کلچر کی ترجمانی کرے گا اور ہر اشاعت خصوصی پیش کش ہوگی... تناظر کے بارے میں کچھ حضرات نے شکایت کی ہے کہ اس کی کوئی واضح شناخت نہیں۔ ہم ان سے متفق ہیں کیونکہ تناظر آج تک ایک Miscelany کے طور پر رونما ہوتا رہا ہے اور ہم

دوسرے ادبی جریدوں کے منتظمین کی طرح اس کو اپنی شناخت سمجھتے

رہے ہیں۔'' (82)

'تناظر' میں ادب کے تمام نظریات ورجحانات، ترقی پسندی، ترقی پسند کلاسکیت، کلاسیکی شاعری، مارکسیت، جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات جیسے موضوعات پر کافی دقیق مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔'تناظر' نے ادب کے نئے تجربوں اور ادبی افق پر لہرانے والے رجحانوں کے ساتھ چل کر ادبی صحافت کی ایک نئی روش کو پروان چڑھایا۔ تناظر نے ترقی پسندی اورجدیدیت کے بعد جدید تر ادب کے نشیب وفراز کو واضح کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ یوں تو اس رسالے میں ترقی پسند ادیبوں کو بھی کافی جگہ دی گئی ہے لیکن جدید ادب کے علم برداروں کو زیادہ اہمیت دی جاتی رہی ہے۔رسالے کے اہم قلمکاروں میں مظہر امام،انور عظیم، انور مرزا،احمد یوسف، عبدالصمد، مجتبیٰ حسین، رام لعل، بلراج حیرت، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم فاروقی، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، حسن نعیم، مظفر حنفی، حامدی کاشمیری، پریم گوپال متل، بلراج کومل، گوپی چند نارنگ، تارا چرن رستوگی، سلیم شہزاد وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

عصری آگہی: اس کا آغاز 1978 میں ہوتا ہے۔ترقی پسند تحریک کو دوبارہ جلا بخشنے کے مقصد سے قمر رئیس نے یہ رسالہ شروع کیا تھا۔اپنے خاص تنقیدی نظریات کے حامل مضامین کی وجہ سے یہ رسالہ اپنی انفرادی شناخت بنانے میں کامیاب رہا ہے۔ افسانہ نمبر، بیدی نمبر وغیرہ اس رسالے کے اہم خصوصی نمبر ہیں۔

ادبی رسالوں میں عصری آگہی بہت اہم رسالہ مانا جاتا ہے۔ اِس کے مدیر قمر رئیس، صلاح کار، اقبال حیدر جعفری، شریک مدیر سید عاشور کاظمی، ادارہ تحریر، علی احمد فاطمی، ارتضیٰ کریم، شکیب نیازی تھے۔اگست ستمبر اکتوبر 1991 کے اداریہ میں قمر رئیس لکھتے ہیں:

''عصری آگہی کے پہلے دور کا آخری شمارہ راجندر سنگھ بیدی نمبر تھا جو

1982 میں شائع ہوا تھا۔کم وبیش دس سال کے وقفہ کے بعد اِس کے

دوسرے دور کا آغاز ہورہا ہے۔'' (83)

اس طرح اس رسالے کے دوسرے دور کا آغا 1991 سے ہوتا ہے۔ترقی پسندی کی حمایت میں شائع شدہ اِس رسالے میں تیسری دنیا میں تخلیق ہور ہے ادب خصوصاً ترقی پسند ادب پر مبنی تحریریں اور تخلیقات کو شائع کیا جاتا رہا ہے۔

عصری آ گہی نے اپنے اداریوں میں ترقی پسند نظریات کو فروغ دینے کی بات زیادہ کہی ہے۔عصری آ گہی کا آغاز جس وقت ہوا تھا اس وقت جدیدیت پوری طرح اپنے قدم جما چکی تھی اور ترقی پسندی ماند پڑنے لگی تھی،لیکن قمر رئیس نے اپنے اداریوں میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ ترقی پسندی ہر دور میں زندہ رہی ہے اور ابھی بھی زندہ ہے۔سماجی حقیقت نگاری،سماجی واقعیت نگاری پر بھی اداریے تحریر کیے گئے ہیں۔کچھ اداریوں میں سیاسی صورتِ حال پر بھی تبصرہ ہے۔ڈاکٹر شعیب رضا وارثی لکھتے ہیں:

''عصری آ گہی کی مدت اشاعت زیادہ نہیں لیکن اس رسالے نے افسانے کے جدید رجحانات سے ہم آہنگ ہوکر قارئین میں ترقی پسندی کا نیا اور وسیع مفہوم متعارف کرایا۔اس رسالے میں نسبتاً کم افسانے شائع ہوئے تھے لیکن جو افسانے بھی شائع ہوتے تھے وہ معیاری اور دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ان افسانوں میں صنعتی تہذیب کے بخشے ہوئے زخموں کی ٹیس بھی ہیں اور کھوکھلی روحانیت پر تنقید بھی۔بعض افسانے عشق کی طرفہ انگیزیاں بھی لیے ہوئے ہیں تو کہیں محض جنسی نفسیات کے شارح اور عکس ہیں،کہیں کہیں انفرادی زندگی کا کرب ہے تو کہیں اجتماعی مسائل کی تصویر کشی۔کسی افسانے میں اصلاح کا جذبہ موجزن ہے تو کسی میں حوصلہ مندی کا درس... غرض روایت اور جدید ہر طرح کے موضوعات پر افسانے لکھے گئے ہیں۔'' (84)

نقد ونظر: شش ماہی نقد ونظر کی شروعات 1979 میں ہوئی تھی۔اس علمی وتحقیقی رسالے کو اسلوب احمد انصاری نے شروع کیا تھا۔یہ رسالہ اپنے ادبی تبصروں اور تحقیقی مضامین کے لیے جانا جاتا ہے۔رسالے کی شروعات کے دور میں ہر شمارے میں علامہ اقبال پر ایک

مضمون شائع کیا جاتا تھا۔ نقد و نظر کے رشید احمد صدیقی اور فانی بدایونی پر شائع ہوئے خصوصی نمبر کافی مقبول ہوئے تھے۔

عالمی اردو ادب: عالمی اردو ادب کی شروعات 1985 میں ہوئی تھی۔ یہ ایک حوالہ جاتی رسالہ ہے جسے نئی دلی سے معروف افسانہ نگار، ناول نویس و صحافی نند کشور وکرم نکالتے ہیں۔ اس میں پورے سال کی ادبی سرگرمیوں اور مختلف نمائندہ تخلیقات کو شائع کیا جاتا ہے۔ یہ ایک منفرد جریدہ ہے اور اس میں پورے سال کی اردو ادب کی اہم تخلیقات، شعرا اور نثر نگاروں کے احوال و کوائف شائع کیے جاتے ہیں۔عالمی اردو ادب کے علی سردار جعفری نمبر، دیوندر اسر نمبر، حبیب جالب نمبر،احمد ندیم قاسمی نمبر اور گوپی چند نارنگ نمبر شائع ہو چکے ہیں۔

ایوان اردو: ایوان اردو کواردو کے اہم رسالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی شروعات مئی 1987 میں ہوئی تھی یہ دہلی اردو اکادمی کا ترجمان رسالہ ہے۔ اس کی شروعات کا مقصد اکادمی کی سرگرمیوں کو عام کرنا تھا۔لیکن بعد میں اس رسالے نے ادبی حلقے میں اپنی ایک اچھی پہچان قائم کرلی۔ ایوان اردو پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اردو اکادمی کے مقاصد اور قیام پر بھی بات کرلی جائے۔اردو اکادمی دہلی کا قیام 31 مارچ 1981 میں عمل میں آیا۔ اکادمی کو رجسٹریشن ایکٹ1860 کے تحت رجسٹر کیا گیا۔شروعاتی سال میں اردو اکادمی کا بجٹ پچاس ہزار روپے مقرر کیا گیا تھا۔اردو اکادمی کے ذریعے شائع کیے گئے کتابچے کے مطابق اکادمی کے مندرجہ ذیل مقاصد تھے۔

اردو اکادمی دہلی کے اغراض ومقاصد

رجسٹرڈ سوسائٹی کے طور پر اردو اکادمی دہلی کے اغراض ومقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

1. دہلی کی لسانی تہذیب کے مشترکہ حصے کے طور پر اردو زبان اورادب کا تحفظ اور ارتقا
2. ادبی اور معیاری تصنیفات بچوں کی کتابوں کی اشاعت۔
3. ترجمہ کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت

4. اردو کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت۔
5. اردو کے مستحق مصنّفین کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت کے لیے مالی تعاون۔
6. کتابوں پر انعامات تقسیم کرنا۔
7. اردو کے عمر رسیدہ اور مستحق مصنّفین کی ماہانہ مالی اعانت۔
8. اردو اسکالروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ اور مالی اعانت۔
9. سیمینار، جلسے، مشاعرے اور کانفرنس، نشستیں، جس سے اردو کا فروغ ہو۔
10. اردو میں معیاری رسائل وجرائد اور دوسری مطبوعات کی اشاعت۔
11. سوسائٹی کی ساری آمدنی سوسائٹی کے اغراض ومقاصد کے حصول ہی کے لیے خرچ کرنا۔(85)

اکادمی نے آغاز سے اردو ادب کی ترقی کے لیے کوششیں شروع کردی تھیں۔ کتابوں کی اشاعت سمینار وکانفرنسوں کا انعقاد اور اردو ادیبوں کو مالی امداد دینے کے علاوہ اکادمی یونیورسٹی اور کالجوں کے اچھے اور ذہین طلبا کو وظیفہ بھی مہیا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر کتابوں کی نمائش کرتی رہی ہے۔ اردو اکادمی نے خطاطی اور کمپیوٹر کے کورس وغیرہ بھی شروع کیے جن سے اردوداں حلقہ زیادہ بہتر طریقے سے استفادہ کرسکے۔ 5 تا 6 برسوں کے درمیان اردو اکادمی نے کافی ترقی کرلی تھی۔ اپنی لائبریری کا قیام بھی کیا جہاں بیش قیمت اور نایاب کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اکادمی کی سرگرمیوں کو عام کرنے اور اردو ادب کی خدمت کے نقطہ نظر سے اکادمی نے اپنا رسالہ ایوان اردو شائع کرنا شروع کیا:

> ’’1987 میں اکادمی کی گورننگ کونسل خاص طور اس وقت کے چیئرمین جناب ایچ ایل کپور نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اکادی ایک ادبی رسالہ اورایک بچوں کا رسالہ جاری کرے۔ جناب ایچ ایل کپور نے ادبی رسالے کا نام ایوان اردو رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جسے سب نے بخوشی قبول کیا اور بچوں کا رسالہ امنگ کے نام سے جاری ہوا۔ یہ دونوں رسائل گزشتہ 18 سال سے پابندی سے شائع ہورہے ہیں۔ ان 18 سالوں

میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان ماہانہ رسائل کا کوئی بھی شمارہ وقت پر شائع نہ
ہوسکا ہو۔'' (86)

ایوان اردو کا پہلا شمارہ مئی 1987 میں منظر عام پر آیا تھا۔ جیسا کہ شریف الحسن نقوی ایوان اردو کے مئی 1988 کے شمارے میں رقم طراز ہیں:

حرف آغاز، شریف الحسن نقوی

پچھلے شمارے کے ساتھ ایوان اردو دہلی نے اپنی عمر کا ایک سال پورا کیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اردو دنیا نے اس رسالے کی خاطر خواہ پذیرائی کی جو ہماری توقعات سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ ہم اس پذیرائی پر یقیناً خوش ہیں لیکن ہمیں یہ احساس بھی ہے کہ ہم ایوان اردو کو جس مقام تک لے جانا چاہتے ہیں وہ ابھی دور ہے۔ ہم خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہیں۔ لیکن ہماری یہ تلاش اپنی منزل مراد تک پہنچ سکے اس کے لیے ہمیں اپنے لکھنے والوں کا سرگرم تعاون بھی درکار ہے۔ اور پڑھنے والوں کی بھرپور توجہ اور شرکت۔ (سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی)۔ (87)

اس طرح سے ایوان اردو کا پہلا شمارہ مئی 1987 میں منظر عام پر آیا تھا۔ ایوان اردو دلی سے نکلنے والے رسالوں میں ایک اہم رسالہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی سرپرستی آغاز سے ہی اردو کے بڑے بڑے ادیبوں نے کی ہے۔ مخمور سعیدی، شریف الحسن نقوی، قمر رئیس، عنوان چشتی، فضل الحق، فہمیدہ بیگم جیسے اہم اور مقتدر ادبا اور اعلیٰ درجے کے شاعر و نثر نگار ایوان اردو سے جڑے رہے ہیں۔ ایوان اردو کسی تحریک یا رجحان کا کبھی ترجمان نہیں رہا ہے اور شروع سے ہی اپنا متوازن معیار برقرار رکھتا چلا آرہا ہے۔ ایوان اردو کی پذیرائی سبھی مکتبہ فکر نے کی اور اس رسالے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ رسالہ کم صفحات کا ہونے کے باوجود کافی جاذب نظر ہوتا ہے۔ رسالے میں ادب کے تمام شعبوں سے متعلق مضامین ومواد شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق انصاری لکھتے ہیں:

''یہ کہنا بے جا نہیں کہ ہندوستان کی کسی بھی اردو اکادمی کے ترجمان کو علمی

اور عوامی ہر دو حلقوں میں بلکہ شاید کسی بھی حلقے میں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اسباب کی بحث مناسب نہیں، مگر ایوان اردو کو دونوں حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت میسر آئی۔ اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کے مقتدر ترین اہل قلم حضرات کی تحریر ایوان اردو کی زینت بنی۔ اشاعت اول سے تادم تحریر پابندی وقت سے شائع ہونے والا اس اعتبار سے واحد جریدہ ہے کہ اس اثنا میں اپنی اشاعت شروع کرنے والے کسی دوسرے علمی جریدے کو اس پابندی اوقات کے ساتھ شائع ہونا میسر نہیں ہوا۔'' (88)

ایوان اردو میں اردو زبان وادب سے متعلق تقریباً سبھی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایوان اردو میں مضامین، پیغامات، افسانے، انشائیے، طنز و مزاح، خاکے، گوشہ رفتگاں، ڈرامے، انٹرویوز، رپورتاژ، سفرنامے، ناقابل فراموش، غزلیں، نظمیں، خبرنامہ، سرود رفتہ، آپ کی رائے وغیرہ کالم رہے ہیں۔ایوان اردو کے شروع کے دور میں ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک طویل مضمون دلی کے آثار قدیمہ گیارہ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ ایوان اردو کا پہلا خاص نمبر دسمبر 1987 میں شائع ہوا تھا۔ یہ خواجہ احمد عباس نمبر تھا۔ اس کے بعد دسمبر 1988 میں ابوالکلام آزاد نمبر اور دسمبر 1989 میں جواہر لعل نہرو نمبر شائع کیا گیا۔ایوان اردو کے خصوصی نمبروں کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایوان اردو کے کئی اہم ضخیم نمبر شائع ہو چکے ہیں جن میں پنڈت جواہر لعل نہرو نمبر، مولانا آزاد نمبر، فراق نمبر، ہندی افسانوی ادب نمبر، علی سردار جعفری نمبر، حکیم عبدالحمید نمبر، علامہ اقبال نمبر اور پریم چند نمبر کافی مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ بیشتر اہم شخصیات کے گوشے بھی شائع کیے گئے جن میں آنند نرائن ملا، جناب عبد اللطیف اعظمی، جناب مالک رام، کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں، عرفان صدیقی، کفیل آزر، جون ایلیا، معین احسن جذبی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، جگن ناتھ آزاد، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔(89)

ایوان اردو نے آغاز سے ہی کئی نئے تجربے کیے ہیں۔ ایوان اردو کے سرورق کے اندرونی صفحے پر ایک تصویر دی جاتی تھی اور اس پر قاری سے ایک شعر یا نثری عنوان بھیجنے کو کہا جاتا تھا۔ ان عنوانات یا اشعار کو شکریے کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا۔ ایوان اردو کے سرورق پر تاریخی عمارتوں یا مقامات کی تصاویر بھی دی جاتی رہی ہیں۔

ایوان اردو میں اردو ادب سے متعلق مضامین کے علاوہ دہلی کی تاریخ و تمدن اور تہذیب، ہندوستانی مشترکہ تہذیب، تاریخ و ثقافت پر بھی مضامین کافی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایوان اردو نے جہاں اردو ادب کی عظیم شخصیتوں اور سماجی و سیاسی شخصیات کو خصوصی نمبروں کے ذریعے خراج عقیدت پیش کیا ہے وہیں جدید ہندی کہانی نمبر بھی شائع کر کے اردو کی ادبی صحافت میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ اس خصوصی نمبر کو زبیر رضوی اور مخمور سعیدی نے مرتب کیا تھا۔ یہ عظیم نمبر اگست 1994 میں منظر عام پر آیا تھا۔ جدید ہندی ادب نمبر کے اداریے میں مدیر لکھتے ہیں:

> ''دہلی اردو اکادمی کا بنیادی کام اردو ثقافت اور اردو زبان و ادب کا فروغ ہے لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں اردو ابتدا ہی سے مختلف ثقافتوں اور مختلف زبانوں سے فیض اٹھاتی رہی ہے۔ اردو تہذیب گنگا جمنی تہذیب ہے جس نے ملک ہی نہیں اپنی افتاد مزاج سے مناسبت اور مطابقت رکھنے والے عناصر کو بھی اس طرح اپنے اندر جذب کیا ہے کہ وہ اس کی خوبصورتی اور دلکشی کا جز و لاینفک بن گئے ہیں۔ یہی حال اردو زبان کا بھی ہے۔ اس نے دوسری زبانوں کے ذخیرہ الفاظ اور ان کے خزینہ خیالات سے اس حد تک پورا پورا فیض اٹھایا ہے جس حد تک اس کے داخلی مزاج اور اس کی خارجی ساخت نے اس کی اجازت دی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ عمل جاری رہنا چاہیے اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اردو والے اگر براہ راست نہیں تو تراجم کے واسطے سے دوسری زبانوں کی موجودہ سمت و رفتار سے باخبر رہیں۔ یہ خاص نمبر جو ہمعصر ہندی ادب کے مختلف گوشوں سے

> آپ کو متعارف کرانے کی ایک کوشش ہے۔ ہماری اس خواہش کا عملی اظہار ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ دوسری زبانوں پر بھی خصوصی اشاعتیں پیش کی جائیں۔'' (90)

ایوان اردو دہلی میں اردو اکادمی سے متعلق خبریں، سرگرمیاں، سیمینار، تقسیم ایوارڈ وغیرہ کی تقریبات کو خصوصیت سے شائع کیا جاتا ہے۔ایوان اردو کو ہر مکتبہ فکر کے ادبا و شعرا کا تعاون حاصل رہا ہے۔ یہ رسالہ اردو اکادمی کا ترجمان ہوتے ہوئے بھی ادبی صحافت کے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ایوان اردو کے مدیروں میں شریف الحسن نقوی، قمر رئیس، مخمور سعیدی، مرغوب حیدر عابدی، منور امروہوی، ڈاکٹر اسلم پرویز، راغب الدین، ڈاکٹر راشد عزیز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سہ ماہی تکمیل: بھیونڈی، تھانے مہاراشٹر سے اس سہ ماہی کی شروعات ہوئی تھی اس کا پہلا شمارہ جنوری تا مارچ 1988 پر مشتمل تھا۔اس کے مدیران میں اصغر حسین قریشی، مظہر سلیم شامل تھے۔ اس سہ ماہی کا پانچواں شمارہ شاذ تمکنت نمبر تھا جس کو یوسف ناظم نے ترتیب دیا تھا۔ اس معروف رسالے میں شمس الرحمٰن فاروقی، مظہر امام، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی جیسے بڑے ادبا و شعرا کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ رسالہ آغاز سے ہی اردو ادب اور زبان کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ادبی صحافت کی ترقی میں بھی اس رسالے کی نمایاں خدمات ہیں۔اردو رسائل کو عام کرنے اور لوگوں میں اردو رسائل کے تئیں بیداری پیدا کرنے میں بھی یہ رسالہ کوششیں کرتا رہا ہے۔جنوری 1990 کے اداریے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> '' اردو کے اخبارات ورسائل جس طرح مالی بحران کے شکار ہیں اسے دور کرنے کے لیے ہمیں عملی طور پر اقدام کرنے ہوں گے۔ اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ یہ نہیں کہ کسی بلڈنگ یا کسی ہوٹل میں ایک اخبار آ گیا تو وہ بلڈنگ کے تمام مکینوں اور گاہکوں کی ضرورت کے لیے کافی سمجھا جائے۔ بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ ہر گھر میں اخبار،

رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھی جائیں۔ اپنے بچوں کو اردو لکھنا، پڑھنا سکھا کر ہم آئندہ برسوں میں اردو کے قاری کے مسئلے کو کسی حد تک حل کر سکتے ہیں۔ بہ صورت دیگر حالت دگرگوں ہو جائے گی۔

آج ہم یہ عہد کریں کہ اردو کو زندہ زبان ثابت کرنے کے لیے عملی طور پر قدم اٹھا کر ایک پوری نسل کو گمراہی سے بچائیں گے۔(91)

پیش رو: اس سہ ماہی رسالے کی شروعات جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں اردو کے استاد اور معروف تنقید نگار ڈاکٹر انوار عالم پاشا نے جون 1988 میں کی تھی۔ میں نے رسالے کے حوالے سے ان سے ملاقات بھی کی اور پیش رو کے کچھ شمارے بھی دیکھے۔انھوں نے تفصیلی طور پر اس رسالے کے حوالے سے معلومات بہم پہنچائی۔اس رسالے کے جاری کرنے کی وجوہات پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس رسالے کو اس وقت کے روایتی ادبی ماحول، ادب کے تئیں لوگوں کے بدلتے رویے اور ادبی موقع پرستی، اور ایک ادبی نفسانفسی کی صورتِ حال کو کسی حد تک خوشگوار بنانے کے لیے شروع کیا گیا تھا۔پیش رو کے پہلے شمارے کے اداریہ، پیش کش میں جناب انوار احمد لکھتے ہیں:

''ادب اور ادیب اس وقت سخت آزمائش کے دور سے گزر رہے ہیں۔ عقیدے زخمی ہیں اور یقین و اعتماد کی سانس اکھڑی اکھڑی سی ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے دانشوروں کی لاشیں پٹی ہوئی ہیں۔ موقع پرستی اور کمرشیل بازی گری نے ادب اور ادیب دونوں کے ضمیر کو نیلام گاہ میں لا کھڑا کر دیا ہے۔ ادبی قدروں اور معیاروں پر بحث وتمحیص کا رواج اٹھ چکا ہے۔دانشوری کے سوتے خشک پڑ گئے ہیں۔فکر کو تلانجلی دے دی گئی ہے۔ الفاظ اپنی وقعت کھوتے جا رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ادب Readability سے محروم ہو چکا ہے۔ بیشتر سنجیدہ اردو میگزین کے ساتھ سب سے اہم مالی مسئلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ قارئین کا حلقہ اتنا وسیع نہیں ہوتا کہ وہ اپنی کفالت آپ کر سکیں۔پیش رو بھی اس سلسلے سے دوچار ہے۔ پہلا شمارہ بڑی تگ و دو

> کے بعد آپ تک پہنچ رہا ہے۔ اس کی مالی بنیاد احباب کے تعاون پر قائم ہے۔ہم کسی ایسے رزق کے قائل نہیں جو ہماری پرواز میں مخل ہو۔اس طرح صرف ایک ہی راستہ ہمارے سامنے ہے اور وہ ہے سنجیدہ قارئین کے حلقے کو وسیع کرنا اور یہ تبھی ممکن ہے جب ہمیں ہر سطح پر قارئین اور اہل قلم حضرات کا تعاون حاصل ہو۔
>
> پیش رو کے اس پہلے شمارے میں ممکن ہے کہ بہت ساری خامیاں اور کوتاہیاں رہ گئی ہوں، بہرکیف یہ نقش اول ہے ہم آپ کے تعاون اور مشورے کے سہارے اسے اور بہتر شکل دینے کی کوشش کریں گے۔'' (92)

اس رسالے کے ایڈیٹر انور پاشا تھے، ایسوسی ایٹ ایڈیٹرو ں میں ابرار رحمانی، ابواللیث، شریف احمد قریشی، مظہر مہدی شامل تھے، جبکہ مینیجنگ ایڈیٹر توحید اختر تھے۔ پیش رو میں اشتراکیت اور مارکسیت سے متعلق تخلیقات زیادہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ کلاسیکی ادب پر بھی مواد مل جاتا ہے۔اردو کے ساتھ ساتھ ہندی ادب سے متعلق بھی مضامین کو رسالے کے صفحات پر جگہ ملی ہے۔اس رسالے کو ایک مشن کے طور پر شروع کیا گیا تھا لیکن صد افسوس کہ یہ رسالہ زیادہ دنوں تک جانبر نہ رہ سکا اور کچھ ہی شماروں کے بعد بند ہوگیا۔

ذہن جدید: جدید ترین رجحانات کو پروان چڑھانے میں یہ رسالہ پیش پیش رہاہے۔ رسالے کومشہور ومعروف جدید شاعر اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے زبیر رضوی نے شروع کیا تھا۔ اس کی مدیر ہ ان کی اہلیہ جمشید جہاں ہیں۔ ذہن جدید کا پہلا شمارہ ستمبر تانومبر 1990 میں شائع ہواتھا۔ یہ سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس سہ ماہی رسالے کا ہرشمارہ کافی ضخیم ہے۔ اس رسالہ کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں تمام فنون لطیفہ اور ملکی اور عالمی معاملات پر کافی مواد شائع کیا جاتا رہاہے۔ ادب سماج کا آئینہ یا عکاس کہلاتا ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ ادب جیسے کچھ خاص معاملات تک سمٹ کررہ گیا ہے۔ ذہن جدید نے پہلی بار اردو زبان اورادبی صحافت میں بالکل نئی شروعات کی اور

خالص ادبی تخلیقات،افسانوں، غزلوں، نظموں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی معاملات، تھیٹر، فلم، موسیقی، آرٹ، کلچر سے متعلق مواد بھی شائع کیے ہیں جو اس رسالے کو دوسرے جرائد سے بالکل منفرد قرار دیتے ہیں۔ پہلا شمارہ 203 صفحات پر مشتمل تھا۔ جبکہ اس کی قیمت صرف بیس روپے رکھی گئی تھی ذہن جدید کے سرورق پر یہ جملہ لکھا ہوتا ہے 'ادب آرٹ اور کلچر کا ترجمان' ذہن جدید نے ادب، تہذیب اور آرٹ کی ترجمانی کرنے میں بلاشبہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ذہن جدید کا ہر شمارہ اتنا جاذب نظر اور اس قدر کارآمد ہوتا ہے کہ قاری ایک نشست میں پڑھنے کو بے چین ہوجائے۔ ذہن جدید کے ہر شمارے میں کسی نہ کسی بحث کو موضوع بنایا جاتا ہے اور ان پر مختلف ناقدین، محقق اور قابل قدر شخصیات کی آرا شامل کی جاتی ہیں۔ پہلے شمارے میں بحث کا موضوع ''اشتراکی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر ترقی پسندی کی معنویت'' تھا۔ اس موضوع پر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس، دیوندر اسر، بلراج کومل اور وحید اختر نے اظہار خیال کیا ہے۔ افسانوں کے حصے میں سریندر پرکاش، بانو قدسیہ، جیلانی بانو، انور عظیم، عوض سعید، عبداللہ حسین، ممتاز مفتی کے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے شمارے میں ہی تنقیدی بحث، افسانے، طنزومزاح، نظمیں، انٹرویو، غیرملکی ادب، فلسطینی تحریک انتفاض، غیرملکی ادب کے بہترین شہ پارے، کتابوں پر تبصرے اور صحافت کے تعلق سے مضامین شامل ہیں، غرضیکہ ذہن جدید رسائل کی بھیڑ میں سب سے انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ذہن جدید کے پہلے شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب مظہر امام لکھتے ہیں:

> ''اب تک تو ذکر تھا ادب کا لیکن ذہن جدید، نے صرف ادب تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے اور یہی اس کی بڑی خوبی ہے۔ ہمارے رسائل کی عام تصویر یہ ہے کہ کچھ مضامین جنھیں اکثر مقالے کہا جاتا ہے۔ کچھ افسانے، کچھ نظمیں، غزلیں، چند کتابوں پر تبصرے، قارئین کے کچھ خطوط اللہ اللہ خیر صلا۔ ذہن جدید، ایک مختلف نوعیت کا رسالہ ہے اور صحیح معنوں میں ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ ذہن جدید غالبا اردو کا پہلا ایسا رسالہ ہے جس میں اردو

ادب کی تخلیقات اورمباحث کے ساتھ علاوہ ازیں فلم، تھیٹر، مصوری (وکنیوس) اورموسیقی پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں معلوماتی مضامین پیش کیے جاتے ہیں۔''(93)

ذہن جدید اپنی طرز کا منفرد رسالہ ہے اور اس کا ہرشمارہ عام اردو رسائل کے مقابلے کافی ضخیم ہوتا ہے۔ ذہن جدید کے بانی اور مرتب اس رسالے کی شروعات سے قبل ایک اچھے اور جدید شاعر کے طور پر جانے جاتے تھے لیکن ذہن جدید کے منظرعام پرآنے کے بعد ان کی گوناگوں صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ وہ اچھا شاعر ہونے کے ساتھ بہترین صحافی اور اعلیٰ درجے کے ادیب بھی ہیں۔ ذہن جدید کو مرتب کرنے کا ڈھنگ یہ ثابت کرتا ہے کہ زبیر رضوی کو اردو ادب اور اس کے قاری سے کتنا پیار ہے وہ اردو کے قاری کو اپنے رسالے سے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس چھوٹے سے رسالے میں انھوں نے تقریباً سارے موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اردو رسائل یوں تو بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور کچھ دنوں کے بعد بند ہوجاتے ہیں یا ایک محدود حلقے تک سمٹ کر رہ جاتے ہیں لیکن ذہن جدید اپنی انفرادیت اورخصوصیات کی بنا پر ایک نظر میں ہی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ اردو زبان میں جب تک ہمیں مختلف معلومات، مختلف موضوعات پر مبنی مضامین نہیں نظر آئیں گے تب تک اردو کا قاری اپنی چھوٹی سی دنیا سے باہرنہیں نکل سکتا اور زبیر رضوی نے اردو کے قاری کی ذہنی پرورش کو انجام دینے کے لیے بے انتہا خوبصورت رسالہ شائع کیا۔ ذہن جدید اس معاملے میں بھی قابل ذکر ہے کہ اس نے اپنے شروعاتی دور میں ہی مختلف شاعروں مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب پرخصوصی گوشے شائع کیے۔ ایک ایسے وقت میں جب اردو زبان زبوں حالی کا شکارتھی جب اردو میں اچھے لکھنے والوں کا ایک قحط سا آ گیاتھا، زبیر رضوی نے اتنا خوبصورت رسالہ نکال کر یہ ظاہر کردیا کہ اب بھی اردو زبان دوسری زبانوں سے پیچھے نہیں ہے۔ اردوزبان میں بھی مغربی علوم، ثقافت وتہذیب اور تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق مضامین شائع ہوسکتے ہیں اور اردو میں اچھے لکھنے والوں کی آج بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

ذہن جدید نے آغاز سے ہی اپنا ایک معیار قائم رکھا ہے اور ایسے قلم کاروں کی تخلیقات شائع کرنے کی کوشش کی جسے اردو کا قاری پڑھنا چاہتا ہے۔ ذہن جدید کے اہم قلم کاروں میں بلراج کومل، دیوندر اسر، عوض سعید، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر وحید اختر، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، باقر مہدی، انور عظیم، مخمور سعیدی، زبیر رضوی اور قرۃ العین وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ معروف شاعر اور نقاد مخمور سعیدی ذہن جدید پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اردو میں ایسے رسالوں کی کمی ہے جو ادبی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دوسرے معاملات اور مسائل کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ سکتے ہوں جن کا ہماری ذہنی اور جذباتی زندگی سے قریبی رشتہ ہے۔ مصوری، موسیقی، رقص، فلم اور بہت سارے سماجی اور سائنسی علوم جن سے واقفیت یا بے تعلقی ہماری شخصیت کے ادھورے پن پر دلالت کرے گی... ذہن جدید ادب کے ساتھ دیگر فنون لطیفہ کا بھی احاطہ کرتا ہے۔(94)

ذہن جدید اپنی پوری آب وتاب سے آج بھی جاری ہے۔ دسمبر تا فروری 2008 میں زبیر رضوی نے بہت اہتمام سے رسالے کا پچاسواں شمارہ شائع کیا ہے۔ اس شمارے میں ہندو پاک کے تعلقات پر خصوصی گوشہ شائع کیا گیا ہے۔ خصوصی گوشے کے تحت فضیل جعفری، شمیم حنفی، صغیر افراہیم، منگلیش ڈبرال اور منوہر پرشاد سنگھ کے مقالے دیے گئے ہیں۔ رتن سنگھ، عبدالصمد، حسن جمال کے افسانے بھی رسالے کی زینت بڑھاتے ہیں۔ شاہد انور کی ڈرامانگاری پر حبیب تنویر کا ایک اہم مضمون ہے۔ اس شمارے میں ذہن جدید میں شائع تمام تخلیقات کی فہرست بھی شائع کی گئی ہے۔ ذہن جدید کا یہ پچاسواں شمارہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماہنامہ آجکل کے مدیر جناب خورشید اکرم ذہن جدید کے پچاسویں شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''زبیر رضوی نے تن تنہا اس رسالے کو پوری آن بان کے ساتھ جاری رکھا ہے اور اب اس کا پچاسواں شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ زبیر رضوی صاحب ذہن جدید کو فقط ایک رسالہ نہیں بلکہ اردو ادب کے کاز کے لیے ایک مشن

> سمجھتے ہیں اس لیے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ الگ تھلگ سے قبل دوسرے لوگ آگے آئیں اور اس مشعل کو اپنے ہاتھ میں لے کر آگے بڑھیں۔ اس کا اظہار پچاسویں شمارے کے اداریے میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے۔ ہم ذہن جدید کو نئی نسل کے ایک ایسے لمٹیڈ گروپ کو ادبی اور ثقافتی ورثے کے طور پر سونپنا چاہتے ہیں جو ذہن جدید جیسے رسالے کی ترتیب دینے کی شدید خواہش رکھتا ہو۔ میرے خیال میں یہ اردو والوں کا فرض ہے وہ ایسے اچھے رسالے کے مدیر کے تھکنے سے پہلے ان کی طرف جوش وخروش سے دست تعاون بڑھائیں۔'' (95)

اردو میں جہاں معیاری رسالوں کا قحط سا ہے ایسے میں زبیر رضوی اور جمشید جہاں کا ذہن جدید فرحت بخش ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ زبیر رضوی قابل مبارکباد ہیں کہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ذہن جدید کو اتنے اہتمام سے نکال رہے ہیں اور آج بھی یہ رسالہ اردو کا اہم اور ممتاز رسالہ ہے اور کامیابی کی راہ پر گامزن ہے۔

فکر و تحقیق ،اردو دنیا ،بچوں کی دنیا: قومی اردو کونسل حکومت ہند کی ایک نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اس ادارے نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے اور انسائیکلوپیڈیا ولغات، تاریخ،تعلیم و تدریس، حیات و خدمات، زبان ولسانیات، سائنس،تکنیک و جغرافیہ، سماجیات، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری و کتابیات، معاشیات، تجارت، نفسیات اور بچوں کے ادب سے متعلق موضوعات پر تقریباً 1500 کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کتابوں میں ادبیات پر تقریباً 300 سے زائد اور بچوں کے ادب کی 302 کتابیں شامل ہیں۔ یہ ادارہ نہ صرف دنیا کے مختلف علوم وفنون پر کتابیں شائع کر چکا ہے بلکہ بچوں کے ادب کا ایک عظیم ذخیرہ قومی اردو کونسل نے اپنی مطبوعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔ بچوں کے ادب کے علاوہ کونسل نے این سی ای آر ٹی کی کتابوں کا ترجمہ بھی شائع کرایا ہے، ریاضی، کامرس جیسے موضوعات کی درسی کتابیں بھی کونسل کے اشاعتی پروگرام کا حصہ رہی ہیں۔

قومی اردو کونسل(ترقی اردو بیورو) نے اپنے آغاز کے کچھ برسوں بعد ہی اردو صحافت کی سمت میں بھی کافی اہم پیش رفت کی تھی اور 1989 میں ایک ششماہی ادبی و تحقیقی مجلّے 'فکر و تحقیق' کا آغاز کیا۔فکر و تحقیق کا یہ شمارہ جنوری تا جون 1989 کا شمارہ تھا جس میں 23 مقالات شائع کیے گئے تھے یہ مقالے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔یہ جریدہ دسمبر 1992 تک ششماہی کے طور پر شائع ہوتا رہا۔اس کے بعد لگ بھگ تین برسوں تک اس کی اشاعت موقوف رہی اور ترقی اردو بیورو کو قومی اردو کونسل میں ضم کردینے کے بعد فکر و تحقیق کا پہلا شمارہ جنوری 1997 میں شائع ہوا اور اس رسالے کو جولائی 1998 میں سہ ماہی کردیا گیا۔اس میں زیادہ تر ادبی تحقیق و تنقید سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں۔رسالے نے اپنی منفرد تحقیقی و علمی پیش کش سے اردو کے ادبی حلقوں میں پہچان بنائی ہے۔داغ دہلوی،فیض،مخدوم،منٹو،میراجی،نئی غزل اور نئے افسانے پر خصوصی اشاعتوں نے رسالے کے وقار میں اضافہ کردیا ہے۔

قومی اردو کونسل کا دوسرا رسالہ اردو دنیا ہے جو قومی اردو کونسل کے خبر نامے کے طور پر نکلتا تھا، پہلے یہ رسالہ سہ ماہی تھا بعد میں اسے ماہانہ کردیا گیا۔اردو دنیا کا شمارہ نئے دم خم کے ساتھ پہلی بار جولائی تا ستمبر 1997 میں شائع ہوا تھا۔اس رسالے میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے مضامین و نگارشات شائع کی جاتی ہیں کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں۔اردو تعلیم اور اردو کتابوں کی طباعت و تقسیم، اردو کا موجودہ منظرنامہ،اردو تحقیق و تنقید کی سمت و رفتار کے علاوہ طلبا کو تعلیم کی جانب راغب کرنے کی کوششوں میں مصروف یہ رسالہ اپنے منفرد اسلوب کے لیے جانا جاتا ہے۔ رسالے میں خصوصاً طلباء کی دلچسپیوں کی چیزیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ ادب اور صحافت سے متعلق مواد بھی مل جاتے ہیں۔اگست 2011 سے اس رسالے کو بڑے سائز میں پورے رنگین صفحات پر شائع کیا جانے لگا ہے۔یہ رسالہ اپنی منفرد پیش کش،بہترین طباعت اور خوبصورت و دیدہ زیب گیٹ اپ اور نئے نئے موضوعات پر مبنی مضامین کے لیے جانا جاتا ہے۔یہ ہندوستان کا سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والا اردو ماہنامہ بن چکا ہے۔رسالے میں لگاتار نئے اور اچھوتے

موضوعات پر مضامین شائع ہورہے ہیں۔مخمور سعیدی پر خصوصی گوشہ، ہندوستانی سنیما کے سو برس مکمل ہونے پر خصوصی شمارہ بھی شائع کیا گیا ہے۔گاہے بگاہے اہم شاعروں، ادیبوں پر خصوصی گوشے بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔کور اسٹوری کے تحت نئے موضوعات پر مضامین کی اشاعت اس رسالے کی اہم خوبی ہے۔

قومی اردو کونسل نے بچوں کے ادب کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر جون 2013 سے بچوں کے لیے ایک رنگین رسالہ بچوں کی دنیا کا آغاز کیا ہے، جس کی تعداد اشاعت دسمبر 2013 تک 25000 تک پہنچ چکی ہے۔بہت کم وقت میں اس رسالے نے مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

پاپولر ادب (ڈائجسٹ): آزادی اور وطن کی تقسیم کے بعد اردو ادب اور صحافت پر ایک جمود سا طاری ہوگیا تھا۔ ادبی رسالے یوں تو بڑی تعداد میں شائع ہورہے تھے لیکن ان کی پہنچ عام افراد تک کم ہی تھی۔ یہ ادبی رسالے ایک خاص حلقے تک ہی محدود تھے ایسے حالات میں ڈائجسٹوں اور پاپولر ادب کے رسالوں نے اردو ادب اور زبان کی زبوں حالی کو دور کرتے ہوئے اردو ادب اور صحافت کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہندوستان میں بھلے ہی ڈائجسٹوں کو آج بھی معیاری ادب کے زمرے میں نہ رکھا جاتا ہو لیکن پاکستان میں ڈائجسٹوں کو اردو ادب کا ہی ایک حصہ مانا جاتا ہے۔بھلے ہی پاپولر ادب پر سطحی ادب اور نچلے درجے کے ادب کا الزام لگتا رہا ہو لیکن پاپولر ادب سے اردو ادب کو کہیں نہ کہیں فائدہ ہی ہوا ہے۔ابن صفی جیسے ادیب کے ناولوں کو پڑھ کر نہ جانے کتنے افراد آج سنجیدہ ادب کی خدمت کررہے ہیں، ابن صفی کے علاوہ،محی الدین نواب، ایم اے راحت، سلامت علی مہدی، اظہار اثر، قانون والا، ہمایوں اقبال، مشتاق احمد قریشی، جمیل احمد صدیقی، کنور حشمت علی خاں، شکیل جمالی، گلشن نندا جیسے نہ جانے کتنے ادیب ہیں جن کے ناولوں کو آج بھی بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔اردو زبان وادب میں ابن صفی کی خدمات سے انکار ناممکن ہے۔اس ناول نگار نے اردو کے بے شمار افراد کو ادیب بنادیا اور آج وہ اردو ادب و زبان کی خدمت کررہے ہیں، لیکن خود ابن صفی کو وہ مرتبہ ومقام آج تک نہیں مل سکا جس کے وہ اہل ہیں۔

آزادی کے بعد جہاں اردو کی ادبی صحافت نے ترقی کے نئے دور سے رابطے استوار کیے وہیں اردو زبان میں ایک نیا ادب پاپولر ادب کے نام سے مشہور ہوا اور اردو زبان میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر رسائل کی ایک لمبی فہرست بنائی جاسکتی ہے جو پاپولر ادب کا حصہ تھے۔ الہ آباد سے رومانی دنیا، جاسوسی دنیا، دہلی سے واقعات، فاتح شاہین، ہما، ھدیٰ، بانو، پاکیزہ آنچل، محراب شبستان، سب رنگ ڈائجسٹ، محراب، خاتون مشرق، گلابی کرن، کبریٰ، آنچل، اظہار اثر، مجرم، آتش گل، نیا عالمی ڈائجسٹ، ہزار رنگ، چہار رنگ، شمع، کھلونا، تلاش، نکہت گل، ڈائجسٹ نماوغیرہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ڈائجسٹ اور جریدے آج بھی شائع ہورہے ہیں اور اردو جاننے والا ایک بڑا طبقہ ان رسائل وجرائد کو مستقل اپنے مطالعے میں رکھتا ہے۔ پاپولر ادب میں دو تین رسائل اس معاملے میں اہم ہیں کہ انھوں نے ادب کی خدمت بھی کافی کی ہے۔ مولانا عبدالوحید صدیقی کا شروع کیا ہوا 'ہما' ڈائجسٹ قابل ذکر ہے۔ اس ڈائجسٹ نے اردو کی بقا اور اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے میں کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اردو تحریک نمبر، اردو نمبر، سرسید احمد نمبر، علی گڑھ تحریک نمبر، اقبال صدی نمبر، غالب نمبراور بہادر شاہ ظفر نمبر جیسے ضخیم اور تاریخی نمبرات شائع کرنے کا شرف ہما کو حاصل ہے۔ ہما کے علاوہ محراب، خاتون مشرق، آتش گل، پاکیزہ آنچل جیسے رسائل بھی ادب کی خدمت کرنے میں کسی طور پیچھے نہیں رہے ہیں اور ان رسائل میں اردو کے خالص ادب کے تعلق سے مضامین بھی شامل اشاعت ہوتے رہے ہیں۔

ہندوستان میں رسائل وجرائد کی ادبی حیثیت

اردو کی ادبی صحافت کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسالوں نے اپنی مقصدیت پر قائم رہ کر اپنے موضوعات کو بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔ رسائل کی یوں تو ایک لمبی فہرست ہے اور ہندوستان میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بڑی تعداد میں اردو رسائل منظر عام پر آئے ہیں لیکن ان میں سے بہت کم رسائل باقی رہے

اورادبی افق پراپنا معیار بلند کر سکے۔ ایسے رسائل میں آزادی سے قبل شائع ہونے والے ماہنامہ شاعر، سب رس، آجکل اور نیادور کا نام لیاجاسکتا ہے۔ ماہنامہ شاعر آج بھی پوری آب وتاب سے شائع ہورہاہے۔ اس نے اپنی ایک منفرد ادبی شناخت قائم کی ہے۔ اس رسالے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس کے ضخیم نمبر ایک دستاویز کی شکل رکھتے ہیں۔ استادشاعرسیماب اکبرآبادی کے ذریعے شروع کیا گیا یہ رسالہ آج پوری آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔ ان دنوں اس کے مدیر افتخار امام صدیقی ہیں۔ اس رسالے نے وقت وحالات کی تبدیلیوں کو اچھے انداز میں قبول کرتے ہوئے زمانے کی نزاکت کوسمجھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ رسالہ نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک میں بھی کافی مشہور ومقبول ہے۔ اس کا منفرد کالم اردو کی نئی بستیاں ہیں جو رسالے کو دوسرے ادبی رسالوں سے ممتاز ومنفرد بناتا ہے۔ اس کالم کے تحت اردوزبان وادب کے غیر ممالک میں مقیم شعرا وادبا حضرات کی تخلیقات کو پیش کیاجاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجلّے میں شائع ہونے والی بحثیں بھی اسے ایک انفرادی شناخت عطاکرتی ہیں۔ جدید دور سے ہم آہنگی کو برقرار رکھتے ہوئے رسالے میں جدیدعلوم کمپیوٹر،انٹرنیٹ سےمتعلق بھی مضامین اورتخلیقات گاہے بہ گاہے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ رسالے کے موضوعات میں کافی تنوع ہے اورمختلف ادبی وغیر ادبی موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے رسالے میں زبان عام فہم ہے اورتھوڑا مغربی یاجدید انداز لیے ہوئے ہے، جسے ایک عام قاری بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔اس رسالے میں شائع ہونے والے تمام شعرا وادبا کے علاوہ اکثر اہم ادبی شخصیات کے نام وپتے فون نمبر بھی شائع کیے جاتے ہیں، جس سے ادبی حلقے کو کافی فائدہ پہنچتا ہے، اورکوئی بھی قاری،قلم کار سے رابطہ کرسکتا ہے۔ رسالے میں مضامین،افسانے اورغزلیں توشائع ہوتی ہی ہیں ساتھ میں غیر ممالک میں اردو کی صورتحال کے حوالے سے کافی اہم معلومات شائع کی جاتی ہیں، جن سے اردو کے قاری کافی فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

ماہنامہ سب رس جنوبی ہندوستان کے شہر حیدرآباد سے شائع ہونے والا ایک قدیم رسالہ ہے جو جنوری1938 سے شائع ہورہاہے۔ اس میں اعلیٰ پائے کے تنقیدی مضامین

کے علاوہ غزلوں، نظموں اور افسانوں کو جگہ دی جاتی ہے۔ اس کی زبان دکنی اردو کی چاشنی سے مزین ہوتی ہے۔ اس کے موضوعات میں دکنی ادب کی تاریخ وتہذیب، دکنی ادب کی تنقید وتحقیق شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف تقریبات کے حوالے سے خبریں اور رپورٹ بھی شائع کی جاتی رہی ہیں۔ سب رس میں اہم تحقیقی شخصیات کو بھی موضوع بحث بنایا جاتا ہے اور رسالے کے دکنی ادب پر مبنی قلی قطب شاہ نمبر، ادارہ نمبر، یوم زور نمبر، نجیب اشرف نمبر، ہاشمی نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس رسالے کو دکنی ادب کے فروغ اور تحقیق کے لیے ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔ یہ رسالہ آج بھی شائع ہورہاہے اوردکنی ادب کی ترقی میں اہم کردار اداکررہاہے۔ پروفیسر مغنی تبسم اور بیگ احساس کی ادارت میں رسالے نے ادب وزبان کی آبیاری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

ماہنامہ آجکل سرکاری رسالہ ہے اور 1942 سے شائع ہورہاہے۔ اس رسالے میں ادبی مضامین کے علاوہ تاریخی، لسانی، تعلیمی، سیاسی، تہذیبی مضامین کو بھی جگہ ملتی رہی ہے حکومت کی پالیسیوں پر مبنی مضامین وتخلیقات کو بھی شائع کیا جاتا ہے۔ رسالے نے موسیقی نمبر، امیر خسرو نمبر، اندرا گاندھی نمبر، جیسے دستاویزی نمبر بھی شائع کیے ہیں جو خالص ادبی نمبروں کے زمرے میں نہیں رکھے جاسکتے۔ رسالے میں جدید ٹکنالوجی سے متعلق مضامین بھی چھپتے ہیں۔ رسالہ آجکل بڑے لمبے عرصے سے شائع ہورہاہے اور ملک میں اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ زبان عام فہم اور فصیح ہوتی ہے۔غزل،نظم، اوردوسری اصناف کے علاوہ بہترین افسانے شمارے کو اور بھی جاذب بناتے ہیں۔

نیادور اتر پردیش حکومت کا سرکاری رسالہ ہے، جسے علی جوا دزیدی نے شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ 1946 سے نکل رہا ہے۔ اس رسالے نے اردو ادب کے فروغ وترقی میں کافی اہم کرداراداکیا ہے۔ نیادور میں غزلوں نظموں، افسانوں کے علاوہ حکومت کی اشاعتی سرگرمیوں سے متعلق مضامین بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ اس کی زبان نہایت عام فہم ہوتی ہے اور اس کے مدیران نے رسالے کو انفرادی شناخت عطا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ فی الحال ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اس کے مدیر ہیں۔ اس رسالے کی اپنی امتیازی

شناخت رہی ہے۔ سرکاری رسالہ ہوتے ہوئے بھی ادب کے ضخیم اور دستاویزی نمبرات شائع کیے ہیں۔ ہرایک سال میں دوتین خصوصی شمارے شائع ہوجاتے ہیں جو اس رسالے کو اور بھی انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ حال ہی میں شکیل بدایونی نمبر اور میر تقی میر نمبر شائع ہوئے ہیں جو نایاب تخلیقات اور نادر تحریروں سے مزین ہیں۔ رسالے میں اردو ادب کی تمام اصناف کا احاطہ کیا جاتا ہے اورغزلوں،نظموں، افسانوں کے علاوہ انشائیوں، خاکوں، دوہے، گیت وغیرہ کو بھی جگہ ملتی رہی ہے۔

سہ ماہی اردو ادب جس کی شروعات آزادی کے بعد نئے دور میں علی گڑھ سے جولائی 1950 میں ہوئی تھی۔ یہ قدیم رسالہ 1922 سے اردو کے نام سے شائع ہورہا تھا۔ اسے مولوی عبدالحق شائع کرتے تھے۔آزادی کے بعد آل احمد سرور نے علی گڑھ سے اس کی شروعات کی۔ اس رسالے میں تاریخی اورتحقیقی مضامین کو کافی جگہ ملتی ہے۔ اردو کے کلاسیکی ادب پر خاصے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ زبان خالص اردو کی چاشنی سے مزین ہوتی ہے۔ فی الحال ڈاکٹر اسلم پرویز اس کے مدیر ہیں۔

شب خون الہ آباد سے شائع ہوتا تھا۔ یہ جدیدیت کا علمبردار رسالہ تھا اس میں مغربی ادب پرزیادہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ جدیدیت کے حوالے سے ہی نظمیں، غزلیں اورمضامین کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس میں مغربی ادب ومفکرین اور ادبا وشعرا کے حوالے سے بھی گفتگو کی جاتی رہی ہے۔ یہ رسالہ جدیدیت کے فروغ میں اپنی خاص شناخت قائم کرنے میں ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

کتاب نما چھوٹے سائز کارسالہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اعلیٰ معیار کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس رسالے کی ایک منفرد شناخت اس کا مہمان اداریہ ہے جو ہرماہ ایک کہنہ مشق ادیب شاعر، ماہر تعلیم یا محقق وتنقید نگارتحریر کرتا ہے۔ غلام ربانی تاباں اور بعد میں شاہد علی خاں نے اس رسالے کو بلندیوں پر پہنچانے میں کوئی کسرنہیں چھوڑی۔ ہمایوں ظفر زیدی کی ادارت میں بھی رسالہ آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ رسالے میں افسانوں، تنقیدی مضامین، غزلوں، نظموں کتابوں پرتبصرے، قارئین کی آراء وغیرہ شائع کی جاتی ہیں، اس

کے موضوعات سے غیر جانب داری جھلکتی ہے۔ ترقی پسند ادبا کی تحریروں کے ساتھ ساتھ جدید ادب کے شعرا وادبا کی تحریروں کو بھی یکساں طور پر جگہ ملتی رہی ہے اور یہ رسالہ اردو ادب کے فروغ میں اپنی بے لوث خدمات کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔

ایوان اردو دہلی اردو اکادمی کا ترجمان رسالہ ہے اور 1987 سے شائع ہورہا ہے۔ سرکاری پالیسیوں کو عوام کے سامنے لانے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی تاریخ وتہذیب سے متعلق مضامین بھی اس میں بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس رسالے میں تنقیدی وتحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ افسانوں اورشعری تخلیقات کو بھی جگہ دی جاتی ہے اس کے اہم موضوعات میں تنقیدی مضامین، خاکے، نظمیں، غزلیں، تبصرے، خبرنامے، شعری عنوانات، آپ کی رائے وغیرہ ہیں۔ رسالے کی زبان عام فہم ہوتی ہے اور ایک عام قاری بھی نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ایوان اردو آج بھی شان وشوکت سے شائع ہورہاہے۔ سرکاری رسالہ ہوتے ہوئے بھی ایوان اردو نے ادبی موضوعات پر مبنی دستاویزی نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ اس رسالے کی اپنی الگ انفرادی شناخت رہی ہے۔ رسالے کے ساتھ شروع سے ہی نامور شعرا وادبا جڑے رہے ہیں۔ پروفیسر قمر ئیس، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، پروفیسر عنوان چشتی، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، سید شریف الحسن نقوی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ذہن جدید اردو زبان کا رسالہ ہوتے ہوئے بھی دوسرے تمام رسالوں سے منفرد ہے۔ اسے معروف شاعر زبیر رضوی نے 1990 میں شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے لیے جانا جاتا ہے۔ یہ واحد رسالہ ہے جس میں تمام فنون لطیفہ پر مبنی موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ ہر ماہ غزلوں، نظموں، افسانوں اور مضامین کے علاوہ فلم، تھیٹر، لوک ادب، غیر ملکی ادیب وشاعر وغیرہ سے متعلق مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ رسالہ دوسری زبانوں کے رسائل کی طرز پر شروع کیا گیا تھا۔ آج بھی اپنے منفرد انداز بیان اور ممتاز لہجے کے لیے اردو حلقے میں مقبول ہے۔ جدیدیت کی اشاعت وفروغ میں جن رسائل نے اہم کردار کیا ہے ان میں زبیر رضوی کا ذہن جدید کافی مقبول ومشہور ہے۔

جدیدیت کے نقوش کونمایاں کرنے اورعصری تقاضوں کو بہتر ڈھنگ سے پورا کرنے میں ذہن جدید نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اعتدال پسندی کے ساتھ ادب کی سچی خدمت، ادب آرٹ اور کلچر کی صحیح نمائندگی کرنے میں یہ رسالہ پیش پیش رہاہے۔ جدیدیت کے ساتھ ساتھ اس رسالے میں خالص ادبی وثقافتی رجحان بھی نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کے علاوہ ترقی پسندی کے عناصر بھی اس رسالے کی شان بڑھاتے ہیں۔

❍

حواشی

1. روز نامہ اعتماد، حیدرآباد، 20 دسمبر 2005 ص 5
2. جے نٹراجن، بھارتیہ پتر کاریتا کا اتہاس، پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی 2005، ص، 72
3. ایضاً۔ص، 236
4. شمیم حنفی، مضمون، اردو ادب، آجکل اور ادب کے پچاس سال پبلی کیشنز ڈویژن ص 15
5. ڈاکٹر صالح عبد اللہ، آزادی کے بعد اردو زبان وادب، مرتب سید عبدالباری، آئی او ایس، جامعہ نگر، نئی دہلی ص 229
6. ڈاکٹر سید احمد قادری، بہار میں اردو صحافت، مکتبہ غوثیہ، نیو کریم گنج، گیا، بہار، ص 148
7. ایضاً، ص 149
8. ایضاً، ص 198-197
9. ماہنامہ آجکل، گاندھی نمبر، پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی۔ص 85
10. ڈاکٹر جمیل اختر، مضمون، آجکل اردو کے باسٹھ سال، ماہنامہ آجکل، پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی، اگست 2004 ص 11
11. ماہنامہ آجکل، پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی، اگست 1948 ص 6
12. عرش ملسیانی، آجکل کے 28 برس، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، جون 1970 ص 7
13. بحوالہ ماہنامہ آجکل، پبلی کیشنز ڈویزن، دہلی، مارچ 1957، بیک کور پیج
14. جوگندر پال، مضمون آجکل (اردو) ایک تاثر، ماہنامہ آجکل اگست 2004 ص 5
15. رسالہ نوائے ادب انجمن اسلام بمبئی، جنوری 1950 ص 4
16. ایضاً، ص 6
17. ایضاً، ص 95
18. سہ ماہی اردو ادب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، جولائی 1950 پہلا شمارہ، ص 5
19. ایضاً، ص 1

20. سہ ماہی اردو ادب،جنوری1961 انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) ص3

21. رسالہ نوائے ادب،بمبئی، اکتوبر 1950 عرض حال اداریہ

22. سہ ماہی اردو ادب،شمارہ 3 ، 1972 انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) ص152

23. سہ ماہی اردو ادب شمارہ 3،4، 1973 انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ص4

24. سہ ماہی اردو ادب شمارہ 1اور2 ، 1974 انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ص 10

25. سہ ماہی اردو ادب شمارہ 3،4، 1974 انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ص4

26. سہ ماہی اردو ادب شمارہ 1، 1979 انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ص 7

27. سہ ماہی اردو ادب شمارہ 2 اور 3 ، 1979 انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ص 4

28. سہ ماہی اردو ادب شمارہ 1 (جنوری،فروری، مارچ)1998 انجمن ترقی اردو ہند (دہلی)ص 12

29. محمد نوشاد عالم، ادبی شناخت۔ چندونگر، کراول نگر روڈ، دہلی، ص110

30. ڈاکٹر شمیم نکہت مضمون، اردو ادبی رسائل کے چند اہم خاص نمبر، روزنامہ قومی آواز، دہلی 1982 ص 111

31. عرفان عباسی، مضمون نیادور کے پچاس سال،ماہنامہ نیادور،لکھنؤ مارچ،اپریل،مئی 1995 ص88

32. ماہنامہ نیادور جمہوریت نمبر،لکھنؤ، اتر پردیش،اداریہ۔فروری 1957 ص 4,3

33. احمد ابراہیم علوی،مضمون نیادور، پچاس سال کا سفر۔ نیادورنصف صدی نمبر مارچ، اپریل مئی 1995،ص101

34. اطہر مسعود خاں اشاریہ نیادور۔ رامپور رضالائبریری، رامپور،2010،ص 43

35. ایضاً،ص78

36. ماہنامہ نیا دور،یادرفتگاں نمبر،لکھنؤ، اتر پردیش، اپریل تا ستمبر، 1988 ص3

37. ماہنامہ نیا دور،عثمان عارف نمبر،لکھنؤ، اتر پردیش مارچ،اپریل 1987،ص 4

38. ماہنامہ نیا دور،لکھنؤ اتر پردیش، جنوری، مارچ 1986 ص3

39. ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ اتر پردیش، اپریل تا نومبر 1986 ص 2

40. ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ اتر پردیش، مارچ اپریل، مئی 1983 ص 3

41. ڈاکٹر شمیم نکہت، اردو ادبی رسائل کے چند خاص نمبر، روزنامہ قومی آواز نئی دہلی۔ اردو بک سیلر پبلشر نمبر، نئی دہلی، ص 114

42. ماہنامہ نیا دور، منشی نولکشور نمبر، لکھنؤ، اتر پردیش، نومبر، دسمبر 1980 ص 3

43. ماہنامہ نیا دور، ایک شمارہ شمع حریت کے نام، لکھنؤ اتر پردیش، اگست 1998، ص2

44. ماہنامہ نیادور نصف صدی نمبر، لکھنؤ اتر پردیش، مارچ اپریل مئی 1995 ص 4,5

45. حضور سہسوانی نظم، ماہنامہ نیادور نصف صدی نمبر، لکھنؤ، اتر پردیش، مارچ اپریل مئی 1995، ص 56

46. سہ ماہی سوغات، بنگلور جولائی، 1959، ص70

47. ڈاکٹر انیس صدیقی، کرناٹک میں اردو صحافت، افلاک پبلی کیشنز، گلبرگہ، کرناٹک، 2003، ص۔ 161

48. ص 5 اداریہ، حالی نمبر، سہ ماہی فکر ونظر، اکتوبر 1991

49. ماہنامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، جنوری 1964، ص 1

50. ماہنامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، مارچ 1965، ص 1

51. ایضاً۔ مارچ 1964

52. ایضاً، اداریہ، مئی 1964 ص 1

53. ایضاً، اداریہ، مارچ 1965 ص 1

54. ایضاً، جون 1971 ص 13

55. ایضاً، اداریہ، دسمبر 1987 ص2

56. ایضاً، جون 1981 ص 95

57. ایضاً، مئی 1990 ص37

58. ایضاً، ص 45

59. ایضاً، ستمبر 2006، ص 14
60. ایضاً، دسمبر 2006، ص 4
61. حرفِ آغاز: علی جواد زیدی (اداریہ)، دو ماہی شیرازہ مئی 1962 ص 9,10
62. ماہنامہ کتاب،، کپور مارکیٹ، لکھنؤ، جنوری 1973، ص6
63. ماہنامہ کتاب،، کپور مارکیٹ، لکھنؤ، جنوری 1973، ص127
64. ماہنامہ کتاب،، کپور مارکیٹ، لکھنؤ، جون1973 شمارہ 116، ص4
65. ڈاکٹر مظفر حنفی، مضمون، 'آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے ادبی و علمی رسائل' روزنامہ قومی آواز نئی دہلی۔ ص65
66. منظر اعظمی اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، اتر پردیش اردو اکادمی۔ ص529
67. شب خون، پہلا شمارہ، اداریہ سید اعجاز حسین، جون 1966۔ ص 3
68. شب خون، رانی منڈی الہ آباد، اداریہ، شمارہ 2، جولائی 1966 ص 3
69. خورشید الاسلام۔اردو ادب آزادی کے بعد شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1973 ص 18
70. فاروق ارگلی، مضمون شمس الرحمٰن فاروقی، روزنامہ راشٹریہ سہارا۔ 30 ستمبر 2008، ص4
71. وحید اختر۔نظری تنقید، اردو ادب آزادی کے بعد، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1973، ص45-46
72. سہ ماہی گفتگو، پہلا شمارہ 1967، ص 6
73. ص 10,11 گفتگو، 1، شمارہ 2، 1967
74. ایضاً، ص115
75. حرف آغاز، شعر و حکمت 1987، کتاب 1، ص 17
76. شعر و حکمت شمارہ 2، ص5

77. سہ ماہی عصری ادب 1972 کا تیسرا شمارہ، ادارہ تصنیف ڈی 7ماڈل ٹاؤن، دہلی، ص11
78. شعیب رضا خاں وارثی،آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی،ص41
79. ادبی چوپال، سہ ماہی، جولائی تا دسمبر، 1976،ص4
80. شاہد ماہلی، سہ ماہی معیار،صفدر جنگ ڈیولپمنٹ ایریا،حوض خاص،نئی دہلی، دسمبر 1977، ص399-400
81. شعیب رضا خاں وارثی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی،ص19
82. سہ ماہی تناظر، اداریہ، چوبیسویں پیشکش، مئی1990 تا جون1991،ص6
83. عصری آگہی ص 5
84. ڈاکٹر شعیب رضا وارثی،آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ،ص173
85. اردو اکادمی کا پچیس سالہ سفر، سی پی او بلڈنگ، کشمیری گیٹ دہلی،ص37
86. ایضاً،ص58
87. ایوان اردو، اردو اکادمی دہلی، مئی 1988،ص4
88. فاروق انصاری، اشاریہ ایوان اردو،شاہین ایڈورٹائزرس،423 مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی،1993،ص 6
89. اردو اکادمی کا پچیس سالہ سفر، سی پی او بلڈنگ، کشمیری گیٹ دہلی،ص58
89. ایوان اردو، جدید ہندی ادب نمبر، اگست 1994 ص 5
91. سہ ماہی تکمیل بھیونڈی، اداریہ،جنوری 1990،ص4
92. پیش رو، پیش کش۔مقدمہ اداریہ۔155 کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی، جون 1988 سے اگست1988 ،شمارہ ایک۔ص 2-3

93. ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر، نئی دہلی، جون 1991 ص 83-84
94. مخمور سعیدی، ماہنامہ آجکل، نومبر 1990
95. ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، ستمبر 2008

اردو کے اہم رسائل و جرائد کا فنّی جائزہ

اداریہ: تعریف و تاریخ

اردو رسائل کی ترقی اور انھیں ایک اہم مقام عطا کرنے میں جن باتوں اور نکات کا اہم رول رہا ہے، ان میں اداریہ سب سے خاص ہے، کسی بھی رسالے یا اخبار کی ترقی کا دارومدار اس کے اداریے پر منحصر ہوتا ہے۔ اداریہ سے ہی اخبار یا رسالے کی پالیسی یا اس کے اپنے نظریے کی اشاعت ہوتی ہے۔ اداریے کے ذریعے ہی وہ اپنی باتیں عوام و قاری تک پہنچاتا ہے۔ اردو صحافت میں اداریوں کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ صحافت کی تاریخ گواہ ہے کہ اداریوں کے لیے صحافیوں کو پھانسی کے پھندے سے لٹکنے پر مجبور کردیا گیا تھا۔ مولوی محمد باقر، سر سید احمد خاں، ظفر علی خان، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد جیسے اہم صحافیوں کے لکھے اداریوں نے ان کی صحافت میں چار چاند لگائے اور آج بھی ان کے اداریوں کی مقبولیت برقرار ہے۔ اداریہ کسی بھی اخبار یا رسالے کی جان ہوتا ہے۔

اداریہ کسی ایسے مضمون کو کہیں گے جس میں مدیر کسی اہم خبر کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر واضح کرتا ہے۔ زیادہ تر اداریوں میں کسی خبر پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ اداریے حالات حاضرہ کی مناسبت سے لکھے جانے چاہئیں۔ اداریے ایسے ہوں کہ پڑھنے والا پوچھنے پر

مجبور ہو جائے۔ اداریہ کسی بھی اخبار یا رسالے کا ایک خمیر کہلاتا ہے۔ اداریے میں اخبار کے نظریات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اداریہ کے ذریعے عوام تک کسی خبر کے تاثر اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اداریے میں کسی بھی اخبار یا رسائل کی رائے پسند، ناپسند،انداز بیان، اسلوب اور مختلف نکات کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اداریہ وہی لکھتا ہے جو اخبار میں طویل عرصے سے کام کر رہا ہے اور اسے ادارت کا کافی تجربہ ہے۔ اداریہ نویسی انتہائی مشکل اور بہت زیادہ ذمے داری بھرا کام ہے۔ اداریہ کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدیر کی تحریر، مدیر کا اظہار خیال ہے۔اردو صحافت کے شروعاتی دور میں اداریے بہت کم شائع ہوتے تھے اور انگریزی طرز پر انھیں شائع کیا جاتا تھا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آتی گئی اور اسے سر سید احمد خاں نے ایک اہم سمت دی۔ سر سید احمد خاں نے اپنے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے اداریہ نویسی کو ایک نیا مقام اور نئی سمت دی۔ سر سید احمد خاں کے اداریوں نے قوم کو، معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی ذمے داری کا احساس دلانے میں اہم رول ادا کیا۔ بعد کے صحافیوں نے سر سید احمد خاں کے ادارتی اصولوں کی پیروی کی اور اداریہ نویسی کو فروغ دیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر شریف الدین لکھتے ہیں:

> ’’بلاشبہ اردو صحافت کے اس دور کا امام سر سید کو تصور کیا جاتا ہے۔ سر سید نے 1866 میں سائنٹفک سوسائٹی اور 1870 میں تہذیب الاخلاق جاری کیا جنھوں نے اردو اداریہ نگاری کو ایک صحیح سمت عطا کی اور اداریوں کو حقیقی معنوں میں اخبار کی روح بنادیا اور پابندی سے اداریے شائع ہونے لگے۔ چونکہ سر سید نے علمی وادبی صحافت کا آغاز کیا تھا اس لیے انھوں نے بھاری بھرکم اور عربی وفارسی کے گنجلک اور پیچیدہ لفظوں سے اپنے دامن کو بچایا اور عام فہم، سادہ وسلیس زبان میں اداریے لکھ کر اردو صحافت کو ایک نئی راہ دکھائی اور اردو میں اداریہ نویسی کے فن کو خوب اجاگر کیا اور اردو صحافت کے اس اہم ترین دوسرے دور میں مختصر اداریوں کا رواج چل پڑا۔‘‘(1)

صحافت کو آغاز سے ہی ایک اہم صنف قرار دیا گیا ہے۔ اس شعبے میں کام کرنے والوں کی بڑی عزت ہوتی رہی ہے۔ صحافت کا دارومدار حق گوئی، بیبا کی اور دیانت داری وایمانداری پر منحصر ہے۔ صحافت کی تاریخ گواہ ہے کہ وہی صحافی کامیاب ہوا ہے جس نے صحافت کے ذریعے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے صحافت کی ہے۔ اداریہ نگاری کافی صبر آزما اور مہارت کا کام ہے اس کے لیے حالات حاضرہ اور تمام چیزوں کی جانکاری کے بغیر قلم بھی نہیں اٹھا یا جاسکتا۔ اداریے کی کامیابی میں اسلوب، مقاصد و نظریات، سچائی، عوام کی پسند وناپسند اور ان پر پڑنے والے اثرات اورانھیں صحیح بات بتانے کی کوشش جیسے نکات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

عام طور پر آج اداریے کی اصطلاح اتنی عام ہے کہ ہرکوئی اس کے معنی ومفہوم سے آشنا ہے۔ اگر صاف اورسیدھے الفاظ میں اداریے کی تعریف کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اداریہ اخبار کے ذریعے اپنے نظریات کو عوام کے سامنے رکھنے کا نام ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اداریہ کسی اخبار کے ذریعے حالات حاضرہ پر اس کی رائے ہوتا ہے۔ آج کے دور کے لیے ایسی سیدھی سادی تعریف مناسب نہیں ہے کیونکہ وقت وحالات کے ساتھ سب کچھ تبدیل ہوچکا ہے۔ پہلے پہل اخبار میں دوچار لوگ ہی کام کرتے تھے اور اداریہ خود مدیر لکھتا تھا لیکن اب مدیر ایک انتظامی سربراہ کے طور پر کام کرتا ہے اور اس کے معاون کے طور پر کام کرنے والے افراد نائب مدیر، معاون مدیر ہی اداریہ لکھتے ہیں۔ اب ایک چھوٹے سے اخبار میں بھی 25 تا 30 افراد کام کرتے ہیں اور آج کل کے اداریے کسی ایک مدیر کی ذاتی رائے نہیں ہوتے بلکہ اسے لکھنے کے بعد مدیراعلیٰ کی پسند نا پسند اور اس اداریے میں ردو بدل کرنے کے بعد ہی اسے حتمی شکل دی جاتی ہے۔ اب کسی بھی اخبار میں اداریہ کے نیچے اس کے لکھنے والے کا نام نہیں ہوتا،بس یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ اخبار کی رائے اور اخبار کا نقطۂ نظر ہے۔ اداریے کے اس جدید پس منظر میں اس کی تعریف بھی بدل گئی ہے اور کچھ اہم صحافیوں نے اس کی تعریف یوں بیان کی ہے۔ سر جیمز بیری کے مطابق:

''اداریہ رائے کو متاثر یا قاری کو محظوظ کرنے کے لیے حقائق اور نقطۂ نظر کو
مختصر، منطقی اور خوشگوار انداز میں پیش کرنے کا نام ہے اسے خبروں کی ایسی توجہ
قرار دیا جاسکتا ہے جس سے عام قاری کسی خاص خبر کو واضح طور پر سمجھ سکے۔'' (2)

جبکہ ماڈرن جرنلزم کے مصنف کارل جی ملیر نے لکھا ہے :

''اداریہ اس مضمون کو کہتے ہیں جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہو اور جس
میں قاری کی سوچ ایسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو جو مضمون نگار کے
خیال میں صحیح راہ ہو۔ اداریہ نویس قاری کو اپنے نقطۂ نظر سے متفق کرنے
کی کوشش کرتا ہے اور ایسی باتیں لکھتا ہے جس سے قاری قائل ہوجائے
اور موافق ردعمل ظاہر کرے۔ اداریہ نویس مختلف ترغیبی طریقوں سے کام
لے کر قاری کے جذبات واحساسات کو جائز طور پر متاثر کرتا ہے۔'' (3)

جبکہ میکس لرنر کا کہنا ہے:

''اداریہ ان رجحانات پر تبصرہ کا نام ہے جو روز مرہ کے واقعات کی تہہ میں
کارفرما ہوتے ہیں۔'' (4)

مندرجہ بالا تمام تعریفوں کے تجزیے کے بعد ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اداریوں میں حقائق کو پیش کرتے ہوئے قارئین کی صحیح رہنمائی کی جاتی ہے۔ اداریہ روزہ مرہ کی زندگی کے واقعات پر ایک رائے ہوتا ہے اداریہ ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں ملک و معاشرے کے حالات کو دکھاتے ہوئے جھوٹ، فریب مکاری اور سستی سیاست کی حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے۔ اداریہ پوری سوچ، سمجھ، غور وفکر کے ساتھ اور دماغی صلاحیتوں اورحالات حاضرہ کا عمیق مشاہدہ کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے۔ اداریہ نویس کے لیے یہ بڑی ذمے داری کا کام ہوتا ہے۔ڈاکٹر مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

''اداریہ نویس کی طرف سے کسی ہنگامی موضوع پر مباحثے میں تحریری طور پر
حصہ لینے کا نام اداریہ ہے۔''(5)

رسائل کے اداریے اخباری اداریوں سے کافی مختلف ہوتے ہیں۔ رسائل کے

اداریوں میں اس مجلّے کے وقفۂ اشاعت کے درمیان پیش آنے والے سب سے اہم واقعے پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ مختلف رسالوں میں مختلف موضوعات پر اداریے تحریر کیے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ سبھی رسالوں میں اداریے حالات حاضرہ پر ہی تحریر کیے جائیں۔ اداریہ کا انتخاب مجلّے کے موضوع اور اس کی مناسبت پر منحصر ہے۔ اگر مجلّہ اردو ادب کا ہے تو اس میں اردو دنیا اور اردو ادب کے تعلق سے اداریے لکھے جاتے ہیں۔ اگر مجلّہ خواتین کا ہے تو اس میں خواتین کے مسائل اور ان کی دلچسپی سے متعلق اداریہ ہوتا ہے۔لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی اہم معاملہ منظرعام پر آ گیا اورعوام اس معاملے پر تنقید وتبصرہ پسند کرتے ہیں تو کسی بھی موضوع کے مجلّے پر اس مخصوص موضوع پر اداریہ تحریر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر محمد شاہد حسین اپنی کتاب ابلاغیات میں لکھتے ہیں:

> ''اداریہ نگاری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی نظریے کسی موضوع یا کسی رخ کی ہمیشہ تائید یا حمایت ہی کرتا رہے۔ اس رائے اور پالیسی میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ حالات وواقعات کی تبدیلی کے ساتھ رویوں میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔ یا نئی تفصیلات کے سامنے آنے سے تناظر بدل سکتا ہے۔ ایسی صورت میں پالیسی رائے یا حمایت میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔'' (6)

اداریہ نگاری اورخاص طور سے رسائل کی اداریہ نگاری ایک اہم اور مشکل فریضہ ہے۔ اسے بہتر طور پر وہی انجام دے سکتا ہے جو رسائل میں کافی عرصے سے کام کررہا ہو یا جس کے پاس عمیق مشاہدہ ہو اور جسے حق وباطل، خیر وشر کی تمیز ہو، جیسا کہ مدیر اردو بک ریویو محمد عارف اقبال کہتے ہیں:

> ''اداریہ نگاری درحقیقت حالات کی نبض پر انگلی رکھنے کے مترادف ہے اور اداریہ نگار ایسا نباض ہوتا ہے جو وقت کے دھارے کی سمت کو جانتا ہے۔ وہ شر اور خیر کے تمام اجزا سے اس طرح واقف ہوتا ہے جس طرح ایک عام انسان دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں تمیز کرتا ہے۔ اداریہ نگار شر کے اندر داخل خیر اور خیر میں شر کے اجزا کو بخوبی محسوس کرتا ہے۔'' (7)

اداریہ نویسی میں اداریہ لکھنے کے اصولوں کی پاسداری کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ مسابقت اور مقابلے کا دور ہے۔ ہراخبار یا رسالہ کسی دوسرے اخبار یا جریدے کی مخالفت میں لکھنے میں فخرمحسوس کرتا ہے جبکہ صحافت یہ نہیں کہتی۔صحافت کادوسرا نام سچائی اور دیانت داری ہے۔ اداریہ نویس اورمدیر اگر اس طرح کے اداریےتحریر کریں جس میں کسی کی دل شکنی کی گئی ہو،کسی پر نشانہ لگایا گیا ہو، بغیرتحقیق کےکسی پر سیدھا وار کیا گیا ہوتو وہ اداریہ نویسی کےاصولوں کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ڈاکٹرغضنفر اقبال نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> ’’اداریہ نگار ایک ذمہ دارشخص ہوتا ہے۔ اس کی تحریر میں اشتعال انگیزی کی بجائے نرمی ہو اور وہ لعن طعن سے اجتناب کرے۔ اداریوں میں کسی کی کردارکشی اورشخصیت کشی نہ کی جائے بلکہ اس کی خامیوں اور برائیوں کو احسن انداز میں ظاہر کیا جائے تاکہ ٹھیس نہ لگے آبگینوں کو۔ اداریہ نگار ایسی حرکت نہ کرے جس سے کہ اخبار کا وقار متاثر ہو۔کسی بھی اخبار یارسالےکو اعتبار کا درجہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب وہ قلم کو امانت سمجھے اوراس کا استعمال تعمیری سطح پر کرے۔‘‘ (8)

اردو اداریوں کا ارتقا

اردوصحافت میں اگراداریوں کی تاریخ اوراس کے ارتقا کی بات کی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شروعاتی دورمیں باضابطہ اداریے کے طورپرکوئی مضمون شائع نہیں ہوتا تھا ہاں کبھی کبھی کسی خاص موضوع پر دوچارسطروں میں تبصرہ ضرورشائع کردیاجا تا تھا۔ اداریوں کاسب سے اہم اور زریں دور 1857 کی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جب اردواوردوسری تمام زبانوں کے اخبارات ورسائل نے ایک مقصد کے تحت اخبارورسائل کی شروعات کی اورصحافت کےصحیح نظریے کی اشاعت میں تعمیری کردارادا کیا۔ جنگ آزادی کی ناکامی اور بڑی تعدادمیں مسلمانوں اورہندوستانیوں کی ہلاکت نے یہاں کی عوام کوجھنجھوڑ کر رکھ دیا اورجس سے جوہوسکاوہ کرنے پر مجبور ہوگیا انگریزوں کے خلاف

ہتھیار کی جگہ قلم کا استعمال کیا جانے لگا۔ اس دور کے اداریوں میں ایک خبر کو بہت ہی پرشکوہ اورمتاثر کن انداز میں اس طرح شائع کیا جاتا تھا کہ قاری کا دل خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جائے۔ اس دور کے اداریوں کا خاص موضوع انگریزوں کے ظلم وستم، ان کے ذریعے ہندوستانیوں کی ہلاکت اور ہندستانیوں کی بے بسی وکسمپرسی تھی۔ 1858 میں شروع کیے منشی نولکشور کے اودھ اخبار میں اداریوں کو کافی جگہ دی گئی اوراداریوں پرخصوصی دھیان دیا جانے لگا۔ اس کے صفحات بھی چار سے بڑھ کر 48 ہوگئے تھے۔ اس کے اداریہ نویسوں میں غلام محمد خان، احمد حسن شوکت، سید امجد علی شہری، مرزا حیرت دہلوی، پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے عظیم لوگ شامل تھے۔ بعد میں یہ اخبارروز نامہ ہو گیا تھا اوراس کے اداریے خصوصی طورسے شائع ہونے لگے۔ اردو اخبار کے اداریے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

> ''اردواخبار میں جواداریے چھپتے تھے ان میں ایک طرف قومی مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ دوسری طرف عوام کی روزمرہ شکایات اور خواہشات منظر عام پر لائی جاتی تھیں۔'' (9)

اردوصحافت کا دوسرا دور 1857 کے بعد شروع ہوتا ہے۔اداریہ نویسی میں جو نام سب سے زیادہ اہم ہے،وہ ہے سرسید احمد خان کا، سرسید احمد خان نے اداریہ نگاری کو ایک نئی سمت عطا کی اوراپنے اخبارات ورسائل کے ذریعے صحافت کے اصولوں پر چلتے ہوئے قوم کوحقیقت اورصحیح صورتِ حال سے آشنا کیا۔ سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے ان کا تعلیمی میدان میں آگے آنا ضروری ہے۔ وہ مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے لیے یہ چاہتے تھے کہ وہ وقت کے ساتھ چلیں۔ بدلتے ہوئے زمانے سے ہم آہنگ ہوں دوسری جانب وہ انگریزوں کومسلمانوں کے مسائل ودشواریوں سے آگاہ بھی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار سائنٹفک سوسائٹی اور بعد میں اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کے ذریعے بڑے بڑے معرکے سرانجام دیے اوراپنے اخباری مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ سرسید کی صحافتی خدمات کودوسرے ہم عصر اخباروں اوررسائل نے بھی سراہا اوروہ بھی سرسید کی

طرز فکر سے متاثر ہوکر ان کا ساتھ دینے لگے۔ ان کے اداریوں کو دوسرے اخبار والے بھی شائع کیا کرتے تھے۔ اس دور کی صحافت میں کافی تبدیلیاں آنے لگی تھیں اور مختلف صحافی حضرات اداریے کا مقصد اور مطلب سمجھنے لگے تھے اور اب اخبارات رسائل میں اداریے کے لیے ایک صفحہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اودھ اخبار، نصرت الاخبار، دہلی گزٹ مہر نیم روز، لارنس گزٹ، نورالانوار، اردو پنچ، بنارس گزٹ وغیرہ اس دور کے چند مقبول اخبارات تھے جس میں اداریہ نگاری باقاعدگی سے کی جانے لگی تھی اس دور کے اداریوں کے موضوعات میں سیاسی معاملات، مسلمانوں کے حالات انگریزوں کے ظلم اور پولس کی زیادتیاں وغیرہ اہم تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ اخبارات ایسے تھے جو خاص مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور جو دوسرے مذاہب اور مسلک کے خلاف لکھتے تھے۔ ادارتی تبصروں اور اداریوں میں صحافتی چشمک بھی خوب چلتی تھی اور قارئین بھی کافی دلچسپی سے ایسے مواد پڑھتے تھے اور بے صبری سے اس طرح کے مضامین کا انتظار کرتے تھے۔ اس دور کے اخبارات مختلف حصوں میں تقسیم تھے اور اپنا الگ الگ راگ الاپ رہے تھے جیسا کہ ڈاکٹر مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

> ’’اس دور میں اخبارات مختلف دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے اور ادارتی تبصروں میں بھی ایک دوسرے کی خبر لیتے رہتے تھے۔ تنظیم الاخبار، میوگزٹ، نورافشاں اور کوکب ہند عیسائیت کے مبلغ تھے اور مسلمانوں پر کیچڑ اچھالتے تھے۔ مخبر صادق، نورالآفاق، قاسم الاخبار اور منشور محمدی، اسلام اور مسلمانوں کے ترجمان تھے اور ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ قاسم الاخبار، منشور محمدی، نورالآفاق اور نور الانوار سرسید کی مخالفت کرتے تھے لیکن پنجابی اخبار، مخبرصادق، دبدبہ سکندری اور اردو کرانیکل سرسید اور ان کی اصلاحی تحریک کے موید تھے۔ بعض اوقات کسی اخبار نویس پر حکام کی طرف سے مصیبت نازل ہوتی تو سب مقامی اخبار نویس متحد ہو جاتے۔ مثال کے طور پر لاہور کے اخبار رفاہِ عام کے ایڈیٹر محمد علی چشتی کو باغیانہ مواد چھاپنے پر ایک ماہ قید اور جرمانے کی سزا ملی تو کئی اخبارات نے احتجاج

کیا۔ اسی طرح بنارس گزٹ کے ایڈیٹر بابو گوند رگھو ناتھ راؤ سیٹھی کو سزا ملی
تو متعدد اخباروں نے احتجاج کیا۔'' (10)

اردو صحافت میں جہاں قومی اور ملکی حالات نے اہم کردار ادا کیا ہے وہیں مسلمانوں کے تعلیمی و معاشی مسائل اور سماجی صورتِ حال نے بھی صحافت کو کافی استحکام عطا کیا ہے۔ اردو صحافت کو عروج پر پہنچانے والے تمام صحافی کہیں نہ کہیں قوم کا درد اپنے سینے میں لیے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو صحافت کو کبھی کبھی تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا لیکن صحافت کی اہمیت اور ملک میں اس کے کردار کی عظمت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

اخبارات کے اداریے کا تیسرا دور روزانہ اخبارات کے اداریوں سے شروع ہوتا ہے۔ اردو کا پہلا روزانہ اخبار مولوی کبیرالدین خاں نے 1858 میں کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ اودھ اخبار بھی 1876 میں روزنامے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جنوری 1875 میں ایک تیسرا روزنامہ ''روزنامچہ پنجاب'' کے نام سے شروع ہوا۔ اس کے بعد کئی روزنامے شروع ہوئے۔ جن میں نسیم صبح، شام وصال، کوہ نور 1888، پیسہ اخبار، آئینہ نمائش 1885، پبلک آصفی 1884، خادم ہند اہم اور قابل ذکر ہیں۔ روزنامہ اخبارات کے اداریے مختصر ہوتے تھے اور ہر شمارے میں تین چار اداریے شائع کیے جاتے تھے۔ اداریوں میں اخلاقیات، اہم خبروں، سماجیات، سیاسی حالات وغیرہ کو موضوع بنایا جاتا تھا۔ اس وقت تقریباً تمام اخبارات کے خاص موضوعات میں مسلمانوں کے حالات، تعلیمی پسماندگی اور مذہبی و مسلکی تنازعات کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ روزنامہ اخبارات کے اداریوں پر خاص دھیان دیا جاتا تھا اور انھیں خبروں سے بڑھ کر اہمیت دی جاتی تھی نیز جلی حروف میں شائع کیا جاتا تھا۔ روزنامہ اخبارات کے اداریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

''ان اخباروں میں چھپنے والے اداریے نسبتاً جلی حروف میں لکھے جاتے تھے اور دوسرے مندرجات ان سے باریک خط میں ہوتے تھے۔ عام طور پر اداریے خبروں پر مبنی ہوتے تھے لیکن بعض اوقات ایسے اداریے بھی چھپتے تھے جو خبروں پر مبنی ہونے کی بجائے عمومی اور اسلامی نوعیت کے ہوتے

تھے۔ بیشتر اداریے بلاعنوان ہوتے تھے۔ البتہ اخبار عام میں خاصی مدت تک یہ صورت رہی کہ پہلا اداریہ بلاعنوان ہوتا تھا اور بعد میں چھپنے والا باعنوان، ابتدائی روزنامہ اردو اخبارات کے بعض اداریے خبروں کی حیثیت رکھتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خامی دور ہوگئی اور اس طرح کے اداریے چھپنے بند ہوگئے۔ تیسرے دور کے اداریے بھی فنی اصولوں کو ملحوظ رکھ کر نہیں لکھے جاتے تھے اور نہ ہی ان کی مخصوص ہیئت ہوتی تھی بلکہ اخبار کے اداریوں میں انفرادی انداز اور رنگ کارفرما ہوتا تھا۔ اس دور کے اداریوں میں انگریزی حکومت کی بعض پالیسیوں اورانگریزوں کی زیادتیوں پرتنقید کی گئی ہے مگر زیادہ تر اخبارات نے دبی زبان میں تنقید کی ہے صرف چند اخبارات نے جرأت سے کام لیا ہے۔'' (11)

اردو اداریوں کا چوتھا دور سرسید احمد خاں کی صحافت سے شروع ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں نے اصلاحی مقصد کو سامنے رکھ کر حق گوئی اور بیباکی کے ساتھ صحافت کی اور عقلی استدلال کو بروئے کار لاتے ہوئے مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی تعلیمی صورتِ حال کو بہتر کرنے اور سماجی پسماندگی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کے اداریوں میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے حالات کو بہتر بنانے کے علاوہ انھوں نے اردوزبان وادب اورصحافت کو بھی کافی فروغ دیا اور عام فہم اور سلیس اردو کو ادب کی زبان بنایا۔ اس دور کے اداریوں میں سرسید احمد خاں نے جہاں سیاسی حالات اورعوامی ضروریات پر قلم اٹھایا وہیں مذہبی معاملات اور اعتقاد میں بھی کافی دلچسپی لی اور مسلکی اختلافات اور فرسودہ رسوم ورواج سے مسلمانوں کو آزاد کرنے کی بھی کوشش کی۔ یہ حقیقت ہے کہ ان معاملات میں سرسید نے بہت کچھ ایسا بھی لکھا جو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو ناگوار گزرا لیکن بعد میں پورے ملک کے مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ سرسید احمد خاں نے مسلم قوم کے لیے کیا کوششیں کیں۔ ان کا لگایا ہوا پودا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے پورے ملک میں تعلیم وتمدن کی روشنی پھیلا رہا ہے اور علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی سے ہی سرسید کے عظیم رفقا اورشاگردوں نے اردو ادب وصحافت کو ایک نیا مقام دیا۔ایک نئی بلندی عطا کی۔

1898 میں سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد ان کے رفقا نے سرسید احمد کی تحریر کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1902 میں بنگال کی تقسیم نے اردو اخبارات ورسائل کو ایک نیا موضوع دیا اوراردو اخبارات نے اس واقعے پر کافی مضامین اور اداریے شائع کیے۔ 1906 میں مسلم لیگ کا قیام ہوااور بعد میں 1911 میں بنگال کی تقسیم کی منسوخی 1913 میں کانپور کی مسجد کی شہادت ایسے واقعات تھے جنھوں نے اردواخبارات کو کافی جذباتی اور اشتعال انگیز مضامین لکھنے پر مجبور کردیا۔

چوتھے دور کے اردو اداریوں میں سرسید احمد خاں کے بعد حسرت موہانی، مولانا ظفرعلی خاں، مولانا محمد علی جوہر اورمولانا ابوالکلام آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام لوگ طاقتور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مقرر، خطیب، ادیب وشاعر اور سیاست داں تھے۔ اردو ادب کے ان نامور سپوتوں کے دور میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ آسمان صحافت پر بس ان کا ہی نام تھا۔ انھوں نے اپنی صحافت اوراپنی شعلہ بیانی اورادبی طاقت کومسلمانوں کی بہتری کے لیے وقف کردیا تھا۔ ان کے اخبارات اردوئے معلیٰ، کامریڈ، ہمدرد، الہلال والبلاغ میں کوئی بھی روزانہ اخبار نہیں تھا لیکن ان اخباروں نے اردو روزناموں سے بہتر خدمات انجام دیں۔نورجہاں ثروت لکھتی ہیں:

> ’’اردو صحافت کی تاریخ پرنظرڈالتے ہیں توہمیں ایسے اخبارات بطورخاص کسی خاص طبقے میں مقبول ہوتے نظرآتے ہیں جو غیرمعمولی ذہانت اور منفرد انداز نگارش کے مالک ہوتے ہیں۔قدیم زمانے میں دہلی اردو اخبار۔ اس کے بعدتہذیب الاخلاق کے بعد زمیندار، الہلال، اورعلی گڑھ گزٹ اسی طرح کے اخبارات میں الجمعیۃ اور مدینہ جیسے اخبارات بھی اپنے مدیروں کی وجہ سے زیادہ پسند کیے گئے۔ اوران سے وابستگی خودان کے مدیروں کے لیے بھی وجہ شہرت وافتخار بنی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال، یا بعد

میں البلاغ اورمولانا محمد علی جوہر کا کامریڈ اور ہمدرد اسی دائرہ میں آتے ہیں۔ ظفر علی خاں کے اداریوں کو کون نظرانداز کرسکتا ہے۔ ان ارباب صحافت کے وسیلے سے صحافت کی ایک ادبی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی تاریخ بن گئی۔"(12)

اس دور کے دوسرے اخباروں میں مولانا سید حبیب کا سیاست، مہاشے کرشن کا پرتاپ، بجنور کا اخبار مدینہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اگر جرائد کی بات کی جائے تو مولانا حسرت موہانی کے اردوئے معلّیٰ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس رسالے میں علم وادب سے متعلق مضامین کے علاوہ سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ 1920 میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ رونما ہوا تھا اور اس واقعے پر اردواخبارات نے سختی سے اپنے غم وغصے کا اظہار کیا تھا۔ اردو رسائل اور اخبارات کے اداریوں میں یہ خاص بات رہی ہے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں و دوسرے مذاہب اور مختلف ملکی امور کے حوالے سے اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے۔

جدید دور اور ہندوستان کی تقسیم اورآزادی کے دوران بڑی تعداد میں اخبارات ورسائل جاری ہوئے۔ آزادی سے قبل شائع ہونے والے رسائل میں دلگداز، بیسویں صدی، شاعر، سب رس، آجکل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یوں تو یہ علمی وادبی رسائل تھے لیکن ان کے اداریوں میں بھی سیاسی وسماجی اثر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی سے قبل اردو اخبارات کے اداریوں میں ایک خاص تبدیلی یہ آئی کہ اخبارات نے جذبات اور غم وغصہ کے اظہار سے بڑھ کر حقائق ودلائل کا سہارا لینا شروع کردیا۔ اداریوں میں منطق اوردلیل کے حوالے سے اعداد وشمار، جائزوں، رپورٹوں کی مدد سے اپنی بات عوام اورسرکار تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح کے اداریوں کے لیے ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، چراغ حسن حسرت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کی آزادی سے قبل نوائے وقت، ڈان اورمنشور کی شروعات ہوئی۔ ان تمام اخبارات کے خاص موضوعات پاکستان کا قیام اور ہندوستان کی تقسیم تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد صحافت دوحصوں میں تقسیم ہوگئی۔ پاکستان میں لاہور صحافت کا سب سے بڑا مرکز بنا اور ہندوستان میں دلی سے

بڑی تعداد میں اخبار شائع ہوئے۔ اس دور میں لاہور سے دہلی کے مقابلے زیادہ اردو اخبارات نکلنے شروع ہوئے تھے کیونکہ ہندوستان میں اردواخبارات پر پابندی لگادی گئی تھی۔ اس وقت کے اردواخبارات کے اداریوں کے موضوعات میں برصغیر کا بٹوارہ، مسلمانوں کا قتل وخون اور انگریزوں کے خلاف غم وغصے کا اظہار شامل تھا۔ اس کے بعد کے دور میں صحافت ایک مشن نہ رہ کر ایک پیشہ بن گئی اور یہی حال ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کی اردو صحافت کا بھی ہے۔ اردو اخبارات نے صحافت کے مقابلے پر پیسے کو ترجیح دینا شروع کردیا۔ وہ صحافت جوقوم کی اصلاح، مسلمانوں کی خدمت اور ان کے حقوق کے حصول کی لڑائی لڑ رہی تھی محض خبر پہنچانے اور مدیروں کی جیب بھرنے کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔ آزادی کے بعد کی اردو صحافت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرحت احساس لکھتے ہیں:

> ''سیاسی آزادی کے حصول کے بعد ہمارے یہاں جہاں بہت کچھ بلکہ سب کچھ بدلنے لگا تو صحافت میں تبدیلی آئی آزادی حاصل ہوتے ہی جو چیز سب سے پہلے رخصت ہوئی وہ تھی عینیت پسندی اور بے لوث خدمت۔ بڑا سرمایہ جو کب سے صحافت کے در پر دستک دے رہا تھا۔ بالآخر کامیاب ہوا۔ صحافی جو ایک عرصے سے اپنے ذہن وقلم کا ایک خودمختار کارکن تھا رفتہ رفتہ اپنی تجارتی فروخت یعنی پیشہ ور ہونے پر راضی ہوگیا۔ اخبار نے اب ایک تجارتی تنظیم کی شکل اختیار کرلی جس کا بنیادی محرک اورمقصد حصول زر تھا۔ مالک اگر مدیرنہیں ہے تو جواخبار کا مدیر اوردیگرتمام ادارتی کارکن باتنخواہ ملازم ہونے لگے یعنی صحافت کا ذہن صحافت کے تاجرانہ مقاصد سے الگ اوران کے تابع ہوگیا۔ اگرچہ بڑے اخباروں میں ادارتی آزادی اور خودمختاری کا اصول تسلیم کرلیا گیا۔ اور بعض جلیل الضمیر مدیروں نے اپنے اس حق کا پوری شدت سے اثبات بھی کیا مگر ادارتی خودمختاری اورملکیت کے مفادات میں جب تصادم ہوا تو فیصلہ اکثر وبیشتر ثانی الذکر کے حق میں ہی ہوا۔''(13)

ادبی رسائل کی اداریہ نویسی

اردو کی ادبی صحافت کا آغاز خیر خواہ ہند سے ہوتا ہے۔ جس کی شروعات 1837 میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد قران السعدین، محبّ ہند، فوائد الناظرین، ہمائے بے بہا، خورشید پنجاب وغیرہ شائع ہوئے۔ 1857 کے بعد اودھ اخبار، سائنٹفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق، اخبار انجمن پنجاب، وکیل، نصرت الاخبار، اخبار عالم، وغیرہ دوسرے قابل ذکر اخبار و رسائل ہیں۔ بیسویں صدی نئے ہنگامے لے کر آئی اوراخبارات ورسائل نے ملکی اور غیرملکی تمام حالات کا احاطہ کیا۔ بیسویں صدی کا شروعاتی دور ادبی صحافت کے لیے بہت ہی سازگار رہا اور بڑی تعداد میں جرائد ورسائل شائع ہونے شروع ہوئے۔ بیسویں صدی کے شروعاتی دور میں مخزن 1901، رسالہ زمانہ، 1903، اردوئے معلّٰی، 1903، دکن ریویو1904 عصمت 1908 الہلال 1913 معارف 1916 رسالہ اردو 1921 نگار 1921 ہمایوں 1922 اورینٹل کالج میگزین 1925، رسالہ انتخاب 1925، الجمعیۃ1925، سہیل 1926، ساقی 1930، شاعر1930، ادب لطیف1933، سب رس 1938، آجکل 1942 وغیرہ قابل ذکر اور اہم ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کی اگر بات کی جائے تو اہم اور قابل ذکررسائل میں اردوادب 1950 تحریک 1950، رسالہ تہذیب 1952 نیادور 1955 سوغات 1957، کتاب نما، 1960، اردوئے معلیٰ 1960، فکر ونظر 1963، کتاب لکھنؤ 1964، شب خون 1966، عصری ادب 1970، فن وشخصیت 1975 انشا، 1985، ایوان اردو 1987 ذہن جدید 1990، اردو دنیا1997، استعارہ 2000 اورنئی کتاب 2007 وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

شاعر: ماہنامہ شاعر کے دسمبر 1966 کے شمارے کا اداریہ 'جرعات' بعنوان 'جاگو اور جگاؤ' شائع ہوا ہے جس میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کی پرزور اپیل کی گئی ہے اورسیاسی لیڈران کی بے حسی کا رونا رویا گیا ہے۔ سرکار کی اردو کے تئیں بے توجہی کا ذکر کافی تفصیلی اورجذباتی انداز میں کیا گیا ہے۔ اداریے میں اردو کو ملک کی سب سے بڑی زبان قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ آزادی سے پہلے یہ زبان کافی ترقی پر تھی لیکن آزادی

کے بعد اس کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیا گیا ہے اور اردو کی ترقی کی سمت میں کوئی بھی قدم نہیں اٹھایا جارہا ہے۔ کچھ مہینوں بعد ہونے والے الیکشن کے تعلق سے بھی ایک اپیل جاری کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اب بھی وقت ہے کہ اردو والے جاگ جائیں، الیکشن میں کم وبیش دو مہینے باقی رہ گئے ہیں۔ اگر ہم اردو والوں میں اردو کا ذرا سا بھی درد، غیرت اورحمیت ہےتو اب مقاطعہ کی پالیسی اپنائیں۔ ہندوستان بھر سے الیکشن کے لیے اٹھنے والے امیدواروں میں سے کسی ایک امیدوار کو بھی ووٹ نہ دیں۔ اردو جاننے والوں کے ووٹ کسی طرح آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں۔ ہر شہر میں پوسٹروں کے ذریعہ الیکشن کی آخری گھڑی تک اور تمام اردو اخبارات کے ذریعہ جلی حروف میں یہ اعلان کرنے چاہیے کہ آٹھ کروڑ اردو جاننے والے الیکشن میں کسی کو اپنا ووٹ نہیں دیں گے۔ تاوقتیکہ اردو کو سرکاری درجہ نہ دیا جائے۔

اردو کے ووٹرز بہت بڑی طاقت ہیں۔ کاش انھیں اس کا احساس ہو۔ اورکاش اردو کے بڑے اخبارات پرتاپ، ملاپ، تیج، قومی آواز، الجمعیۃ، انقلاب، دعوت، اردو ٹائمز، بلٹز اردو، سیاست، ساتھی، ہماری زبان، عصرجدید، افکار وغیرہ اس طرف متوجہ ہوں۔ پریس بھی کسی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بہت بڑی طاقت ہوتا ہے۔ 12دسمبر 1966 اعجاز صدیقی۔'' (14)

مذکورہ بالا اداریہ کافی جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس میں اردو کے حوالے سے جس مہم کی بات کی گئی ہے وہ واقعی اردو کے تیئں' شاعر' کی بے لوث محبت کا ثبوت ہے۔ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس زبان کی زیادہ سے زیادہ ترویج واشاعت ہو اور اس میں روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ اردو زبان کے ساتھ ہمیشہ سے سوتیلا برتاؤ ہوتا رہا ہے۔ اس میں روزگار نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اس زبان سے دور

ہوتے گئے ہیں۔ شاعر کے اداریوں کی اپنی منفرد حیثیت ہے۔ اس جریدے کے مقبول کالم 'مکتوبات' میں لوگوں نے اسے علاحدہ کتاب کے طور پر شائع ہونے کی درخواست کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اگر شاعر کے اداریوں کو کتابی شکل دے دی جائے تو یہ اردو تحریک کی مکمل تاریخ اورایک مفید وموثر عمل ثابت ہوں۔ کیا آپ اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھا رہے ہیں کیونکہ یہ آپ کے ہی بس کی بات ہے۔'' (15)

شاعر دسمبر 1967 میں 'پھر وہی رنگ جموُد' کے عنوان سے اداریہ شائع ہوا ہے۔ اس اداریے میں بھی اردو کی کسمپرسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اردو کے خلاف کی جارہی لسانی گروہ بندی اور فرقہ پرستی کی مذمت کی گئی ہے۔ ملک کی مختلف ریاستوں کا حوالہ دیتے ہوئے اردو کو صحیح مقام نہ ملنے پر افسوس ظاہر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ملک کے موجودہ غیر یقینی حالات میں اردو والوں کو پھر تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ ممبئی میں ہونے والے کل ہند اردو کنونشن سے ہم یہ کام لے سکتے ہیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اردو کے تمام رہنما اس میں شریک ہوں اور متفقہ طور پر ایک لائحہ عمل مرتب کریں۔ اردو کی بقا اور ترقی کے سلسلہ میں ایک پانچ سالہ منصوبہ بنایا جائے اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم چھوٹے سے چھوٹا فیصلہ کریں اور زیادہ سے زیادہ کام۔'' (16)

ماہنامہ شاعر کے زیادہ تر اداریوں میں اردو کی حالت زار پر آنسو بہایا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اردو کی ترقی اور اس زبان کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کرنے کی بات بھی کہی گئی ہے۔ اردو والوں کو اردو زبان و ادب کی جانب راغب کرنے اور ان میں اپنی مادری زبان کے تعلق سے کچھ کر گزرنے کا جذبہ جگانے میں شاعر کے اداریوں کا جواب نہیں ہے۔ اس رسالے کے کچھ اہم اداریوں کے عنوانات اس طرح ہیں:

ماہ	اداریہ	صفحہ نمبر
ماہنامہ شاعر، جنوری 1968	اردو زبان اور ملک کی تاریخی بدقسمتی	ص9
جون 1968	اردو کا کردار (1)	ص6
جولائی 1968	اردو کا کردار (2)	ص6
دسمبر 1968	گھومتا پھرتا ادب	ص6
اگست 1976	ریاستی اردو اکادمیوں کے سربراہ ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں	ص6
اکتوبر 1976	اردو ادبی ماہناموں کی بدقسمتی	ص6
نومبر 1976	اردو کے موقف پر نظر ثانی کی ضرورت	ص6
اپریل 1977	آشاؤں سے پہلے اور آشاؤں کے بعد	ص6
نومبر دسمبر 1977	اردو کتابوں کی بڑھتی قیمتوں کا خطرناک رجحان	ص6
اگست 1980	میں۔ہم اور اردو زبان	ص6
فروی مارچ 1983	طریقۂ کار کی تبدیلی ناگزیر ہے	ص6
مئی 1983	ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم اور اردو	ص6
ستمبر 1983	کرناٹک اردو اکادمی، ادبی رسائل: اردو اکادمیاں	ص6
مارچ 1978	اردو تحریک کو انقلابی تحریک میں بدل دیا جائے	ص6
مئی 1978	انتظار صبح میں بیٹھے ہو کیا	ص6
جولائی 1978	اور کتنی دور تلک جائے گی یہ بات	ص6
اگست 1978	اردو اکادمیاں اپنا جائزہ لیں	ص6
ستمبر 1978	اردو دوسری سرکاری زبان یا پورے ہندوستان کی زبان	ص6
دسمبر 1978	اردو زبان کا معاشی پہلو	ص6
جنوری تا مارچ 1985	شاعر اور اردو زبان و ادب (آفسیٹ کا پہلا شمارہ)	ص6
اپریل 1985	زبان۔ رسم الخط۔ ادب اور فن کار	ص6
اگست، ستمبر 1985	خیال۔ لفظ لمحے	ص6

مارچ،1994	نئے قلمکاروں کی حمایت میں	ص 4
اپریل، 1994	جھوٹ بنام سچ	ص 4
جون 1994	کائنات۔آدمی نظریے اور زندگی	ص 4
اگست 1994	اردو کو اردو والوں کی ضرورت ہے	ص 4
ستمبر 1994	خوب سیرت فن پارہ ایک روشن دن کی مثال	ص 4
مارچ 1997	سیٹلائٹ اور اردو چینل	ص 3
جنوری 1995	ایک تحریر اور نئی نسل کے نام	ص 4
مئی 1999	غزل، غزل کار اور ناقد	ص 4
اکتوبر 1999	اساتذہ اور طلباء بھی تو اردو ادب کے قاری ہوتے ہیں	ص 4
اپریل 2001	نئی تعلیمی پالیسی۔انگریزی اسکول اردو۔	ص4
فروری 2002	نئے قلمکاروں کی تلاش کا مسئلہ	ص 4
اکتوبر 2002	اردو چلن کی زبان کیسے بنے	ص 4
نومبر 2004	مکاتیب، مشاہیر کی تدوین کا مسئلہ	ص 4
فروری2008	ہندی فلموں میں اردو شاعری	ص 4
اگست 2008	سرکاری دوردرشن کا اردو چینل	ص 4
نومبر 2008	اردو کے ادبی عجائب گھر	ص 6
دسمبر 2008	کشمیر متحد کب ہوگا	ص 4

مئی 1983 میں ریڈیو ٹیلی ویژن فلم اور اردو کے عنوان سے اداریہ شائع ہوا ہے۔ جس میں اردو اکادمیوں کی بے حسی اور اردو کے لیے کام نہ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔اردوزبان کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے میڈیا کی زبان بنانے کی بات کی گئی ہے۔ فلم اور ریڈیو ٹیلی ویژن میں اردو پروگراموں کی خراب صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو پر وڈیوسروں اور فلم سے جڑے اردو داں حضرات پر بھی الزام لگایا گیا ہے کہ وہ بھی کرسی پر فائز ہوکر اردو کے لیے کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔

پورے ملک میں ریڈیو اسٹیشنوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ وہاں اردو کے ساتھ جانب داری برتی جارہی ہے اور ان کے پروگراموں میں شعبہ ہندی والے لوگ کام کرتے ہیں اور اردو کے لیے الگ سے کسی اردوداں کو نہیں رکھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اردو کے پروگرام غیر معیاری ہوتے ہیں، جس سے اردو حلقے میں غلط اردو کا رواج عام ہوتا ہے اور اردو کی حالت زار اور بھی خراب ہوتی جارہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''عوامی سطح پر زبان کے رشتے کی بات کریں تو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم یہ بہت بڑے اور جاندار میڈیا ہیں۔عوام سے رابطے کا۔زبان اور تہذیب کی جڑیں مضبوط کرنے کا، مگر اس سے بھی قبل ایک بہت ہی اہم مگر عام سی اطلاع دینا بھی ضروری ہے کہ ہندوستان کے تمام بڑے صوبوں میں وہاں کی علاقائی زبان بولنے والوں کے بعد اگر کسی زبان کے بولنے کا نمبر آتا ہے تو وہ ہے اردو۔ اور اس کا بہت بڑ اثبوت وہ مردم شماری رپورٹ ہے جو مرکزی حکومت کی طرف سے کتابی شکل میں شائع ہوتی ہے،جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ جس طرف نکل جایئے اردو کے ساتھ ناانصافیوں کی داستانیں بکھری ہوئی ملیں گی۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن پر جتنا براحال اردو کے پروگراموں کا ہے وہ شاید ہی کسی اور زبان کا ہو۔ستم تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کی زیرِ سرپرستی ہورہا ہے جنھیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں اردو پروڈیوسرس کی اعزازی پوسٹ دی گئی ہے یا جو ایڈوائزری بورڈ میں شامل ہیں۔'' (17)

ماہنامہ شاعر کے جون 1987 کے شمارے میں مدیر اعلیٰ افتخار امام صدیقی نے 'جرعات' میں اردو ادب کی تاریخ کے عنوان سے جو اداریہ لکھا ہے وہ آج بالکل صحیح ثابت ہورہا ہے۔ آج کی صورتِ حال پر تقریباً 25 سال قبل اس مدلل انداز میں کیا گیا تبصرہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ اس اداریے میں اردو زبان کی تاریخ کے حوالے سے بات کی گئی ہے کہ ہمارے پاس اردو زبان کی مکمل تاریخ نہیں ہے اور نہ ہی اردو زبان وادب کا کوئی مستند انسائیکلو پیڈیا

ہے۔ اداریے میں بڑے اچھے انداز میں اس وقت کی صورتِ حال کو پیش کیا گیا ہے۔ اردو زبان اودب کی ایک مستند ومکمل تاریخ کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آنے والا دور مشینوں کا ہوگا۔ تب آج کی لکھی کتابوں کی اہمیت گھٹ جائے گی۔ قاری کتابوں سے دور ہوجائے گا۔ لیکن پھر بھی اردو زبان کی بازیافت کے لیے ایک مستند تاریخ کی ضرورت پڑے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردوزبان وادب کے قدیم سرمائے کوجدید مشینوں اورٹکنالوجی کے ذریعے ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیاجائے تاکہ آنے والی نسلیں ہمارے ان کارناموں پرفخر کرسکیں:

> ''تجربوں کی ہوائیں مشرق سے مغرب کی طرف بہتی ہیں۔ مغرب سے مشرق کی طرف آنے والی ہواؤں کو ہم سب محسوس کررہے ہیں۔ آدمی کا مقدر کیا ہے یہ اسے معلوم ہے لیکن جوتھوڑے بہت محسوسات ابھی باقی ہیں ہمیں ان سے استفادہ کرلینا چاہیے۔ وقت کمپیوٹر میں قید ہوتا جارہاہے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ علم کی پچاس قسم ہوتی جارہی ہے۔ ذہنی ساخت وپرداخت کا وہ ماحول نہیں رہا، وہ لوگ نہیں رہے، ہماری زبان کو خوش فہمیوں کی دیمک بری طرح چاٹ رہی ہے۔ آنے والے کل کا انتظار کیے بغیر کہ وہ کل آج سے زیادہ مختلف اور بے قابو ہوگا ہمیں اپنی زبان وادب کو جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ محفوظ کرلینا چاہیے۔ کمپیوٹر ہماری آج کی سب سے اہم اورعظیم ضرورت ہے اوراس عصر کے لیے ناگزیر بھی۔ کمپیوٹر ہر شعبہ زندگی میں داخل ہے۔ جدید ترین پرنٹنگ اسی کے ذریعہ ہورہی ہے مگر اس سے بھی آگے مستقبل میں کمپیوٹر چھپے ہوئے لفظوں پر حاوی ہوجائے گا ویسے بھی حروف مٹ رہے ہیں۔ لفظ ختم ہوتے جارہے ہیں۔ آنے والی نسلوں کوہمیں کچھ تو دینا ہی ہے۔
>
> ڈوب جائے گی شور میں دنیا۔ لفظ ہوں گے نہ خاموشی ہوگی۔'' (18)

اس اداریے کا دوسرا حصہ جولائی 1987 میں بھی شائع ہواہے۔ اس میں تاریخ ادب

اردو کی تدوین کرنے کی درخواست کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اس بڑے پروجیکٹ کے لیے ہندوپاک کے کئی ادارے مل کر کام کریں اور محققین مل جل کر اس اہم اور عظیم کام کو انجام دے سکتے ہیں۔

شاعر کے اپریل 1994 میں جھوٹ بنام سچ کے عنوان سے افتخار امام صدیقی لکھتے ہیں کہ موجودہ ادبی صورتِ حال میں جو شخص بھی ادب سے تعلق رکھتا ہے وہ اپنی تعریف خود کرنا چاہتا ہے۔ ایسا کر کے وہ طمانیت محسوس کرتا ہے۔ قاری کا مزاج بدل رہا ہے اور مطالعے سے لوگ اب دور ہوتے جارہے ہیں۔ اردو کا مستقبل مشکوک ہوگیا ہے اورمعاشرے کی تعمیر میں جھوٹے کا بول بالا ہے۔ادب میں غیرضروری مفروضے، گروہ بندیاں، ذہنی خلفشار سے اردوروےیے کوکافی نقصان پہنچ رہاہے۔ادب میں جھوٹ اور غلط مفروضے کی کوئی جگہ نہیں ہے:

> ''شاعرکی65سالہ روایت کی تعمیر سچ سے کی گئی تھی۔ آج یہ 65 سالہ سچ خاموشی کی آواز بن گیاہے۔اس آوازکوجستجو ہے اپنے ہی جیسے سچ بولنے والوں کی تاکہ ایک بارپھرایسی اردوتہذیب کی بازیافت ہو سکے۔جس نے عظیم شعرا، نثرنگار۔افسانہ نگار اور داغ اسکول جیسا ادارہ دیاتھا (ایک غیرمعمولی،ادبی، روایت جومسلسل نظرانداز ہورہی ہے) اب میر، نظیر، غالب، اقبال، سیماب جیسے عظیم فنکارجنم نہیں لیں گے۔ جوش، فراق، راشد اور فیض جیسے شعرا بھی نہیں ابھریں گے۔ پریم چند، منٹو،کرشن اور بیدی جیسے اہم افسانہ نگار بھی پیدانہیں ہوں گے۔لیکن ایسے ہی بڑے ناموں کی فہرست کچھ آگے توبڑھ سکے گی۔نظم ونثر میں کچھ اہم نام توسامنے آئیں گے اس لیے نئی نسل کوضرورت ہے ایک نئے اردو کلچر کی۔اس نئے کلچر کے اپنے آداب کی وہ آداب جس کی اپنی روح، اپنامزاج ہوجہاں فنکاروں کی اہمیت ہواوران پر نقاد ومحقق مسلط نہ ہوں۔ ان کی ضرورت ثانوی ہوبنیادی نہیں۔'' (19)

مئی 1999 میں جناب افتخار امام صدیقی نے خالص ادبی موضوع پر قلم اٹھایا ہے اورغزل: غزل کاراورناقد کے عنوان سے اداریہ قلم بند کیا ہے۔ اداریہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ غزل کے اچھے اشعار اب نہیں کہے جارہے ہیں اور اردو غزل میں تخلیقیت اور معیار پر کم دھیان دیا جارہاہے۔ معیاری غزل اوراچھی غزل کا نیا تصور ہونا بہت ضروری ہے۔آج کی غزل بے روح اور بے رس ہوگئی ہے۔ کتب ورسائل میں سطحی شاعری بھری جارہی ہے اور اچھے شاعرانگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ غزل گوشعرا کی تربیت کے لیے نہ تواستاد شعرا موجود ہیں اور نہ ہی اپنے کلام پر اصلاح کے لیے غزل کا شاعرکسی بڑے شاعر سے رابطہ کرنے کی سعی کرتا ہے۔ غزل کو21ویں صدی میں سنوارنے اور رہبر بنانے کے لیے اس سمت میں کوششیں کرنی ہوں گی اور اساتذہ کرام،تخلیق کار، ناقدین کوازسرنو اس جانب توجہ دینی ہوگی کہ نئے منظرنامے کے تناظرمیں کیاعملی اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

’’کیاغزل کا ایک اچھا اورمعیاری شعرکہنا آسان ہے۔غزلیہ شاعری کی بھر مار سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شعر کہنا آسان کام ہے اور ہر موزوں طبع شخص غزل کہہ سکتا ہے بلکہ یہی ہورہاہے کہ جسے ذراسا بھی محسوس ہوا کہ وہ شعرموزوں کرسکتا ہے۔غزل کہنے لگتاہے اورچندہی ماہ میں وہ اس خواہش کا بھی اسیر ہوجاتا ہے کہ اب اس کی شاعری پکی روشنائی میں بھی نظرآنے لگے۔ایک آدھ سال میں وہ بڑے ادبی رسائل کے مدیران کو نہایت ہی جرأت مندی کے ساتھ خط لکھنے لگتا ہے کہ اس کا کلام نہ صرف یہ کہ شائع کیاجائے بلکہ نمایاں طور پر شائع کیاجائے۔ اور پھر چندسال بعد تووہ صاحب طرز،منفرد،اہم،معتبر اور اردو شاعری میں اضافہ کرنے والاشاعر بن جاتا ہے ...

غزل تو اپنے تخلیق کارسے ہر بار اس کی روح کا مطالبہ کرتی ہے۔ غزل کے ہر اچھے شعر میں تخلیق کارکو بار بارخلق ہونا پڑتا ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور خودبھی اسی کسوٹی پرپر کھے گئے کہ جب تک

اساتذہ کے پانچ ہزار اچھے اشعار ازبر نہ ہوں شعر گوئی کی اجازت نہیں۔
ہم سے تو پانچ سو اچھے معیاری اور غیر معمولی اشعار سنانے کی خواہش کی گئی
تھی۔ بیت بازی کا رواج سیکھنے اور سکھانے کا ہی ایک خوب سیرت طریقہ
تھا۔ اب یہ رواج بھی کمزور پڑ گیا ہے۔ اچھی سچی اور بڑی غزلیہ شاعری کی
تخلیق کے لیے اساتذہ کرام، تخلیق کار، ناقدینِ شعر اور مدیران رسائل کو
ازسرِ نو غور کرنا ہو گا کہ 21 ویں صدی میں انھیں صنف غزل کے لیے کیا
کرنا ہے۔ افتخار امام صدیقی۔'' (20)

ایک قابل ذکر اداریہ ماہ اکتوبر 1999 میں شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''اساتذہ اور طلبا بھی تو اردو ادب کے قاری ہو سکتے ہیں''۔ اس اداریے میں افتخار امام صدیقی نے ملک کے طول وعرض میں اردو کے اساتذہ اور طلبا کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ملک کے تقریباً سبھی حصوں میں اساتذہ اور طلبا کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ یہ سبھی اردو زبان وادب سے جڑے ہیں لیکن اردو رسائل سے دور ہیں جبکہ اردو رسائل واخبارات کے قاری ان سے زیادہ بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سبھی اردو اساتذہ اور طلبا اردو کتابوں، ادبی رسائل اور اخبارات کی جانب راغب ہوں اور اردو کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں۔ ان اساتذہ اور طلبا میں اردو رسائل سے رابطہ اور اردو کے تئیں ذوق وشوق بالکل واجبی سا رہ گیا ہے جسے ابھارنے کی ضرورت ہے۔ افتخار امام صدیقی نے بہت چبھتا ہوا سوال اٹھایا ہے کہ جب ملک میں اتنی بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبا موجود ہیں تو وہ اردو ادب سے کیوں دور ہیں۔ ادب کے قاری کہاں ہیں۔ ادب کے قاری کی تلاش کیوں کی جا رہی ہے۔ وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اردو کے معاصر ادبی رسائل سے کیوں نہیں جڑتے۔ انھیں چاہیے کہ اپنی تنخواہ کے بجٹ کا ایک چھوٹا حصہ اردو کتابوں اور رسائل پر صرف کریں۔ وہ کوشش کریں کہ لائبریری میں اردو کے ادبی رسائل لگاتار آتے رہیں۔ اساتذہ کو بھی چاہیے کہ وہ طلبا سے بہتر رشتے استوار کریں۔ اور ان میں ادب کے تئیں دلچسپی پیدا کریں۔ ایسی کوششیں کی جائیں کہ طلبا ادبی رسائل پڑھنے پر مجبور ہوں۔ ممکن ہو تو اردو کے

پیریڈ میں موجودہ ادبی رسائل کی غرض وغایت اورصورتِ حال پرتبصرے، گفت وشنید اور محفلِ گفتگو منعقد کرائی جائے۔ اساتذہ کے لیے مختلف ورکشاپ منعقد کرائے جاتے ہیں اور سیکڑوں کوششیں کی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود اساتذہ خود ادبی رسائل سے دور ہیں اور بہت کم ایسا ہورہا ہے کہ کسی کالج یا یونیورسٹی کے اساتذہ خرید کر رسالہ پڑھتے ہوں:

''اردو اساتذہ اور طلبا کا ایک سروے از بس ضروری ہوگیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ یہ ہزاروں اساتذہ وطلبا میں سے ادب کے قاری کیوں نہیں ابھر رہے ہیں۔ اردو اساتذہ کے بارے میں یہ تحقیق ہونی چاہیے کہ وہ جس نصاب کی تدریس کر رہے ہیں اس کے بارے میں وہ کتنا جانتے ہیں۔ نصاب کے باہر اردو زبان وادب سے ان کی واقفیت کتنی ہے۔ حالانکہ اردو اساتذہ کے لیے ورکشاپ منعقد کیے جاتے ہیں لیکن یہ ورکشاپ اپنی وقتی کامیابی سے آگے کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کر پاتے ہائر سکنڈری اسکولوں کے طلبا تو بالکل کورے نکل رہے ہیں وہ اپنے مشاہیر قلم کاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ان کے اساتذہ بھی ضرورت بھر تعلیم حاصل کرکے آتے ہیں۔ بی اے اور ایم اے کی سطح کے طلبا بھی اپنے نصابی دائرے سے باہر نکل نہیں پاتے اورنجی اساتذہ کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ پی ایچ ڈی کے طلبا اوران کے اساتذہ کا حال تو اور بھی برا ہے۔ یہاں اس پر گفتگو کی فی الحال کوئی گنجائش نہیں۔'' (21)

اگست 2000 میں اردو چینل کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں اردو چینل کے تعلق سے بات کی گئی کہ ETV نے اکتوبر 2000 سے اردو چینل شروع کرنے کا اعلان کیا ہے اور یہ خوش آئند اقدام ہے لیکن اس کے پروگرام کیسے ہوں گے ان میں کیا کیا پیش کیا جائے گا۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

''اردو کے یہ چینل اردو کے لیے خوش آئند ہیں۔ایک سے زائد اردو چینل کی موجودگی عالمی سطح پر اور بطور خاص ہندوستان میں اردو کے لیے ایک

نئی فضا قائم کرے گی۔ عالمی الیکٹرانک میڈیا سے براہ راست اس زبان کا رابطہ معاشی وسائل پیدا کرے گا۔ اور بہت کچھ ممکن ہے۔ چونکہ ہم خود اردو چینل کے لیے کام کر رہے ہیں لہٰذا ہمارے کچھ سوال ہیں کیونکہ جو بھی اردو سٹیلایٹ چینل شروع ہورہا ہے یا ہونے والا ہے اس کا آئیڈیل پی ٹی وی 2 ہے مگر ہمارا معیار یا ہمارا آئیڈیل یہ نہیں ہے۔ بہرحال بہت سارے سوال ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں...

یہ پروگرام کیا ہوں گے؟ ان پروگراموں کا مزاج کیا ہو گا؟ اردو پروگراموں سے مراد کیا ہے؟ موجودہ بہت سارے سٹیلائٹ تفریحی چینلس کے پروگراموں سے مختلف پروگرام کیا ہو سکتے ہیں...

بول چال کی زبان میں ہندی اردو کے مشترک الفاظ یا مشترک زبان کے کلچر کو پروگراموں کی زبان بنایا جائے گا یا خالص اردو کے استعمال سے یہ بتایا جائے گا کہ یہ اردو چینل ہے دراصل عوامی سطح پر اردو زبان کا تصوراب فارسی آمیز عربی آمیز زبان سے عبارت ہے۔ سارے ہی تفریحی چینلس فلمی گانوں اور فلموں اور ان سے متعلق طرح طرح کے ضروری، غیر ضروری مضحکہ خیز پروگراموں سے بھرے پڑے ہیں یا انہی پر منحصر ہیں۔ فلموں کی زبان کیا، بظاہر تو سب کچھ ہندی کے کھاتے میں چلا جاتا ہے جب کہ گانوں اور مکالموں میں ہندی آمیز یا اردو آمیز زبان استعمال کی جاتی ہے کسی ایسی مجموعی انفرادیت کے بغیر جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ اردو چینل ہے کوئی بھی اردو چینل، دیگر سٹیلائٹ چینلس کی طرح ہو جائے گا۔'' (22)

ماہنامہ شاعر نے اکتوبر 2000 میں دوبارہ ٹی وی چینل کے حوالے سے اداریہ تحریر کیا ہے۔ اس دفعہ افتخار صاحب نے دور درشن کا اردو چینل کیوں نہیں کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا ہے۔ اداریے میں اردو کے لیے سرکاری دوہری پالیسی پر انگلی اٹھائی گئی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب ملک کی دوسری زبانوں کے لیے دوردرشن نے ٹی وی چینل شروع کر رکھے

ہیں تو اردو کے ساتھ یہ سوتیلا برتاؤ کیوں کیا جارہا ہے۔ جب پنجابی زبان کا ٹی وی چینل چل رہا ہے تو اردو کا بھی حق ہے کہ اس زبان میں چینل کی شروعات ہو۔ کیوں کہ اردو واحد زبان ہے جس کے بولنے پڑھنے اور لکھنے والے ملک کے سبھی حصوں میں موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''اب سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ سرکاری سطح پر اردو کہاں ہے؟ ہندوستان کی اور زبانوں کی طرح اردو کا سرکاری چینل کیوں نہیں ہے؟ کیا یہ ہندوستان کی زبان نہیں؟ کیا یہ زبان اپنے کسی سرکاری چینل کا کوئی جواز نہیں رکھتی؟ اردو کسی بھی علاقائی زبان سے بڑی زبان ہے تو پھر اس کا کوئی سرکاری چینل کیوں نہیں ہے؟ اگر ہندی سرکاری زبان نہیں ہوتی تو کیا یہ پورے ہندوستان کی زبان ہوتی؟ اب اگر یہ سرکاری زبان ہے تو پھر اردو کے بغیر کیوں کر؟ تو کیا اب ایک مشترکہ تہذیب کا خاتمہ نہیں ہورہا ہے عوامی زبان کا قتل عام ہورہا ہے اور یہ سب کچھ ہندی کے نام پر ہورہا ہے لہٰذا ہرا عتبار سے ایک سرکاری اردو چینل اب ناگزیر ہے...
>
> ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سرکاری سطح پر ہندی کے ساتھ اردو کو بھی ہرمحاذ پر رکھا جائے اور اردو کا اپنا ایک سرکاری چینل ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے دونوں ہی کام نہیں ہوئے۔'' (23)

افتخار امام صدیقی کے لکھے اس اداریے میں جس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا وہ حکومت ہند نے بعد کے برسوں میں پوری کردی اور اردو کا چینل شروع ہوگیا۔ شاعر کے اداریوں میں بڑے ہی اہم اور توجہ طلب نکات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جہاں عام رسائل چھوٹی موٹی خبروں کو موضوع بناتے ہوئے اداریہ لکھتے رہے ہیں وہیں شاعر کے اداریوں میں ہمیں اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج و اشاعت کا جذبہ نظر آتا ہے۔

ماہنامہ شاعر اردو کا سب سے عمر دراز رسالہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہم عصر منظر نامے کو پوری طرح قبول کرتا رہا ہے۔ اس رسالے کو ہمیشہ سے اردو کے بڑے اساتذہ اور

قابل قدر لوگوں کا تعاون حاصل رہاہے۔کسی بھی تحریک یاگروپ سے آزاد رہ کر اس رسالے نے اردو کی لڑائی لڑنے کا بیڑا اٹھایا ہے اورآج تک رسالہ اس کوشش کو جاری وساری رکھے ہوئے ہے۔ اداریوں میں جن موضوعات پرقلم اٹھایا گیا ہے وہ اداریے کی فنی سطح پر بھی کھرے اترتے ہیں۔ اداریے سے رسالے کی ایک شناخت کا پتہ چلتاہے۔ افتخار امام صدیقی نے شاعر کے اداریوں کے ذریعے اردو زبان وادب کی صورتحال، فروغ واشاعت کے علاوہ خالص ادبی موضوعات کے منظرنامے کی بھی تصویرکشی کی ہے۔ ماہنامہ شاعر قابل تعریف ہے کہ ادبی سفر میں یہ رسالہ 1930 سے اب تک نہایت کامیابی کے ساتھ گامزن ہے۔ اردو رسائل کی تاریخ میں اتنا لمبا سفر بہت کم رسائل کونصیب ہوا ہے۔ افتخار امام صدیقی،حامد اقبال صدیقی اوراداریے سے جڑے دوسرے افرادآج بھی رسالے کوبہتر اورممتاز بنانے کے لیے ہرممکن کوشش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

سب رس: رسالہ سب رس کی شروعات جنوری 1938 میں ڈاکٹرمحی الدین قادری زور نے حیدرآباد سے کی تھی۔ یہ رسالہ خالصتاً دکنی ادب وتہذیب کے فروغ اور اشاعت کے مقصد سے معرض وجود میں آیاتھا۔ اس رسالے کے پہلے شمارے میں پیش لفظ کے عنوان سے اداریہ شائع ہوا ہے۔جس میں سب رس کے مقاصد اوراس کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے۔اس کے علاوہ اداریہ میں دوسرے رسائل کے حوالے سے یہ بات بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو رسائل کا معیار ابھی بہترنہیں ہے اور سب رس اسے بہتر بنانے کی کوشش کرے گا۔ ملاحظہ ہو:

> ’’ممالک محروسہ سرکار عالی سے جواردو رسالے شائع ہوتے ہیں ان میں بیشتر مدرسوں اور کالجوں کے رسائل ہیں جن کا دائرہ عمل استادوں اور طالب علموں یا اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب تک محدود ہے۔مجلّہ تحقیقات علمیہ، مجلّہ عثمانیہ، المؤسی، مجلّہ ورنگل، نورس جامعہ عثمانیہ کی مختلف درسگاہوں کے ترجمان ہیں۔ دورسالے مجلّہ طیلسانین اور مجلّہ نظامیہ، دودرسگاہوں یعنی جامعہ عثمانیہ اور مدرسہ نظامیہ کے فارغ التحصیل کی طرف سے شائع ہوتے

ہیں اور' اردو' انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں بلند اور محققانہ مقالے اور ادبی مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد کا ایک رسالہ شہاب ایسا ہے جو ماہوار ہے اور عام ادبی رسالہ سمجھا جاسکتا ہے اور پابندی کے ساتھ وقت پر شائع ہوتا ہے۔ آج حیدرآباد کو علم وفضل کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور جامعہ عثمانیہ کی وجہ سے یہاں اردو کے اہل علم میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے لیکن یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اخبار ورسائل کے مطالعہ کا ذوق ابھی عام نہیں ہوا۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہر اردو داں اپنی فرصت کے اوقات میں کچھ دیر ضرور مطالعہ کیا کرے۔ جب تک مطالعہ کا ذوق وسیع نہ ہوگا نہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہوسکیں گے نہ ہمارے خیالات میں یکسانیت پیدا ہوسکے گی نہ ہمارا ادب وسعت حاصل کرسکے گا اور نہ ہماری زبان میں ترقی ہوگی۔'' (24)

ماہنامہ سب رس نے اپنی شروعات کے ساتھ ہی دکنی ادب کے فروغ، اردو ادب میں تحقیق اور زبان کی ترقی کے حوالے سے متعدد اداریے شائع کیے ہیں۔ مختلف ادوار میں عصری حالات و واقعات کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ خصوصی نمبروں میں اداریوں پر کافی توجہ دی جاتی رہی ہے۔ سب رس نے دکنی ادب اور دکنی شعرا پر کافی ضخیم اور بہترین خصوصی نمبر شائع کیے ہیں جنوری 1957 میں سب رس نے ادارہ نمبر شائع کیا تھا جس میں ادارہ ادبیات اردو کی تمام خدمات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس شمارے کے اداریے میں ادارہ ادبیات کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے ادارے کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اردو رسائل کے ساتھ ایک بڑا المیہ رہا ہے کہ ان کی اشاعت میں تاخیر ہوتی رہتی ہے اور اردو کے تقریباً سارے رسائل اس طرح کے مسائل سے نبردآزما ہوتے رہے ہیں۔ سب رس کے ساتھ بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور اداریوں میں اس تعلق سے باتیں کی جاتی رہی ہیں۔ سب رس کے جنوری 1947 کے شمارے میں سب رس کے نوسال پورے ہونے پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کا بھی تذکرہ

ہے۔ سب رس کے خریداروں کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے اور یہ آخر میں سب رس کے مقصد کو دہرایا گیا ہے ملاحظہ ہو:

''آخر میں اس حقیقت کا اظہار کرنا ضروری ہے کہ سب رس کے اجرا کا مقصد اردو زبان وادب کی خدمت ہے۔ یہ رسالہ کسی فرد کا ذریعہ معاش نہیں اور نہ کبھی اس سے نفع کمانے کا خیال پیدا ہوا۔ سب رس ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ہے اور اس کی جملہ آمدنی وخرچ فی سبیل اللہ ادارے ہی کے ذمہ ہے۔ ادارہ کو قوی توقع ہے کہ بہی خواہان علم وادب سب رس کی قلمی اور رقمی اعانت کرنے میں دریغ نہ فرمائیں گے۔'' (25)

سب رس میں کبھی کبھی کسی خاص تقریب کی روداد کو بھی اداریہ کی جگہ پر شائع کیا گیا ہے۔ اپریل 1997 میں سب رس کے اداریوں میں سلسلہ وار مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ سب رس کے اداریے مختصر ہوتے ہیں اور اس میں زیادہ تر ادارہ ادبیات اردو کی مختلف سرگرمیوں اور تقاریب سے متعلق ہی مواد شائع کیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی اہم شاعر یا ادیب کے انتقال پر اس کو خراج عقیدت بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اداریوں میں رسالے کے وقت پر شائع نہ ہونے کے لیے معذرت کا اظہار بھی سب رس کے اداریوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے سب رس کی اشاعت میں تاخیر ہورہی ہے اور مشترکہ شمارے شائع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اس کی تلافی کے لیے رسالے کی ضخامت بڑھادی گئی ہے ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ ماہ بہ ماہ سب رس شائع ہوا کرے۔'' (26)

اداریہ کے عنوان سے کسی اہم تقریب کا اعلان بھی شائع ہوتا رہاہے۔ جیسے اپریل1998 میں یوم قلی قطب شاہ تقاریب کے حوالے سے اطلاع دی گئی ہے کہ اس کا اجلاس گنبدان قطب شاہ میں منعقد ہوگا۔ اداریے 'اپنی بات' میں قومی کونسل اوردوسرے اردو اداروں کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ان اداروں نے یوم قلی قطب شاہ تقاریب کے لیے

رقمی اعانت کی تھی۔سب رس کے اداریوں میں کسی اہم تنقید نگار،ناول نگاریاادیب کے انتقال پر اظہار خیال کیاجاتارہاہے۔رسالے میں اس ادیب کی زندگی کا ایک مختصرخاکہ بھی پیش کیاجاتا ہے، جس سے قارئین کو اس ادیب کامختصر تعارف حاصل ہوجائے۔سب رس کے ستمبر 2007 کے شمارے میں پروفیسر گیان چندجین،قرۃالعین حیدر اور پروفیسرغیاث متین کے انتقال پر اظہارِتعزیت کیا گیا ہے۔ستمبر 2008 میں معروف شاعر احمد فراز، ممتازاردو داں برطانیہ کے رالف رسل کی موت پرتعزیت کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹرشاہد صدیقی پرشائع کیے گئے گوشے سے متعلق اطلاع دی گئی ہے۔دسمبر 2008 میں ڈاکٹر زینت ساجدہ، ممتاز شاعر،نقاداورڈراما نویس رفعت سروش اوراردو وگجراتی کے معروف شاعرعادل منصوری کے انتقال کی خبردی گئی اورغم کااظہارکیاگیاہے۔آخر میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ادارے کی جانب سے ان کے لیے دعائے خیر کی گئی ہے۔مارچ 2007 کے شمارے کے اداریے میں جنوری،فروری،مارچ کا مشترکہ شمارہ شائع ہونے پر معذرت کی گئی ہے۔سب رس کا یہ شمارہ کافی دیر سے شائع ہواتھا۔اس کے بعد کا شمارہ اپریل،مئی، جون 2009 پرمشتمل بھی مشترکہ شمارہ تھا۔اس میں قمررئیس اورحیدآباد کے ممتاز شاعر جناب مظہرمہدی کی موت پر اظہارِ رنج وغم کیا گیا ہے۔سب رس کے اداریوں میں ادب کے تعلق سے بھی باتیں کہی گئی ہیں لیکن زیادہ تراداریوں میں خبروں سے متعلق ہی گفتگو کی گئی ہے۔سب رس کے اداریے مختصرہوتے ہیں۔لیکن کبھی کبھی طویل بھی لکھے گئے ہیں جودو سے تین صفحوں پر مشتمل ہیں۔سب رس کے اداریے رسالے کے دوسرے تیسرے صفحے پرشائع کیے جاتے تھے۔سب رس کے اداریے کبھی کبھی صرف ایک خبر پرمشتمل مختصراً شائع ہوئے ہیں۔

آجکل : آزادی سے قبل شروع ہونے والا جریدہ آجکل، ایک سرکاری رسالہ ہے اور پبلی کیشنز ڈویژن کے ذریعے شائع کیا جاتا ہے۔آجکل کا مقصد شروع سے ہی ادب کی خدمت کرنا اور ہندستانی زبان کو عام کرناتھا اور یہ رسالہ آج تک انھیں مقاصدپر کاربند ہے۔آجکل نے اپنے مختلف شماروں میں بھی یہ لکھا ہے کہ یہ رسالہ خالص علمی اورادبی ہے۔ہم نے اسے سرکاری پروپیگنڈانہیں بنایا ہے بلکہ یہ رسالہ ادب اور قاری کوایک دوسرے کے قریب

لانے کی ایک کوشش ہے۔ آجکل کے اداریوں میں کافی تنوع ہے اور ان میں مختلف مسائل ومعاملات کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ملک کی تقسیم، جنگ آزادی، بنگلہ دیش کی آزادی، پاکستان سے جنگ، جواہر لعل نہرو، گاندھی جی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں کی پالیسیاں وحکمت عملی، زبان وادب کی صورتحال، حکومت کا اردو کے تئیں رویہ، ملک کے مختلف حصوں میں اردو کی صورتِ حال جیسے موضوعات کوآجکل کے اداریوں میں جگہ ملی ہے۔

کسی بھی جریدے کا اداریہ اس کی اپنی پالیسی پر منحصر کرتا ہے۔ اداریے کے ذریعے ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ جریدہ کن موضوعات ومعاملات کو اہمیت دیتا ہے۔ آجکل میں ادب کے ساتھ ساتھ سیاست اور سماجی معاملات پر مبنی اداریے بھی کافی بڑی تعداد میں شائع کیے گئے ہیں۔ اہم شخصیات کی وفات اور خدمات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اور آجکل کی اپنی پالیسی کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ گاندھی نمبر 1948 کے اداریے میں آجکل کے تعلق سے کچھ اس طرح اظہار خیال کیا گیا تھا:

> ''آجکل کا مقصد ہمیشہ جنتا کو اپنے ملک، اپنے پڑوسی ملکوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانا اور صحت مند ادب پیش کرنا ہے۔ کسی ملک کی آزادی صحیح معنوں میں اس وقت تک آزادی نہیں کہلا سکتی جب تک وہاں کے لوگ زندگی کی ضرورتوں کے ساتھ علم وادب اور کل دنیا کے معاملات سے اچھی طرح واقف ہوکر ایک آزاد نظریہ اور رائے نہ رکھتے ہوں۔ اسی مقصد کو لے کر ہم آگے بڑھے تھے اور جہاں تک ہوسکے گا اس فرض کو پورا کرنے کی برابر کوشش کرتے رہیں گے۔'' (27)

آجکل میں جہاں ادب وزبان پر مبنی موضوعات کو شامل کیا جاتا ہے وہیں خالص سائنسی ودوسرے موضوعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ آجکل اس معاملے میں بھی اہم رسالہ ہے کہ اس رسالے نے کسی تحریک یا رجحان کا اثر قبول کیے بنا سبھی کے لیے اپنے صفحات کھلے رکھے ہیں اور ہر طرح کی تحریروں کو جگہ دی ہے۔ دوسرے ممالک کے تہذیب وتمدن، رسومات، اہم شخصیات، حالات وواقعات کو بھی آجکل میں جگہ ملتی رہی

ہے جس سے اردو داں حلقے کی معلومات میں کافی اضافہ بھی ہوا ہے۔ قومی اتحاد اور ادبی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں بھی آجکل کی خدمات لائق ستائش ہیں۔ آجکل کے اداریے کی اپنی ادبی اور تاریخی اہمیت بھی ہے۔ ادب کے مختلف نشیب وفراز کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے اس رسالے نے جتنی کوششیں کی ہیں وہ لائق تحسین ہیں۔ ڈاکٹر جمیل اختر آجکل کے اداریے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یوں تو اداریہ ہر رسالہ کا ہی اہم ہوتا ہے۔ لیکن آجکل کے اداریے کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔ آجکل جب سے جاری ہوا ہے اس وقت سے اب تک اگر اس کے اداریے کا تجزیہ کیا جائے تو کئی حیرت انگیز انکشافات ہوں گے۔ اور بہت سی ایسی چیزیں وہاں محفوظ ملیں گے جو اب تک کہیں محفوظ نہیں۔ وفات اور انعام یافتہ ادیبوں کی ایک پوری فہرست آجکل کے اداریے سے ترتیب دی جاسکتی ہے، مختلف النوع مسائل پر ایک دستاویز تیار کی جاسکتی ہے۔ جو اب تاریخی اہمیت اختیار کرچکے ہیں۔ مثلاً ترکی میں خلافت کا خاتمہ، دوسری جنگ عظیم اور اس کے اثرات، شہادت حسین اور حکومت الٰہی، ہندستان کی جنگ آزادی، تقسیم ملک کے اثرات، ہندوپاک جنگ، شملہ سمجھوتہ، بنگلہ دیش کی آزادی اور بہت سے اہم واقعات جو اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ آجکل کے اداریے میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

ادیبوں اور شاعروں کی وفات اوران کے انعامات واعزازات اور ان کے غیرملکی سفر کی خبریں جو شاید اخبار کے صفحے میں محفوظ ہوں تو ہوں لیکن کسی ادبی رسالے میں محفوظ نہیں۔ آجکل سے بالترتیب سنہ ان کی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔

زبان وادب کے مسائل، اس سے متعلق حکومت کی پالیسی اور اعلانات یا اس کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی ملک کے مختلف حصوں میں اس کی تعمیر وترقی کی کہانی ہمیں آجکل کے اداریے سے معلوم ہوجائے گی۔ اردو

کا درجہ ہندستان میں اور اردو سے اچھے سلوک کی روایت وغیرہ وہ اداریے ہیں جس سے آزاد ہندستان میں اس کے مستقبل کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
اس طرح ابتدا سے اب تک آجکل کے اداریے یکساں طور پر تاریخی اور ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ آجکل نے ہر دور کے اہم موضوعات ومسائل کو اپنے اداریے کا عنوان دیا ہے اور حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت بھی کی ہے اور مشورے بھی دیے ہیں۔'' (28)

ماہنامہ آجکل نے ایک طویل سفر طے کیا ہے اور آزادی سے قبل نکلنے والے چند رسائل میں سے ایک ہے۔ آجکل نے آغاز سے ہی اپنا منفرد انداز بیان اور اسلوب تحریر برقرار رکھا ہے۔ آجکل کا اداریہ راج نرائن راز کے دور ادارت میں ملاحظات کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ حالیہ برسوں تک جاری رہاہے۔ ابرار رحمانی کے مدیر بننے کے بعد اداریہ کے عنوان سے شائع ہونے لگا۔ اگست 1982 کا شمارہ جمیل مظہری نمبر تھا۔ اس میں جمیل مظہری کی حیات وخدمات پر مشتمل مضامین اور نگارشات پیش کی گئیں ہیں۔ اداریے میں راج نرائن راز نے وزیراعظم کے ذریعے چلائے جارہے بیس نکاتی پروگرام کا جائزہ لیا ہے۔ زراعت اور کاشتکاروں کے لیے جدید ٹکنالوجی کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ کاشتکاروں کے لیے خصوصی پروگرام شروع کیا گیا ہے جسے دیہی ترقیات کے مربوط پروگرام سے وابستہ کردیا گیا ہے۔ کسانوں کو مالی امداد بھی دی جارہی ہے۔ جناب راج نرائن راز نے حکومت کی پالیسیوں کی تعریف کرتے ہوئے اسے ہندستان کے بہتر مستقبل کے لیے امید افزا قدم بتایا ہے۔ اداریہ کے آخر میں جمیل مظہری نمبر کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ علامہ جمیل مظہری کے کلام، ان کی حیات وخدمات سے متعلق مضامین کے حوالے سے اطلاع دی گئی ہے کہ اہم ادیبوں نے اپنے مقالات کے ذریعے جمیل مظہری کو خراج عقیدت پیش کرکے حق ادا کیا ہے۔ اکتوبر 1983 میں 'ملاحظات' میں روزگار کے زیادہ مواقع اور گیان پیٹھ ایوارڈ کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔اداریے میں روزگار کے مواقع میں اضافے کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ افرادی قوت میں دن بہ دن اضافہ ہوجانے

سے روزگار کے مواقع میں کمی آتی جارہی ہے۔ ہندی کی مشہور شاعرہ مہادیوی ورما کو ان کے شعری مجموعے یاما کے لیے گیان پیٹھ ایوارڈ دینے سے متعلق بھی گفتگو کی گئی ہے اور ان کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ فروری 1984 میں ملاحظات میں ''ہمارا خاندانی منصوبہ بندی پروگرام بالکل رضاکارانہ ہے'' کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا گیا ہے۔ یہ وزیراعظم اندرا گاندھی کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے اقوام متحدہ کی طرف سے پاپولیشن ایوارڈ دیے جانے کے موقع پر کی تھی۔ آجکل کے مئی 1986 کے شمارے میں ''دیہی ترقیات کے لیے نئی کوششیں'' آر کے نائیک کے مضمون کو شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 'نیا سلسلہ' کے عنوان سے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ قلمکاروں کی تخلیقات شائع کرنے سے متعلق اعلان شائع کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''قومی یکجہتی وقت کی سب سے زیادہ اہم ضرورت ہے۔ یک جہتی کا احساس ایک دوسرے کو جاننے، متعارف ہونے اور سمجھنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ادب کی اہمیت مسلم ہے۔ اسی امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم آجکل میں ایک عرصے سے علاقائی زبانوں کی شعری وافسانوی تخلیقات شائع کررہے ہیں۔ یہ سلسلہ ہمارے پڑھنے والوں نے بہت پسند کیا۔ ہمارے قلمکاروں نے ہمیشہ اسے دلچسپ اور بامقصد بنانے کی ممکنہ سعی کی۔ مناسب مشورے دیے اور معاونت کی۔'' (29)

آجکل کے جنوری 1987 کے شمارے میں رہائشی پروگراموں میں توسیع کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا گیا ہے۔ حکومت کی اسکیموں اور پالیسیوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے بیس نکاتی پروگرام کی بھی ستائش کی گئی ہے۔ فروری 1987 کے شمارے میں صدر جمہوریہ کا قوم سے خطاب شائع کیا گیا ہے۔ جولائی 1990 کے شمارے میں ملاحظات کے کالم میں صنعتی ترقی کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے مشہور مصنف اورصحافی اندراجیت لال اور بزرگ افسانہ نگار اورادیب کوثر چاندپوری کی وفات پر تعزیت کا اظہار کیا گیا ہے۔

محبوب الرحمٰن فاروقی کے مدیر بننے کے بعد آجکل کے گیٹ اَپ اور اشاعت میں تھوڑی تبدیلیاں کی گئیں اور اداریہ اب ملاحظات کی جگہ اداریہ کے عنوان سے ہی شائع ہونے لگا۔ دسمبر 1990 میں محبوب فاروقی نے ادب کے نوبل انعام یافتہ ادیبوں پر گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے حالات کے حوالے سے بڑے ہی مثبت انداز میں انھوں نے لکھا ہے:

> ’’ملک میں اس وقت جوسیاسی صورتحال ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا بے سود ہوگا کیونکہ پرچہ چھپ کرآنے تک صورتحال بالکل بدل چکی ہوگی۔ بہرحال ایک چیز واضح ہے کہ مذہب کو سیاست کے ساتھ وابستہ کرنے بلکہ سیاست پر مذہب کوتھوپنے کے جونتائج ہوسکتے ہیں وہ سامنے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں کرسی کے لالچ میں وہ سب کچھ کرسکتی ہیں جو ملک کے مفاد کے بالکل ہی خلاف ہو۔ یہ لمحہ سب کے لیےفکر یہ ہے کہ ملک کی سالمیت برقرار رکھنے، مشترکہ کلچرکو بچانے اورفرقہ واریت کے زہرکو کچلنے کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔ اسی پس منظر میں ملک میں ڈاکٹرامبیڈکر کی صدسالہ یوم پیدائش کی تقریبات منائی جارہی ہیں۔ ان تقریبات کوسماجی انصاف کے سال کی شکل میں منایاجارہا ہے۔ جس میں سرکاری سطح پر سماجی انصاف کی خاطر اٹھائے گئے اقدامات کے ذریعہ بڑے پیمانے پر لوگوں میں سماجی انصاف کا شعور بھی پیدا کیا جائے گا۔ قول وفعل کی یہ متضاد تصویریں ہی ہمارے کردار کی آئینہ ہیں۔‘‘(30)

محبوب الرحمٰن فاروقی اورخورشید اکرم ان دونوں حضرات نے آجکل کی ادارتی ذمے داریوں کوبحسن وخوبی انجام دیا ہے اوران کے اداریوں میں ادبی اسلوب نمایاں ہے۔ محبوب الرحمٰن فاروقی کے اداریے بہت ہی موثر ہوتے ہیں۔ ان اداریوں میں ادبی منظر نامہ، سرکاری اسکیموں اور ادب وزبان کی صورت حال، مشترکہ کلچر کی ترقی، ادب کے قاری کی کمی، ادب کے فروغ کی کوششیں اورنئی ٹکنالوجی کی پیش رفت جیسے موضوعات کثرت سے ملتے ہیں۔

اگست 1994 کے آجکل میں محبوب الرحمٰن فاروقی نے معین احسن جذبی پر خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ اداریہ میں انھوں نے جذبی کی شاعری اور ان کی زندگی کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔محبوب فاروقی نے لکھا ہے کہ جذبی ایک ایسا شاعر ہے جسے شہرت و نام ونمود کی کبھی خواہش نہیں رہی، وہ ہمیشہ گوشہ تنہائی میں جیتا رہا ہے اور اردوادب واردوشاعری کی خاموشی سے خدمت کرتا رہاہے۔جذبی نے 1943 سے 1945 تک آجکل کے نائب مدیر کے فرائض بھی انجام دیے۔

اکیسویں صدی کی شروعات میں آجکل میں دوبارہ تبدیلی ہوتی ہے اور اب اداریہ ملاحظات کے عنوان سے شائع ہونے لگا۔ اس وقت مدیر اعلیٰ وشوناتھ رام سیش تھے۔ ان کے دور ادارت میں اداریہ بہت کم شائع ہوا ہے۔ بعد میں جب ابرار رحمانی مدیر ہوئے تو انھوں نے کافی بہتر اورمفکرانہ ومدبرانہ اداریے لکھے۔اکتوبر 2006 کے آجکل میں پریم چند پر خصوصی گوشہ شائع کیا گیا تھا۔ اس شمارے میں پریم چند کے حوالے سے کافی قیمتی اور اہم مضامین اور نگارشات کو جگہ دی گئی ہے۔ ابرار رحمانی اکتوبر 2006 کے اداریے میں رقم طراز ہیں:

> ’’قارئین کرام ایک بار پھر ہم ہندستانی فکشن لجنڈ پریم چند پرایک بھرپور اورنایاب گوشہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔ پریم چند ہندستانی فکشن کے سب سے درخشاں ہیرو بلکہ ہیرا ہیں۔انھوں نے جس قدر چیزیں تخلیق کی ہیں اورجس تواتر سے کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ جو اس زمانے کے مختلف رسائل وجرائد اوراخبارات میں ہنوز دبی پڑی ہیں اوردھیرے دھیرے یہ چیزیں عاشقین پریم چند کے ذریعہ سامنے آرہی ہیں۔تحقیق میں کچھ حرف آخرنہیں ہوتا۔ آج کی تحقیق میں بھی اختلاف رائے ہوسکتا ہے۔ پریم چند کے سلسلے میں کچھ ایسے تنازعات اس لیے کھڑے ہوگئے کہ پریم چند نے بیک وقت اپنی تحریروں میں مصلحتاً کئی قلمی اورفرضی ناموں کااستعمال کیا۔ زیرنظر شمارہ میں ہم پریم چند کی کچھ

ایسی ہی گم شدہ اور نایاب تخلیقات شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ جو انہی مخففات یا فرضی ناموں سے شائع ہوئیں اور جو اب تک پچھلے سوسالوں سے بوسیدہ رسائل کے اوراق میں دفن تھیں۔'' (31)

آجکل میں مدیران کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اداریوں کے اسلوب اور طرز تحریر میں بھی تبدیلی ہوئی ہے۔ یوں تو عام طور پر اس رسالے کے اداریے میں سرکاری پروگراموں، سرکاری اسکیموں اور مختلف سیاسی سرگرمیوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ لیکن جب کوئی خالصتا ادب نواز شخص جریدے کا مدیر بنا ہے تو اس نے خالص ادبی اداریہ لکھنے کی بھی سعی کی ہے۔ جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، راج نرائن راز، محبوب الرحمٰن فاروقی، ابرار رحمانی، عابد کرہانی اور خورشید اکرم وغیرہ آجکل کے ایسے مدیر ہیں جن کے اداریوں میں ادب وزبان اور اردو کی ادبی صحافت کو بہتر بنانے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود رہا ہے۔ ان کے اداریوں میں جہاں ادب کی غرض وغایت اور مقاصد کو پیش کیا جاتا رہا ہے وہیں موجودہ صورتِ حال میں ادب کو بہتر بنانے، جدید ٹکنالوجی اور اردو زبان وادب، اردو تعلیم جیسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ آجکل نے اپنے اداریوں کے ذریعے مختلف سماجی مسائل کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سماجی وسیاسی مسائل عوام سے الگ نہیں ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ عوام کی مشکلات وپریشانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام کے تمام مسائل کا حل تلاش کرے۔ اگست 2004 میں آجکل کے 62 سال پورے ہونے پر آجکل کی خدمات سے متعلق مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ اس شمارے کا اداریہ بعنوان عرض ناشر پروفیسر اما کانت مشرا (ڈائریکٹر) نے لکھا ہے۔ انھوں نے آجکل کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ آجکل نے گزشتہ 62 برسوں سے ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یوں تو پبلی کیشنز ڈویژن میں رسائل کے 21 چاند تارے ہیں لیکن آجکل (اردو) اور آجکل (ہندی) اس کی آنکھوں کے تارے اور آسمان ادب پر چمکنے والے ستارے ہیں۔ آجکل (ہندی) کو شائع ہوتے ہوئے 60 سال

ہو چکے ہیں لیکن ماہنامہ آجکل (اردو) کی اشاعت کا یہ 62واں سال ہے۔ اس طرح آجکل (اردو) کی عمر آجکل (ہندی) سے دوسال زیادہ ہے اور یوں وہ اس کے بڑے بھائی کا درجہ رکھتا ہے۔ چند ماہ قبل جب ہم نے آجکل (ہندی) کی ہیرک جینتی منانے کا فیصلہ کیا تو خیال یہ تھا کہ آجکل (ہندی) اور آجکل (اردو) کا 60 سالہ جشن ایک ساتھ منایا جائے جب کہ مجھے معلوم تھا کہ آجکل (اردو) تو اپنی عمر کے 62ویں سال میں ہے۔ بہر حال یہ فیصلہ کیا گیا کہ آجکل اردو کی اشاعت کے 62ویں سال پر اس کی گزشتہ دہائی میں شائع شدہ افسانوں کا ایک انتخاب افسانہ آجکل کے عنوان کے تحت اور زیر اشاعت شمارے اگست 2004 میں ماہنامہ آجکل (اردو) سے متعلق چند مضامین شائع کیے جائیں۔ پروفیسر اُما کانت مشرا (ڈائرکٹر)(32)

ملک میں اردو رسالوں کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ اردو ادب اورصحافت کی ترویج واشاعت اورفروغ میں اردو رسالوں نے نمائندہ کردار ادا کیا ہے۔ ماہنامہ آجکل سرکاری رسالہ ہوتے ہوئے بھی ادبی خدمت کرنے میں پیش پیش رہا ہے۔2006 میں خورشید اکرم کے اداریے اس معنی میں قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے زیادہ تر اداریے اردو ادب وزبان سے متعلق تحریر کیے ہیں۔ ان کے اداریے اپنے آپ میں مکمل ہیں اور ان میں اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق وشوق نظر آتا ہے۔ خورشید اکرم نے موجودہ ادب کی صورتِ حال، ناول نگاری کے رجحانات، سرسید تحریک، ادبی رسائل کی اہمیت وافادیت، حبیب تنویر اور ہندستانی تھیٹر، قلم کار اورقاری کا رشتہ جیسے اہم موضوعات پراداریہ لکھ کر اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے اداریے اس لائق ہیں کہ انھیں الگ سے کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ انھوں نے 2006 میں آجکل کے مدیر کا عہدہ سنبھالا تھا اور اس وقت سے ہی وہ ایک بہتر قلمکار اور بہتر مدیر کے فرائض انجام دیتے آرہے ہیں۔

میں نے خورشید اکرم سے ملاقات اوران سے رسالہ آجکل کے حوالے سے تفصیلی گفتگو

کی۔ انھوں نے خود بھی کہا کہ بھلے ہی آجکل سرکاری رسالہ ہے لیکن ادب کی خلوص دل سے خدمت کرنے میں یہ دوسرے اہم ادبی رسائل سے کسی طور سے پیچھے نہیں ہے۔ ان کے اداریوں سے ہی ان کی قلمی صلاحیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے تنقیدنگار اورصحافی ہیں۔ جس قلمی بصیرت کا مظاہرہ انھوں نے اپنے اداریوں میں کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ ملاحظہ ہو ان کے اداریے کا یہ اقتباس:

> ''اردو ادب میں اس وقت بہت خاموشی سے ایک خوشگوار تبدیلی آرہی ہے۔غزل اور افسانہ جیسی مختصر اصناف کے قبیل اردو ادب میں ناول نگاری کا نیا رجحان پیدا ہوا ہے۔ اردو میں اب تک فکشن کا مطلب افسانہ ہی لیاجاتا ہے۔ یوں کہ قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین کے ماسوا کوئی اور فکشن نگار ایسا نہیں ہے جس نے اپنی شناخت افسانے سے نہ بنائی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے تقریباً سوسال کے عرصے میں اردو میں جو افسانے لکھے گئے اس نے عالمی پیمانے پر افسانے میں ہونے والی تبدیلیوں سے خاطرخواہ استفادہ کیا اور کافی حد تک یہ عالمی ادب کی ہمسری کا بھی دعویٰ کرسکتا ہے...
>
> 1950 کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں آگ کا دریا اور اداس نسلیں کے علاوہ غالباً کسی اور ناول کا کماحقہٗ تنقیدی محاکمہ نہیں ہوا۔ بالخصوص پچھلے بیس برس کے دوران لکھے گئے ناولوں کے ساتھ اردو تنقید کا رویہ خاصا غیر سنجیدہ رہا ہے جس کا سب سے زیادہ نقصان ناول نگاروں کو ہی ہوا ہے۔ اچھی تنقید اچھے ادب کا شعور پیدا کرتی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نئے ناولوں پر سنجیدگی سے توجہ کی جائے۔'' (33)

اگست 2009 کے اداریے میں عارف الاسلام کے ناول اتاترک فی کربلا پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس اداریے میں خورشید اکرم نے بڑے اچھے انداز میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح کی متنازعہ کتاب لکھنے سے ادب میں نقصان ہی ہوتا ہے اور

ادب کے ساتھ ساتھ قاری پر بھی اس کا منفی اثر پڑتا ہے۔

> ''کتاب خواہ وہ کتنے ہی معمولی مصنف کی ہو، اگر وہ ہمارے عہد، سماج اور تاریخ کی غلط اور متشدد تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے نظر انداز کردینا دور اندیشی نہیں ہے۔ ایک غلط کتاب کل کسی غلط مورخ اور مفسر کے ہاتھ لگ سکتی ہے اور فتنہ وفساد کی نئی بنیادیں پڑسکتی ہیں...
>
> کتاب پوری انسانیت سے مخاطب ہوتی ہے اس لیے لکھنے والے کو اپنی وسیع تر ذمہ داری کا ادراک واحساس ہونا چاہیے، لفظ دلوں کو جوڑتا بھی ہے اور توڑتا بھی۔ خدا کرے کہ ہم لفظ کی قوت کو سمجھیں اور اسے جنون کے حوالے کرنے سے بچیں۔'' (34)

ادبی صحافت کی ترقی کا دارومدار اداریوں پر بھی ہوتا ہے۔ یوں تو عموماً رسالوں میں اداریے کسی عام خبر یا سرکاری اسکیموں سے متعلق اور اردو زبان وادب کے مسائل یا اردو کی بے کسی و بے بسی اور بربادی سے بھرے ہوتے ہیں۔لیکن اداریے اردوزبان میں ہورہی خوشگوار تبدیلیوں، ادب کے تئیں لوگوں کے بڑھتے رجحان اور خوش کن باتوں پر بھی لکھے گئے ہیں جن سے ایک طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ قلمکار اورقاری کے درمیان ایک بہتر رشتہ تبھی استوار ہوسکتا ہے جب قاری بھی قلمکار کی نگارشات کو تحسین وآفرین کی نظر سے دیکھے اورصحت مند طریقے سے اس پر تنقید کرے۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی کے اداریے موضوعات کے اعتبار سے اعلیٰ سطح کے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے نوبل انعام، ہندستانی جمہوریت، عالمی ادب اور غالب، یوم خواتین اورادب، اردو مشاعرے، اردو اکادمیاں اوراردوزبان کی صورتِ حال کے تعلق سے بیش قیمت اداریے تحریر کیے ہیں۔

انھوں نے اپنے اداریوں کے ذریعے اردو زبان وادب اورصحافت کو اور بہتر بنانے کی کوشش کرنے کے لیے کہا ہے۔ اپنے ایک اداریے میں مشاعروں کی صورتِ حال پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے یہ درخواست کی ہے کہ ہم اردو والوں کو مشاعروں کا معیار درست کرنے اور بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔تب ہی اردو شاعری اور مشاعروں کی سطح بلند ہوگی

اور اردو زبان کو بھی فروغ ہوگا۔

غرض یہ کہ آجکل کے اداریوں میں شروع سے ہی کافی پھیلاؤ رہا ہے اورادب کی تمام صنف کے ساتھ ساتھ عالمی ادب اورمختلف سیاسی، سماجی اورمعاشی موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ ان موضوعات پر لکھے اداریے آجکل کی ادبی شناخت کو اور بھی واضح کرتے ہیں۔

اردو ادب: رسالہ اردو ادب نئے دم خم کے ساتھ جولائی 1950 میں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے تحت آل احمد سرور کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ یوں تو اس رسالے کی شروعات 1921 میں مولوی عبدالحق کی سرپرستی میں ہوئی تھی لیکن آزادی کے بعد مولوی عبدالحق کے پاکستان چلے جانے کے بعد رسالہ اردو ادب پاکستان سے نکلنے لگا اور ہندوستان میں اس رسالے کو آل احمد سرور نے شروع کیا۔ اس کے اداریے حرف آغاز کے عنوان سے شائع ہوتے تھے۔ آزاد ہندستان کے بعد اردو ادب کے پہلے شمارے جولائی 1950 کے اداریے میں رسالہ اردو ادب کی خدمات اور اردو کے حوالے سے تحقیق وتنقید کی سمت ورفتار کے موضوع پر آل احمد سرور نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ سرتیج بہادر سپرو، اختر شیرانی اور میراجی کے انتقال پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری پر گفتگو کی گئی ہے۔ آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ اختر شیرانی اور میراجی کی وفات سے اردو کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے:

> ''اختر شیرانی اور میراجی دونوں کے انتقال سے اردو ادب میں دوصاحب طرز شاعروں کی کمی ہوگئی۔ اختر شیرانی ہمارے پہلے سچے رومانی شاعر ہیں اور شاعری میں رومان کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک روایت بن گئے تھے اور کتنے ہی نوجوانوں کو انھوں نے متاثر کیا تھا۔'' (35)

رسالہ اردو ادب کو آل احمد سرور نے خالصتاً زبان وادب کے شعبے میں تحقیق وتنقید کے لیے شروع کیا تھا۔ اس کے اداریے بھی اردو ادب وزبان کی ترقی وفروغ کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ آل احمد سرور کی ادارت میں اداریے شائع تو ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی

اداریوں کے بغیر بھی رسالے کو شائع کیا گیا ہے۔ اکتوبر 1950، جنوری 1951،اپریل 1951، جولائی 1952، جون 1953 کے شمارے میں اداریے شائع نہیں ہوئے ہیں۔

رسالہ اردو ادب اس معاملے میں ممتاز رسالہ ہے کہ اس سے مولوی عبدالحق، آل احمد سرور، خلیق انجم، اسلم پرویز جیسے اردو کے نامور محققین و اردو داں جڑے رہے ہیں۔خلیق انجم نے اپنے دورادارت میں بڑی تعداد میں اہم اور خصوصی نمبر نکالے ہیں۔1974 میں انھوں نے دہلی کے اردو مخطوطات کی فہرست پر مبنی ایک خصوصی نمبر شائع کیا تھا جسے ڈاکٹر صلاح الدین نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں دہلی کی لائبریریوں میں محفوظ مخطوطوں کی مکمل فہرست دی گئی ہے۔ اردوزبان وادب میں اس خاص نمبر کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس طرح کی فہرست اورحوالوں سے اردو تحقیق وتنقید کی نئی سمت متعین ہوتی ہے۔ اس خصوصی نمبر کے اداریے حرف آغاز میں ڈاکٹر صلاح الدین لکھتے ہیں:

> ’’اردو کے تحقیقاتی کام کے ضمن میں ان قلمی کتب کی وضاحتی فہرستوں کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے وہ ایک ایسی مسلم حقیقت ہے جس سے کسی کو انکارنہیں ہوسکتا۔ بقول نجیب اشرف ندوی، ’’کسی زبان کی تاریخ کا اصولی حیثیت سے مطالعہ کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ سارا ادب پیش نظر رہے لیکن اردو ادب سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے اور اس پر دسترس مشکل ہے اس لیے زبان اورادب کی خدمت کے لیے یہ ضروری ہے کہ مفصل اورمکمل وضاحتی فہرستیں مرتب کرکے شائع کی جائیں۔ یہ چیزیں یورپ میں ایک سائنس کی صورت اختیار کرچکی ہیں۔‘‘ (36)

رسالہ اردو ادب کے علی گڑھ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد خلیق انجم نے جب اس کی ادارت سنبھالی تو اسے اور بہتر بنانے کی ہرممکن کوشش کی اور اقبال نمبر، امیرخسرو نمبر، اورانیس نمبر شائع کیے۔ اردو ادب کے علاوہ انجمن کے دوسرے کاموں میں بھی تیزی لانے کے لیے انھوں نے کافی کوششیں کی۔ جیسا کہ جولائی تا دسمبر 1974 کے شمارے میں وہ لکھتے ہیں:

''علی گڑھ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد انجمن کے کئی شعبوں میں نمایاں ترقی ہوئی۔ مثلاً ہماری زبان پہلے سے کچھ بہتر ہوا۔ اس کے خریداروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ کتابوں کی اشاعت کی رفتار بڑھی۔ انجمن کی کچھ اور پرانی کتابوں کے ایڈیشن شائع کیے گئے۔ کچھ نئی کتابیں چھاپی گئیں۔ لیکن نئے حالات کا اردو ادب پر برا اثر پڑا۔ پروفیسر آل احمد سرور کے زمانے میں اردو ادب پابندی سے شائع ہورہا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ پابندی قائم نہیں رہ سکی۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں لیکن بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ اردو ادب کے خریدار بہت کم ہیں۔ اگر ہمارے پڑھنے والے اس طرف توجہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو ادب کے خریداروں میں اضافہ نہ ہو۔'' (37)

سہ ماہی رسالہ اردوادب نے اردوزبان و ادب کی تحقیق اوراشاریہ سازی کے حوالے سے بہت کام کیے ہیں۔ دہلی کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست کے علاوہ رسالہ معارف اعظم گڑھ کا اشاریہ بھی اردو ادب میں شائع ہوا تھا۔ یہ 1983 کے شمارہ 3 جولائی میں شائع ہوا تھا جسے ڈاکٹر صابرہ بیگم نے ترتیب دیا تھا۔ اداریے میں اشاریہ معارف کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔ 1982 کے شمارہ 2، 3 اور 1983 کے شمارہ 2,1 پر مبنی ایک خاص نمبر شائع کیا گیا تھا جس میں اردو اور ہندی کے حوالے سے کافی تفصیلی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اس کا اداریہ بھی کافی طویل اور 15 صفحوں پر مشتمل تھا۔ اس اداریے میں مدیر خلیق انجم نے اردو اور ہندی کے رشتوں کی بنیاد پر اظہار خیال کیا ہے۔ خلیق انجم کا یہ اداریہ ایک علمی مضمون کی شکل اختیار کرگیا ہے۔ اس میں انھوں نے آزادی کے بعد اردوزبان پر لگنے والے الزامات اور اردو کی شروعات اوراس کے رسم الخط کے حوالے سے کئی تاریخی حقائق کو پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان ہندستان کی پیداوار ہے اور یہیں پلی بڑھی ہے۔ ہندی اوراردو دو الگ الگ زبانیں ہوتے ہوئے بھی آپس میں کافی مماثلت رکھتی ہیں۔ اردو کومٹانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے اس شمارے

میں اردو کے حوالے سے ہندی ادیبوں کی آرا کوشامل کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کو غیر ملکی بتانے والے ادیب خود اردو سے نابلد ہیں۔ انھیں تاریخ کا علم نہیں ہے۔ خلیق انجم نے اس اداریے میں اردو ہندی تنازع کوحل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو پر لگنے والے الزامات بے بنیاد ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ہندی کے ماہرین لسانیات اوردانشوروں نے اردو اور ہندی کے تنازع کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے ان میں بہت کم لوگ ہیں جواصل مسئلے سے واقف ہیں اور جو واقف ہیں انھوں نے اردو کے خلاف جان بوجھ کر غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہیں۔ ہندی کے بیشتر دانشوروہ ہیں جنھیں اس کا قطعاً علم نہیں کہ زبانیں کس طرح ارتقا پذیر ہوتی ہیں اور کس طرح اپنے عہد کی مروجہ زبانوں سے لفظیات اوراصناف سخن وغیرہ مستعار لیتی ہیں اگر یہ حضرات ہندستان کی تمام زبانوں، جس میں ہندی بھی شامل ہے، پر انگریزی زبان وادب کے اثرات سے تھوڑے بہت بھی واقف ہوتے تو اردو کے خلاف اس طرح کی باتیں ہرگز نہ کرتے۔'' (38)

خلیق انجم کی ان باتوں سے ظاہر ہے کہ انکارنہیں کیا جاسکتا۔ اردو زبان ہندستان میں ہی پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔ کھڑی بولی، شورسینی اَپ بھرنش اور پراکرت جیسی بولیوں کے ارتقا پذیر ہونے کے بعد اردو زبان عالم وجود میں آئی اور آج ہندوستان کا ہر ذی ہوش طبقہ اردو زبان کا استعمال کرتا ہے چاہے خالص شاعری ہو یا فلمی نغمے یا عام بول چال کی زبان ہو سبھی جگہ اردو کا ہی استعمال ہوتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ زبانیں بولنے والے اسے ہندی زبان سمجھتے ہوں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اردو زبان کو ہندی سمجھ کر بولتے ہیں۔

اسلم پرویز کے اداریے کافی متنوع ہیں اورانھوں نے اردو ادب وزبان کی صورتِ حال اور تاریخ کے حوالے سے کافی گفتگو کی ہے۔ان کے دور ادارت میں شائع ہونے والے شماروں میں اردو زبان کی تاریخ وتحقیق، پرانے اور کلاسیکی شعرا کی باز یافت جیسے موضوعات

پر مضامین شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے غالب، اقبال، اردو زبان وادب کی صورتِ حال پر کافی بہترین اداریے قلم بند کیے ہیں۔ پیش ہے ان کے اداریے کا یہ اقتباس:

’’غالب کی مثال ایک انتہائی زرخیز خطہ زمین کی سی ہے۔ اس خطہ زمین کی دانشورانہ لوٹ کھسوٹ کا کاروبار ایک صدی سے جاری ہے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غالب سے متعلق اس ہیجانی کیفیت سے باہر آئیں اور سب سے پہلے غالب کا ایک مستند جغرافیہ ترتیب دیں۔ اس طرح کے غالب اٹلس (ATLAS) کام کے لیے ہم قیامت تک کسی جانسن کا انتظار نہیں کر سکتے اور یوں بھی غالب جانسن سے زیادہ شاید کسی باسویل کا مستحق ہے۔‘‘(39)

اسلم پرویز کے لکھے اداریوں میں ایک بات بڑی واضح نظر آتی ہے کہ ان کے اداریے خود اپنے آپ ہی اشارہ کر دیتے ہیں کہ یہ اسلم پرویز نے لکھے ہیں۔ ان کے اداریوں میں کچھ ایسا اسلوب پایا جاتا ہے اور الفاظ وبیان کی ایسی درستگی ہے جو اپنے آپ میں بے مثال ہے۔ ان کے اداریوں میں ایک تلخی وترشی تو ہے ہی ساتھ میں اردو کے سچے محافظ کے دل سے نکلنے والی آواز کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

’’آج عالم یہ ہے کہ اردو بے چاری، اردو تحریک اور ارباب حل وعقد کے درمیان اس مجبور و بے کس انارکلی کی طرح کھڑی ہے جس سے مخاطب ہوتے ہوئے مغل اعظم کے مہابلی پرتھوی راج کپور نے کہا تھا انارکلی سلیم تجھے مرنے نہیں دے گا اور ہم تجھے جینے نہیں دیں گے۔

ہندستان کے رجائیت پسند اردوداں نصف صدی کے اس انتہائی سنگین بحران کے باوجود یہ تسلیم کرنا نہیں چاہتے کہ اردو مر چکی ہے چوں کہ یہ تسلیم کر لینے کا سیدھا مطلب اپنی شکست مان لینا ہوگا لیکن ہمارے پیش نظر یہ حقیقت بھی رہنی چاہیے کہ کسی زبان کو مرتے دیر نہیں لگتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی بعض بڑی زبانوں نے مر کر بھی دکھا دیا ہے اور زبانیں مر کر

دوبارہ زندہ نہیں ہوتیں یہ بات اردو کے مخالفین تو جانتے ہیں اردو کے حامیوں کو بھی اسے باور کرنے کی ضرورت ہے۔'' (40)

اسلم پرویز کے اداریے مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ادب اور تحقیق کا رشتہ، ادبی روایت اور شعر فہمی، غیر ملکی ادب جیسے موضوعات پر انھوں نے نہایت قیمتی اور پرمغز اداریے تحریر کیے ہیں۔ ان کے اداریوں میں جہاں اردو زبان وادب کی روشن تاریخ ہوتی ہے وہیں موجودہ صورتِ حال کے پس منظر میں اس کی بے بسی وکربنا کی کا بیان بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے نہایت مضبوط اور مربوط انداز میں تسلسل کے ساتھ اس موضوع سے انصاف کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں اردو زبان وادب کے ایک سچے خادم کا درد دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اردو زبان پر لگنے والے الزامات اور اردو کی بے بسی اور ناکامی پر بڑے ہی اچھے انداز میں لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں اردو کی بے کسی وناکامی کے لیے کبھی بھی رونے اور آنسو بہانے جیسی باتیں نہیں ہیں بلکہ اپنے حق کے آگے سینہ سپر ہونے، سامنے آکر اردو کو منوانے اور ماضی کے حالات کو پیش کرکے مستقبل وحال کو روشن کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ اردو تحقیق کی موجودہ صورتِ حال پر طنز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اردو تعلیم کی حالت پچھلی نصف صدی سے آگے ہی ابتر ہے۔ یونیورسٹیوں کے شعبوں میں اردو تحقیق کا کام زیادہ تر بے کاری کا مشغلہ ہوکررہ گیا ہے یعنی آگے نوکری نہیں تو پی ایچ ڈی ہی سہی۔ دوسرے معاشرے میں ہر سطح پر افراط وتفریط کا وہ عالم ہے کہ سنجیدگی اور یکسوئی اور علم دوستی کے جذبے کے ساتھ کام کرنے کی نہ کسی کو مہلت ہے اور نہ اس میں اتنا تحمل بھی ہے۔ ادھر الیکٹرانک میڈیا۔ خصوصاً ٹی وی، پرنٹ میڈیا کے سامنے مگر مچھ کی طرح منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ کتابیں جنھیں تاریخ اب تک جنم دے چکی ہے، اب سراسیمہ سی دکھائی دیتی ہیں جونئی آرہی ہیں پڑھنے والے ان سے گریز اں دکھائی دیتے ہیں جو آئندہ آنے کو ہیں وہ تاریخ کے رحم میں

ابھی سے سہی پڑی ہیں۔ ایسے میں اردو تحقیق اور تدوین کی سمت اور رفتار
اگلی صدی میں کیا ہوگی یہ بات کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔'' (41)

اس اداریے میں انھوں نے اردو تحقیق کی صورتِ حال پر بڑے ہی تلخ انداز میں وار کیا ہے۔ ان کی باتوں سے انکار نہ کرتے ہوئے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ تحقیق کے لیے بہت وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایسا دریا ہے جس میں طویل عرصے تک غوطہ لگائے بغیر گہر حاصل نہیں ہوتا ہے۔ برسوں کی کوششوں اور قلمی شہسواری کے بعد ہی کوئی بڑا محقق پیدا ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ حالات وواقعات کو دیکھتے ہوئے بے چارہ آج کا طالب علم کرے بھی تو کیا کرے۔ اردو کی حالت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے، پی ایچ ڈی کے بعد جس دور سے وہ گزرتا ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے۔ ملازمت کی کمی اور در در کی ٹھوکریں اس کا مقدر ہوتی ہیں۔ نہایت یکسوئی سے کام کرنے کے بعد بھی بہت سارے اچھے طلبا کو ملازمت نہیں ملتی۔ ایک تو ملازمت کی کمی ہوتی ہے۔ مزید ان میں جانب داری بھی برتی جاتی ہے۔ اب ایسی حالت میں وقت کے ستائے ہوئے طالب علم سے کس طرح کی تحقیق کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جہاں کچھ طالب علم اپنے کام کو ڈھنگ سے نہیں کرتے وہیں ان میں سے کچھ طلبا ایسی صورتِ حال کے باوجود اپنی تحقیق کو ایک معیار اور اعلیٰ سطح کے علمی وادبی کام میں تبدیل کرلیتے ہیں اور ایسے طالب علموں کی حوصلہ افزائی بھی بہت ضروری ہے۔

اسلم پرویز کے اداریے دوسرے مدیروں کے اداریوں سے اس معاملے میں بھی ممتاز ہیں کہ اسلم پرویز خود بھی اردوادب کے استاد رہ چکے ہیں انھیں زبان وادب کی تعلیم وتربیت کا خاصا انداز ہ ہے۔ انھیں اردو کی موجودہ صورتِ حال کا علم بھی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اردو زبان وادب کی موجودہ سمت ورفتار کیا ہے۔ ان کے اداریوں میں اردو کی علمی وادبی تاریخ کے ذکر کے ساتھ ساتھ موجودہ عہد میں اردو ادب وزبان کے حالات کا نقشہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اردو ادب کے اداریوں میں اسلم پرویز کے اداریے کافی اہم اور دستاویزی نوعیت کے ہیں اِنھیں اردوادب کے ساتھ ساتھ غیر ملکی ادب پر بھی خاصا عبور

حاصل ہے۔ ادب اور تحقیق کے میدان میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

نیادور: اس کا پہلا شمارہ اپریل 1955 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس سے قبل یہ اطلاعات کے نام سے سرکاری رپورٹوں اورخبروں کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔ نیا دور نے آغاز سے ہی اردو ادب اورزبان کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ نیادور جہاں اپنے خصوصی نمبروں، خصوصی گوشوں کے لیے مشہور ہے وہیں اس کے اداریے بھی حالات وعصری صورتِ حال سے مطابقت رکھتے ہوئے شائع کیے جاتے رہے ہیں۔ اداریے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کسی بھی اخبار یارسالے کی پالیسی اور اس کے نظریات کوواضح کرتا ہے۔ نیا دور اس معاملے میں ممتاز ہے کہ سرکاری رسالہ ہونے کے باوجود اس نے ادبی تعلیمی سرگرمیوں کا بھی بھر پور احاطہ کیا ہے۔ نیا دور چونکہ سرکاری رسالہ ہے اس لیے اس کی اپنی حدود بھی ہیں اس لیے اس رسالے میں سرکاری پالیسیوں سے متعلق اداریے زیادہ تعداد میں لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر مسعود خاں لکھتے ہیں:

> ''اداریہ ایڈیٹر کے خیالات ونظریات اور ملکی وسماجی حالات کا بہترین عکاس اورادبی رجحان کا نباض ہوتا ہے۔ نیادور میں بھی ہر موضوع پر اداریے شائع ہوتے رہے ہیں۔ سیاسی بھی اور ادبی بھی، سماجی بھی اور تاریخی بھی، کبھی ان میں یک رنگی بھی رہی ہے اور کبھی رنگارنگی بھی۔ ندرت اورتنوع نیادور کے اداریوں کی ایک منفرد خصوصیت رہی ہے۔علی جواد زیدی کے اداریے جہاں ادب کے جدید رجحانات سے روشناس کراتے ہیں وہیں فرحت اللہ انصاری کے اداریے وقت کی آواز معلوم دیتے ہیں۔
>
> لہٰذا نیادور کے اداریے عصری حالات کا بخوبی اوربہترین جائزہ پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں تاہم اگر اداریوں کی دلکشی اور رعنائی، موضوعات کی رنگارنگی، ادب کی چاشنی، طنز کی کاٹ، سماجی حقیقت نگاری اور منفرد اسلوب نگارش وغیرہ کی آویزش دیکھنی مقصود ہوتو یہ صرف شاہنواز قریشی کے اداریوں میں موجود ہے۔ انھوں نے اداریوں کو بہترین ادب پاروں

کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کے تحریر کردہ بیشتر اداریوں کی ملک کے کم وبیش سبھی قلمکاروں نے ستائش کی ہے۔ ان کے اداریے ہر بار نئے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اور اپنی انفرادیت کے باعث تحسین اور قابل مطالعہ ہیں۔

نیا دور چونکہ اترپردیش کا سرکاری پرچہ ہے اس لیے اس کے کئی اداریے سرکار کی پالیسیوں اور اس کے کاموں یا قومی رہنماؤں کے بارے میں بھی تحریر کیے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے اداریوں میں علمی، ادبی اور سماجی مسائل کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے اور ادب کے تازہ رجحان، اردو ادب حضرات کی عدم توجہی اور زبان وادب کی موجودہ صورتِ حال کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔'' (42)

نیادور نے شروعات سے ہی ادب میں ایک صحت مند اورصالح مکتب فکر کی تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ رسالہ نیادور کے پہلے مدیر علی جواد زیدی نے جنوری 1956 کے اداریے میں بھی لکھا ہے کہ نیادور ہر مکتب فکر کا نمائندہ ہے اور اس کا مقصد یہی ہے کہ صحت مند ادب کی خدمت کرے اور ادب کی تعمیر وترقی میں بہتر کردار ادا کرے۔ نیادور کے اداریوں میں کافی تنوع بھی نظر آتا ہے۔ ادب وزبان کے ساتھ ساتھ اداریوں میں عصری حالات وواقعات کے متعلق بھی بات کی جاتی رہی ہے۔ اپریل 1956 کے اداریے میں نیادور کی اشاعت کے ایک سال پورے ہونے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مشاعروں کی اہمیت اور ترقی پسند ادب جیسے موضوعات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اترپردیش سرکار کی پالیسیوں،منصوبوں، عوام کے لیے سرکار کی حکمت عملی، نئی اسکیموں، مراعات، سرکار کے اقدامات جیسے موضوعات پر بڑی تعداد میں اداریے لکھے گئے ہیں۔ جنوری 1958 میں اترپردیش کے وزیراعلیٰ سمپورنانند کی حیات وشخصیت اور پنج سالہ منصوبوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ اپریل 1958 میں وزیر مالیات کی بجٹ تقریر اور دوسرے پنج سالہ منصوبے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مئی 1958 میں آزادی کے بعد اترپردیش میں حفظان صحت،

جنوری1958 میں اتر پردیش میں بڑھتی آبادی کا مسئلہ واتر پردیش سرکار کی خریف مہم، جنوری 1959 میں پنچ سالہ منصوبوں میں اتر پردیش کی کامیابی، مارچ 1959 کے شمارے میں وزیر مالیات سید علی ظہیر کے ذریعہ یوپی اسمبلی میں بجٹ پیش کیا گیا۔ مئی 1959 میں اتر پردیش سرکار کی جانب سے اردو کتابوں پر انعام کی پیش کش، جولائی 1959 میں یوپی سرکار کی بے روزگاری کے لیے اسکیم، جون 1960 میں اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں کا تذکرہ جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اہم شخصیات کے حوالے سے بھی کافی اداریے شائع کیے گئے ہیں۔ اکتوبر 1958 میں مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت،نومبر 1958 میں جواہر لعل نہرو کی 69ویں سالگرہ، اپریل 1961 میں پنڈت گووند ولبھ پنت کے انتقال پر تعزیت، مئی 1961 میں موتی لعل نہرو اور رابندر ناتھ ٹیگور کی پیدائش کا صد سالہ جشن، مئی 1962 میں ریاست کے نئے گورنر بشوناتھ داس کا تعاون، اپریل 1963 میں ڈاکٹر راجندر پرساد کے انتقال پر تعزیت، اکتوبر 1964 میں مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت، نومبر 1964 میں نہرو کی 75ویں سالگرہ پر خراج عقیدت، جون 1969 میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال پر تعزیت، اپریل 1975 میں شمیم کرہانی کے انتقال پر تعزیت، مئی 1977 میں وزیر اعظم مرار جی دیسائی کی حیات وخدمات، ستمبر 1978 میں فیض کی ادبی خدمات، اگست 1980 میں علی جواد زیدی کی خدمات وشخصیت، نومبر، دسمبر 1980 میں منشی نول کشور کی صحافتی خدمات، دسمبر 1988 میں صالحہ عابد حسین، جمیل مہدی، مجنوں گورکھپوری، مولانا امداد صابری، اختر انصاری کے انتقال پر تعزیت اوران کی خدمات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ادب کی صورتِ حال اورادب وصحافت کی ترقی پر بھی کافی اداریے لکھے گئے ہیں۔ دسمبر 1990 میں جنگ آزادی میں اردو ادب کا رول، جون 1991 میں ادب میں علامت اور تجرید، عوام اور ادب کے رشتے، جولائی 1991 میں ادب کا اسلوب اور معاشرے کی اصلاح، مارچ، مئی 1995 میں ادب میں انسانی حقوق۔ نیادور کی نصف صدی میں صحافتی خدمت نے مارچ 1998 میں شاعری میں غیر ضروری ابہام، انسان میں سادگی بیان، اپریل 1999 میں علامت اور تجرید سے ادب کو نقصان، مئی 1999 میں ادب میں جذبات نگاری، ستمبر 2000 میں اردو اخبار ورسائل کی

خریداری اردو زبان کی ترقی، مارچ 2001 میں اردو افسانے میں پریم چند کی تکنیک اور موضوعات، اگست 2001 میں ادب اور ادیب کی ذمے داری جیسے خالص ادبی موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

مئی جون جولائی 1984 میں فراق نمبر حصہ دوم شائع کیا گیا تھا۔ نیا دور کے مدیر امیر احمد صدیقی نے فراق نمبر حصہ دوم شائع کرنے کا مقصد پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ فراق پر ان کی موت کے بعد لگائے گئے ادبی الزامات کے حوالے سے گفتگو کی ہے کہ یہ باتیں فراق کی حیات میں کیوں نہیں سامنے آئیں۔ فراق تو آخری سفر پر روانہ ہو چکے اگر یہ باتیں ان کی زندگی میں سامنے آتیں تو ان کی وضاحت ہو جاتی۔ ملاحظہ ہو اداریے کا یہ اقتباس:

> ''آج جب غیر معمولی تاخیر کے بعد فراق جیسی بھاری بھرکم اور جید ادبی شخصیت کا آئینہ بنا کر یہ دوسرا حصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تو میرا دل یقین واعتماد کے اس احساس سے روشن ہے کہ فراق پر کام کرنے والوں کو اس نمبر کی شکل میں ایک ایسی مکمل ادبی دستاویز مہیا ہو جائے گی جو فراقیات کے ضمن میں خضر راہ کا کام دے گی۔ نقش اول سے نقش ثانی بہتر ہوتا ہے اس مقولے میں کہاں تک صداقت ہے اس کا فیصلہ تو ارباب نظر اس دوسرے حصے کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن میرا یقین کامل ہے کہ مواد کے اعتبار سے دوسرا حصہ پہلے حصے سے قدرے بہتر ہے۔
>
> اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ایک احساس کا ذکر کرتا چلوں کہ جو ادبی الزامات فراق صاحب پر ان کے انتقال کے بعد لگائے گئے وہ اگر ان کی زندگی ہی میں ظاہر کر دیے جاتے تو بہت سی باتوں کی وضاحت ہو جاتی اور بہت سے حقائق ہمارے سامنے آجاتے۔'' (43)

رسالہ نیا دور کے مئی 1985 کے شمارے میں گورنر اتر پردیش جناب عثمان عارف کی ادبی وسیاسی خدمات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مدیر نیا دور امیر احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ عثمان صاحب

نہ صرف ایک سیاسی رہنما کے طور پر عوام کی خدمت کررہے ہیں بلکہ وہ ایک ادبی شہسوار کے طور پر بھی ادب کے میدان میں اپنی اہمیت وصلاحیت منوا چکے ہیں۔ انھوں نے ماہنامہ شعلہ وشبنم کے جوائنٹ ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ان کی اہم تخلیقات میں 'عقیدت کے پھول' (نعتیہ مجموعہ) 'قلم کی کاشت' (غزلیں) 'نورزندگی' (رباعیات) 'فکرواحساس' (نظمیں) 'ذکرمحبوب' (چشتیہ سلسلے کے بزرگ پیر محبوب بخش کے حالات زندگی) وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جناب عثمان عارف کے اتر پردیش کے گورنر بننے پر مبارکباد پیش کی گئی ہے:

''8جون 1980 سے 14جنوری 1982 تک آپ مرکزی حکومت میں تعمیرات و مکانات کے نائب وزیر اور 15جنوری 1982 سے 14فروری 1983 تک زراعت وشہری رسد کے نائب وزیر رہے۔ 15فروری1983 سے 31دسمبر1984 تک آپ دوبارہ تعمیرات ومکانات کے نائب وزیر رہے۔مختلف موقعوں پر آپ متعدد غیر ملکی دوروں پر بھی گئے۔تصوف،قومی یکجہتی، ہندستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب، پسماندہ طبقوں، اقوام وقبائل مندرجہ فہرست اور دیہات کے لوگوں کی ترقی، مطالعہ اورشعر گوئی آپ کی خصوصی دلچسپی کے موضوعات ہیں۔آپ انتہائی نرم مزاج شیریں سخن،خوش اخلاق اورملنسار شخصیت کے مالک ہیں۔گورنر اتر پردیش کے عہدہ جلیلہ پر ہم ادارہ نیادور کی جانب سے آپ کا استقبال کرتے ہیں اورآپ کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔''(44)

اسی شمارے میں ماہنامہ شمع کے مدیر اعلیٰ جناب یوسف دہلوی کی رحلت پر بھی غم وافسوس کااظہار کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں مختصر تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ جناب یوسف دہلوی کے انتقال کو بڑا سانحہ قرار دیتے ہوئے مدیر نیا دور امیراحمد صدیقی نے ادارہ نیادور کی جانب سے ان کے پسماندگان سے گہری ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

نیادور کا جنوری فروری اور مارچ 1986 کاشمارہ مشترکہ تھا۔ اس شمارے کے اداریے

اپنی بات میں مدیر امیر احمد صدیقی نے حکومت کے بیس نکاتی پروگرام کی تعریف کی ہے اور ریاست اتر پردیش کی حصولیابیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ پورا اداریہ سرکاری اسکیموں اور سرکاری پروگراموں کی کارگزاری پر مبنی ہے۔ اداریے کے آخر میں نیادور کی اشاعت میں ہوئی تاخیر کے لیے معذرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

نیادور کے جنوری تا مارچ 1986 مشترکہ شمارے کے بعد اپریل تا نومبر 1986 کا بھی مشترکہ شمارہ شائع ہوا تھا۔ اداریے میں بیس نکاتی پروگرام کی کامیابی اور شری ویر بہادر سنگھ کے ذریعے ریاست کے لیے کیے گئے کاموں کی ستائش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی سرکار کے ذریعے عوام کے لیے کیے جارہے کاموں کا ایک لائحہ عمل بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نیادور کی اشاعت میں ہوئی تاخیر اور مشترکہ شماروں کے لیے افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ نیادور نے جب بھی مشترکہ شمارہ شائع کیا ہے تو اس کے صفحات زیادہ کردیے ہیں تاکہ قارئین کو ادبی تشنگی کا احساس کم ہو اور انھیں زیادہ سے زیادہ ادبی مضامین و نگارشات مل سکیں۔

نیادور کے جون 1990 کے شمارے میں وزیر اعظم ہندوشو ناتھ پرتاپ سنگھ کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے ملک کے نظام تعلیم پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ وزیر اعظم نے دہلی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ ملک میں صرف ڈگری یافتہ لوگوں میں اضافہ ہو رہا ہے جنھیں ہم تعلیم یافتہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ اداریہ اس وقت کے تعلیمی نظام کے تعلق سے بہت صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بس ہمیں کسی امتحان میں کامیابی مل گئی اور ہم تعلیم یافتہ بن گئے۔ تعلیم کا مقصد و مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے طرز زندگی، اپنے اخلاق و آداب، اپنی تہذیب و تمدن میں کس حد تک تبدیلی پیدا کی ہے اور ہم نے تعلیم سے کیا سیکھا۔ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اپنا سماجی و معاشی معیار بہتر کرسکیں۔ اپنے اخلاق و اطوار درست کریں۔ تعلیم کا مقصد صرف پیسہ کمانا یا نوکری کرنا نہیں ہے۔ نیادور کے ایکٹنگ ایڈیٹر شاہنواز قریشی نے بہت ہی موثر انداز میں لکھا ہے:

’’حصول آزادی کے بعد گزشتہ 42 برسوں کے دوران نظام تعلیم پر وہ توجہ

> نہیں دی گئی جس کی ضرورت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم محض حرف شناسی تک محدود ہوکر رہ گئی۔ ذہنی اورفکری انقلاب لانے کا وسیلہ نہ بن سکی اورایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی جانا فیشن ہوگیا اور پڑھانا محض پروفیشن بن کر رہ گیا۔تعلیم سے کوئی آدرش اورآئیڈیل وابستہ نہیں ہوسکا۔ بس کسی طرح رٹ رٹا کر یانقل کرکے امتحان پاس کرلو جس سے ڈگری مل جائے۔ اس کے بعد پھر دفتری ملازمت یعنی کلرکی کو مقدر سمجھ لو۔ مختصر یہ کہ اس تعلیم اور اس ڈگری نے محض بابو پیدا کیے نتیجہ یہ ہوا کہ ہم فکرونظر کی دولت سے محروم ہی رہے۔‘‘(45)

ماہنامہ نیا دور نے مارچ اپریل مئی 1995 کا شمارہ مشترکہ شائع کیا تھا۔ یہ شمارہ نصف صدی نمبر تھا، جس میں گزشتہ نصف صدی کے ادبی منظر نامے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ایڈیٹر سید امجد حسین نے نیادور کے 50سال پورے ہونے پر یہ ضخیم نمبر پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس وقت نیا دور شروع ہوا تھا وہ ترقی پسندی کا دور تھا بعد میں جدیدیت کا رجحان ادب میں درآیا۔ ان سب اثرات ورجحانات کے ساتھ ساتھ نیادور ادب کی خدمت کرتا رہا ہے اور اب جبکہ اس کے 50سال پورے ہوگئے ہیں تو نیادور نصف صدی نمبر کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے جس میں گزشتہ پچاس برس کے ادب کی ہر جہت کو پیش کیا جارہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ’’چاہے وہ کوئی دور ہو، نصف صدی قبل جب بڑے زور وشور سے ترقی پسندی تحریک، جہد آزادی کے مطالبے کو لے کر آگے بڑھی تھی تو اس وقت بھی اور پھر چھٹی، ساتویں دہائی میں سارترا کے اثرات کے تحت جدیدیت کا رجحان بھی انسانی حقوق کی آواز بلند کرتا رہا اور اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی سمت سے بھی ہوائیں چلیں کسی رنگ کا پھول کھلے، کسی طرح کا موسم ہو، وہی تہذیب وتمدن وادب زندہ اور باقی رہتا ہے جو انسانی حقوق کا علمبردار ہوتا ہے پریم چند کے لفظوں میں...

وہی ادب کسوٹی پر کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، جو ہمیں جگائے، سلائے نہیں، پریم چند کی اس تعریف پر اردو ادب ہمیشہ کھرا اترا اور گزشتہ پچاس برس کی سماجی، سیاسی اور فکری تاریخ ہماری ادبی تخلیقات کے ذریعہ مرتب کی جاسکتی ہے۔ نیادور نے بھی اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کیے اوران پچاس برسوں میں ادب کی ہرجہت کو نصف صدی نمبر کے ذریعہ آپ کی خدمت میں پیش کیاجارہا ہے۔'' (46)

نیادور حکومت اتر پردیش کا ترجمان رسالہ ہوتے ہوئے بھی ادب کی خدمت کرنے میں آگے رہا ہے۔ حکومت کا رسالہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ اسکیموں، پروگراموں اور ترقیاتی کاموں کا بیان کرنا بھی ضروری ہوجاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ادبی تخلیقات بھی کافی معیاری رہی ہیں اوراس کے اداریے اس معاملے میں قابل ذکر ہیں کہ ایک عام ادبی قاری بھی ان اداریوں کے ذریعے حکومت کی حصولیابیوں، کاموں اورضروری معلومات سے آشنا ہوتا رہتا ہے جو کہ ادب اور سماج کے رشتے کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ادب سماج سے الگ کوئی شے نہیں ہے۔ادب اورسماج کا بندھن اٹوٹ ہے۔ سماج ہی وہ آئینہ اور میدان ہے جہاں ادب تخلیق ہوتا ہے۔ نیا دور نے ادب اورسماج، معاشیات، سیاست سبھی نظام کے درمیان ایک رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپسی بھائی چارہ، قومی ہم آہنگی و یک جہتی، اتحاد واخوت کوفروغ دینے میں اس رسالے کی خدمات سے انکار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔

سید وضاحت حسین رضوی کے ذریعے نیادور کی ادارتی ذمے داریاں قبول کرنے کے بعد نیادور نے اور زیادہ ترقی کی۔ وضاحت حسین خود بھی خالصتاً ادب کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے اردو ادب و زبان اور تحقیق وتنقید میں اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔ نیا دور کو وضاحت حسین کا ساتھ ملنے کے بعد ایک نئی سمت ورفتار مل گئی۔ انھوں نے نیادور کو ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک دستاویز کی شکل دے دی ہے اور اردو کی سچی خدمت کا بیڑا اٹھاتے ہوئے، مولانا محمد علی جوہر نمبر فروری تا اپریل 2005، علی جواد زیدی نمبر نومبر، دسمبر 2005،

ڈائمنڈ جوبلی نمبر جون، جولائی، اگست 2006، انقلاب 1857 نمبر اپریل، مئی 2007، قرۃ العین حیدر نمبر، فروری مارچ 2009، شکیل بدایونی نمبر، ستمبر اکتوبر 2009، میر تقی میر نمبر مئی جون 2010 ایسے اہم اور تاریخ ساز نمبر ہیں، جو ان کی ادارتی کارگزاریوں کا ثبوت ہیں۔

ماہنامہ نیادور نے فروری مارچ اپریل 2005 مولانا محمد علی جوہر نمبر شائع کیا تھا۔ یہ تاریخی ودستاویزی نمبر اپنے آپ میں بے مثال تھا۔ جس میں مولانا محمد علی جوہر کی حیات وخدمات کا پوری طرح احاطہ کیا گیا ہے ان کی شخصیت، ان کی صحافت اورادبی خدمات کے علاوہ ان کی شعری تخلیقات بھی پیش کی گئی ہیں۔

وضاحت حسین رضوی شکیل بدایونی نمبر ستمبر اکتوبر 2009 کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''چنانچہ اس بار ایک ایسی شخصیت کو منتخب کیا گیا ہے جس نے سب سے پہلے وقت کی چاپ سن لی تھی اور یہ محسوس کرلیا تھا کہ فلموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ساتھ ہی فلمی دنیا کو بھی یہ احساس دلادیا تھا کہ ادب شاعری خصوصاً اردو ادب اور شاعری سے دامن بچا کے فلمیں مقبولیت حاصل نہیں کرسکتی وہ کوئی بھی فلم ہو عرف عام میں اگر (ہٹ) مقبول ہوئی تو اس کی کامیابی میں اس کے نغمات ومکالمے کو دخل رہا ہے۔

اس لیے یہ خاص نمبر ان کے نام معنون ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شخصیت کے جتنے گوشے ہوسکتے ہیں ان سب کی نشاندہی کی جائے۔ وہ مذہبی آدمی تھے کسی حد تک روایتی مذہب پرست تھے ان کی نعت ان کے سلام بھی اپنی جگہ اہم ہیں...

یہ خصوصی نمبر ان کی خدمات کو خراج عقیدت ہے۔ (47)

نیادور کے موجودہ مدیر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے اپنے تحقیقی تجربوں کی بنا پر نیادور کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ نیادور کے لیے ان کی خدمات قابل تعریف ہیں معروف صحافی عابد سہیل لکھتے ہیں:

یہ رضوی صاحب کا ہی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی کوششوں سے

وزیر پارلیمانی امور محمد اعظم خاں کے ذریعے نیادور کے صفحات 32 سے 48 کرالیے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک تحریک چلا کر خریداروں کی تعداد میں اضافہ کیا۔"(48)

میں نے بھی وضاحت حسین سے نیادور کے سلسلے میں کئی ملاقاتیں کیں اور انھیں نہایت شفیق، ہمدرد اور ادب کا ایک سچا سپاہی پایا۔ میرے انتظار میں وہ شام کے 7 بجے تک دفتر میں بیٹھے رہے جبکہ دفتر کا وقت پانچ بجے تک ختم ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مجھے نیادور کے کئی خصوصی نمبر دیے اور نیادور کے حوالے سے اہم جانکاریاں بھی فراہم کیں۔

المختصر نیادور ان کی ادارت میں ادب اور صحافت کے طویل سفر پر نہایت کامیابی سے گامزن ہے اور اس جریدے نے ادبی صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

کتاب نما: اردو زبان میں یوں تو بڑی تعداد میں رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ادبی رسائل کی بھی لمبی فہرست ہے، جو ملک کے گوشے گوشے سے شائع ہوتے آ رہے ہیں۔ دہلی سے نکلنے والا ماہنامہ کتاب نما اس معاملے میں سب سے منفرد اور ممتاز ہے کہ جیبی سائز کا ہونے کے باوجود اس میں اعلیٰ پائے کی شگفتہ تحریریں شائع ہوتی ہیں یہ رسالہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے شائع ہوتا ہے اور پچھلے (50) برسوں سے ادب کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ یہ ہندستان کا پہلا رسالہ ہے جس میں مہمان مدیر کا کالم شروع کیا گیا اور ادب میں یہ نیا پن یقیناً کامیاب ہوا اور مہمان اداریے نے کتاب نما کی ترقی کو دوام بخشا۔ مہمان اداریے کے تحت کسی اچھے تنقید نگار، افسانہ نگار، شاعر یا قلمکار کے ذریعے اداریہ لکھوایا جاتا ہے۔ تین سال قبل مکتبہ جامعہ سے سبکدوش ہونے والے اس کے مدیر جناب شاہد علی خاں نے بھی اس سلسلے میں بتایا کہ مہمان اداریے نے کتاب نما کو دوسرے تمام اردو رسائل میں ممتاز و منفرد بنادیا۔ گزشتہ تقریباً 22 تا 23 برسوں سے مہمان اداریہ شائع ہوتا رہا ہے۔ جناب شاہد علی خاں نے ایک طویل عرصے تک اس رسالے کی ادارتی ذمے داریاں نبھائیں۔ اس طویل عرصے میں اس کالم کے تحت مختلف مشہور ادبا و شعرا کی اعلیٰ پائے کی تنقیدی و تحقیقی تحریریں کتاب نما کے صفحات پر جلوہ گر ہوئیں۔ ان تحریروں میں اردو کی تعلیم و ترقی۔ افسانوں کی موجود

صورتِ حال جدید تنقیدی رویہ، تحقیق و تنقید موجودہ دور میں، اردو شاعری اور موجودہ منظرنامہ، اردو اخبارات و رسائل جیسے موضوعات پر بڑی تعداد میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تمام اداریوں کا تجزیہ کرنا کافی وقت طلب اور دشوار ہے لہٰذا یہاں کچھ اداریوں کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب نما کے فروری 1982 کے شمارے میں حکومت اترپردیش کے ذریعے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے اعلان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کچھ اداریوں میں کسی خاص اوراہم ادبی شخصیت کی وفات پرخراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔کبھی کبھی اردو کی بے سروسامانی اورخراب صورتِ حال بھی اداریے کا موضوع بنی ہے۔ دسمبر 1982 میں آل احمد سرور نے اردو زبان اور اردو کے ادیب کے عنوان پر اداریہ تحریر کیا ہے۔ اس اداریہ میں جناب سرور صاحب نے اردو زبان کو جدید آریائی زبان بتایا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی موجودہ صورتِ حال کے تئیں تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔حکومت کی نااہلی اوراردو کے لیے سرد رویّے کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ اردوزبان میں اعلیٰ تعلیم اور ملک کے اسکولوں سے اردو ہٹادینے کے لیے حکومت کو ذمے دارٹھہرایا گیا ہے۔ اس اداریے کا دوسرا اور آخری حصہ جنوری 1988 میں شائع ہوا تھا۔ جناب سرور صاحب نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں اور ناقدین کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ ہمیں اردو کی تعمیر وترقی میں آگے آنا چاہیے اورہمیں اردو کی تہذیب کی صحیح بازیافت کے لیے دوسری قوموں کی تہذیب کا بھی بہ نظرغور مطالعہ کرنا چاہیے اور خاص طور سے ایشیا کی تمام تہذیبوں کا ہمیں علم ہونا ضروری ہے۔تبھی ہم اردو کی ابتدا وارتقا کا صحیح اور بہتر نظریہ قائم کرسکتے ہیں۔ہمیں اردو کے ساتھ ساتھ اس سے ملتی جلتی زبانوں کی جانکاری حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اکادمیوں کو ایک دوسرے کے درمیان اختلافات کوختم کرکے اتحاد قائم کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ تمام قلم کاروں اور ادبا کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اتحاد واتفاق کے ساتھ اردو کی خدمت کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔

فروری 1988 میں علی سردار جعفری نے بطور مہمان مدیر اداریہ تحریر کیا ہے۔ ان کے

اداریے کا عنوان ہے۔ دیکھ تو کیا منزل طوفاں سے اٹھی ہے حیات۔ علی سردار جعفری نے اپنے اداریے میں مسلمانوں کی تہذیب وثقافت اور ہندوستان میں ان کے تہذیبی ارتقا کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی اردو کا دوسری زبانوں سے رشتہ ہونے پر بھی زور دیا ہے۔ جناب جعفری صاحب نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردوزبان کی شروعات ہندوستان میں ہی ہوئی ہے اور یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اردو باہر سے آئی تھی۔ انھوں نے اقبال کی شاعری پر بڑے اچھے انداز میں اظہار خیال کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اقبال نے برہمن کے گھر میں پیدا ہونے کے باوجود ایک عالم و روایتی مسلمان سے بہت زیادہ آگے بڑھ کر اسلام کو سمجھا اور اسلامی تربیت وپرورش حاصل کی اور شاعر مشرق کا خطاب حاصل کیا۔ علی سردار جعفری کا یہ تحقیقی مضمون کتاب نما میں سلسلہ وار تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ کتاب نما کے کچھ اہم اداریوں کے عنوانات اس طرح ہیں۔

مجھے کن لوگوں سے چڑھ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ ستمبر 1988

عوامی ادب کے مسائل اور اردو کی ادبی روایت۔ شمیم حنفی۔ جنوری 1989

افسانہ نگاری اور قاری۔ وارث علوی۔ فروری 1989

اردو کا تعلیمی محاذ۔ محمود الٰہی جولائی 1989

اردو ذریعہ تعلیم۔ محمد حسن فاروقی۔ اپریل 2000

اردو شاعرات۔ رویے اور مسائل۔ شگفتہ طلعت سیما۔ ستمبر 2002

کیا صحافت ادب کا حصہ نہیں۔ ڈاکٹر مہتاب امروہوی۔ جولائی 2006

بچوں کا اردو سائنسی ادب کس طرح لکھیں۔ محمد خلیل۔ اکتوبر 2006

مہمان مدیر کے ذریعے تحریر کیے گئے اداریہ اردو ادب کے بہترین اوراعلیٰ درجے کے شہ پاروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ ان اداریوں میں اردو کی تعمیر وترقی پر بڑے سنجیدہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے اور اصلاحی انداز میں نصیحت کی گئی ہے۔ اردو کی صورتِ حال اور اس کا استحصال کرنے والوں کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''مجھے ایسے لوگوں سے ہمیشہ چڑھ رہی ہے کہ جو لوگ اردو نواز اور اردو

دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اردو کو کوئی کیا نواز سکتا ہے۔ ارے
اردو تو خود ان کو نوازتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی کہ اگر ہم صحیح اردو لکھ
سکیں ورنہ اچھی زبان لکھنے والے کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے۔''(49)

معروف ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی مذکورہ بالا باتیں یقیناً ان کے دل کی آواز ہے اور اسے پڑھ کر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے آج اردو کے نام پر کس قدر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے اور ہم بجائے کچھ کرنے کے ہائے ہائے کرتے ہوئے سر پیٹ رہے ہیں۔ کتاب نما کے اداریے اردو زبان وادب میں قیمتی شہ پاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان اداریوں میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے اور ان اداریوں سے اردو زبان وادب کو کافی فائدہ ہوا ہے۔ڈاکٹر شعیب رضا وارثی لکھتے ہیں کہ کتاب نما کے ان اداریوں سے اردوزبان وادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے:

''ان اداریوں میں بعض بالکل نئی بحثیں بھی چھیڑی گئی ہیں جو کہ واقعی اردو
کے قارئین اورخاص طور پر محققین وناقدین کے لیے غور وفکر اور تلاش وتحقیق
کی نئی راہیں کھولتی ہیں۔شمیم حنفی کا اداریہ عوامی ادب کے مسائل اور اردو
کی ادبی روایت ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان اداریوں کی روشنی میں
یہ بات بلا جھجک کہی جاسکتی ہے کہ کتاب نما نے مہمان مدیر کا سلسلہ شروع
کرکے اپنے اداریوں کی شکل میں اردو ادب وتنقید کو گراں قدر سرمایہ عطا
کیا ہے۔''(50)

کتاب نما کے اپریل 2006 کے شمارے میں محمد حسن فاروقی نے ''اردو ذریعہ تعلیم اساتذہ اور والدین کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا ہے۔ اداریے میں انھوں نے اردو ذریعہ تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم پر اظہار خیال کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمیں انگریزی زبان پر بھی دھیان دینا ضروری ہے کیونکہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ آج انگریزی ذریعہ تعلیم کی اہمیت اور اس کے بہتر معیار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔معلم اور اساتذہ کو یہ

یقینی بنانا ہوگا کہ وہ اپنی ذمے داریاں سنجیدگی سے اور بہتر ڈھنگ سے انجام دے رہے ہیں۔ معلم کے ساتھ ساتھ سرپرستوں اور والدین کی بھی یہ ذمے داری بنتی ہے کہ وہ بچوں کے مستقبل کی فکر کریں اور اس سمت میں بہتر سے بہتر کوشش کریں۔ جناب حسن فاروقی لکھتے ہیں:

''اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس میں سرپرستوں یاوالدین کی عدم توجہی کی شکایت بہت عام ہے۔ دراصل اس کی کچھ ذمے داری اسکول اور اساتذہ پربھی عائد ہوتی ہے۔ روایتی طور پر سال میں ایک ایک مرتبہ یوم والدین یا یوم سرپرست منایا جاتا ہے اور تمام سرپرستوں کو اسکول میں جمع کرکے ان کے مسائل سمجھنے کی بجائے صرف ان کے فرائض یاد دلائے جاتے ہیں۔ سبھوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کے اس طریقے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرپرست ذہنی تناؤ اور اداس دل کے ساتھ گھروں کو لوٹتے ہیں۔ صرف خانہ پری کے لیے لی گئی ایسی میٹنگیں مسائل کو حل نہیں کرتیں بلکہ سرپرستوں اور اسکول میں دوری پیدا کرتی ہیں۔ سرپرستوں کو مختلف گروپ میں تقسیم کرنا چاہیے۔ اعلیٰ متوسط طبقہ، متوسط طبقہ اور غریب طبقہ۔ یا اعلیٰ تعلیم یافتہ، تعلیم یافتہ یا تعلیم یافتہ گروپ یا دیہی اورشہری والدین کے گروپ۔ اس طرح گروپ بنانے کی کچھ اور بھی بنیادیں ہوسکتی ہیں لیکن سرپرستوں کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ یہ طریقہ صرف مشترکہ مسائل کو یکجا کرنے کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد طبقاتی تفریق پیدا کرنا یا کسی کو ذلیل کرنا نہیں ہے۔ ان مختلف گروپوں کی علاحدہ علاحدہ بار بار میٹنگیں ہونی چاہئیں۔ ایسا طریقہ اختیار کرنے سے سرپرستوں میں اعتماد پیدا ہوگا۔ مسائل کے حل کرنے میں آسانی ہوگی اور ان کی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق اسکولوں کی ترقی اور فلاح کے لیے تعاون بھی حاصل ہوتا رہے گا۔ سرپرستوں کو بھی کچھ ذمے داریاں سنبھالنی ہیں۔ سب سے پہلے تو انھیں

> اس غلط خیال کو دل سے نکال دینا ہے کہ ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت کی ساری ذمے داری اسکول اور اساتذہ کی ہے۔ ان کا سب سے پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بہتر سے بہتر اسکول میں داخل کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرے یہ کہ تعلیمی سال کی ابتدا ہی میں بچوں کو تمام لوازمات تعلیم سے لیس کردیں۔ اگر اساتذہ اور والدین ایک دوسرے کی خامیوں پر نظر رکھنے اور نکتہ چینیاں کرنے کی بجائے باہمی تعاون اور اشتراک عمل کی فضا پیدا کریں تو معیار تعلیم کا گراف بڑی تیزی سے اونچا کیا جا سکتا ہے۔(51)

مذکورہ بالا اداریے میں محمد حسن فاروقی نے جو مشورے اور گراں قدر باتیں کی ہیں یقیناً آج کے زمانے میں بھی ان کی اشد ضرورت ہے۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمیں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی معیار تعلیم اور نظام کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اساتذہ اور سرپرستوں کو بھی اس سمت میں دھیان دینے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی سرپرست اپنے بچے کو اسکول بھیج کر اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتا یا کوئی بھی استاد بچے کو ایسے ہی کلاس ورک کرا کے یہ نہیں سوچ سکتا کہ اس نے اپنا فرض پورا کردیا ہے۔ استاد ہو یا سرپرست دونوں کی ذمے داری ہے کہ وہ اس بات کو ضروری اور یقینی بنائیں کہ ان کا بچہ کس حد تک پڑھ رہا ہے۔ اس نے اپنی تعلیم میں کتنی ترقی کی ہے اور فی الحال وہ کس مقام پر ہے۔ بچے کی تعلیم وتربیت میں کون سے پہلو کمزور ہیں ان تمام باتوں پر اگر صحیح ڈھنگ سے دھیان دیا جائے اور استاد و سرپرست دونوں ہی بچے کے لیے سنجیدگی سے کوشش کریں تو اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھنے والے بچے بھی یقیناً دوسری زبانوں کے ذریعہ تعلیم کے بچوں سے کسی طرح بھی کمزور نہیں رہیں گے۔

کتاب نما کے ستمبر 2002 کے شمارے میں اثبات ونفی کی مدیرہ محترمہ شگفتہ طلعت سیما کا مہمان اداریہ اردو شاعرات، رویے اور مسائل کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس اداریے میں انھوں نے اردو شاعرات کے مسائل اور ان کے رویے پر گفتگو کی ہے شگفتہ طلعت سیما صاحبہ نے شاعرات کے خصوصی حوالے سے بات کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ قاری کو شاعرہ کی

تخلیق کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ وہ ایک عورت کی نظر سے دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ نسائی جذبات کی حامل شاعرات کی تخلیقات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اس موضوع پر پاکستان میں زیادہ بہتر طریقے سے شاعری کی گئی ہے اور ہمارا پڑوسی ملک اس معاملے میں ہم سے کہیں آگے ہے وہ لکھتی ہیں:

> ''سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کو اچھی خاصی آزادی ملنے کے باجود نسائی لب ولہجے کی پاسداری ممکن نہ ہوسکی۔ جب کہ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ وہاں شاعرات کے قلم سے جذبات اور محسوسات کے جو پیانے سامنے آئے ہیں، انھوں نے ہمیں ایک انوکھی دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ وہ دنیا جس سے ہم ظاہری طور پر واقف تو تھے۔ لیکن باطنی طور پر اس کے مختلف اسرارونکات کا ہمیں کوئی علم نہیں تھا۔ یہ ایک بڑی کمی تھی جسے پاکستانی شاعرات نے پورا کرنے میں ہر ممکن تعاون دیا ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر ہمیں قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ ایک لڑکی، ایک عورت ہمیں اپنا ہمدرد تصور کرتے ہوئے اپنے دردوکرب کی مختلف منزلوں میں ہمیں ساتھ لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ پاکستانی شاعرات کے فن پاروں میں ایک لڑکی اور عورت کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔'' (52)

ماہنامہ کتاب نما کے جولائی 2006 کے شمارے میں ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے ''کیا صحافت ادب کا حصہ نہیں'' کے عنوان سے مہمان اداریہ تحریر کیا ہے۔ اداریے میں انھوں نے اردوصحافت اوراردوادب کے درمیان رشتے کوواضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکھاہے کہ اردوادب اور صحافت میں کافی قریبی رشتہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج اردو صحافت کے تعلق سے تحقیق کا کام نہیں کے برابر ہورہاہے۔ اردوکالم نگاری، خاکہ نگاری، اخباری انٹرویووغیرہ پراردومیں کم موادموجودہیں۔ کالم نگاری کی وجہ سے ہی آج اردو اخبارات اوراخباری شعبے زندہ ہیں۔ اردو کے ادبی صحافیوں نے انٹرویوز،انشائیوں اوراپنی

بہترین کالم نگاری سے اردوصحافت کوکافی توانائی بخشی ہے۔ادبی صحافت کے ہی پیروں پر کھڑی ہو کرعام اخباری صحافت آج قدم آگے بڑھا رہی ہے۔ ڈاکٹر مہتاب امروہوی رقم طراز ہیں:

'' اردوکالم نگاری صحافت کی دنیامیں ایک انقلابی تبدیلی کا باعث بنی اور اس نے کچھ اپنی روشن روایات قائم کیں۔ اردوکالم نو یسوں نے اپنے فکاہیہ کالموں سے اخباروں اوررسالوں کونہ صرف ادبی وقار عطا کیا بلکہ ان کونئی دلکشی اور دلچسپی سے بھی روشناس کرایا۔

مندرجہ بالا بحث کے تناظر میں ہم بہ بانگ دہل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردوادب کے فروغ میں صحافت کا بہت بڑا ہاتھ رہاہے۔لیکن صحافت کی اصناف کو وہ مقبولیت میسر نہ آسکی جس کی وہ مستحق ہے۔ اب یہ ذمے داری ان ادبی صحافیوں کی ہے جواخبار ات کے ذریعہ مقبول اورمشہور ہوئے کہ وہ اس اصناف کے فروغ کے لیے کوشش کریں اورصحافت کواردوادب کا ہی ایک اہم حصہ تصورکرائیں۔''(53)

ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے بڑے اچھے انداز میں اردوصحافت اورادب کے درمیان رشتوں کو واضح کیا ہے اورادب میں صحافت کی شمولیت پرزوردیاہے۔ اگر ہم اردو کی تاریخ پرنظرڈالیں توہمیں اندازہ ہوگا کہ صحافت اورادب کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں رہے ہیں۔ادب نے صحافت کے دامن میں پناہ لی ہے اورصحافت نے ہی ادب کوعام انسان تک پہنچایاہے اوراردوایک عوامی زبان کے طور پرسامنے آئی۔ یہ صحافت ہی تھی جس نے مولوی محمد باقر، محمد حسین آزاد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی نولکشور، ظفرعلی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، مولانامحمد علی جوہر اور شاہداحمد دہلوی جیسے اہم اور ادب کے عظیم قلم کاروں کوقلم کے میدان میں اپنالوہا منوانے میں مدددی۔ماہنامہ کتاب نمانے مہمان مدیر کا تجربہ کرکے ایک نئی روش کی شروعات کی اور کتاب نما کے اس قدم سے ایک طرف تو مدیرکے کچھ کاموں میں راحت ہوئی اوردوسری طرف اداریے میں قارئین کو ایک بہترین اور معلوماتی

ادبی شہ پارے کے مطالعے کا موقع نصیب ہوا۔ کتاب نما نے اپنی جو الگ اور منفرد پہچان بنائی ہے وہ اب بھی اس پر قائم ہے۔ آج بھی اس کے اداریے اردو ادب کے گوشوں میں کافی دلچسپی اور ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

شب خون: شمس الرحمٰن فاروقی کے رسالے شب خون میں جدیدیت اور ترقی پسندی کے بعد کے ادب کی باتیں نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رسالہ جدیدیت کے ترجمان کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ اس لیے اس میں جدید ادب اور جدید نثر نگاروں، شاعروں کی نگارشات ہی زیادہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ اداریے میں مغربی ادیبوں کے نثر پاروں سے انتخاب شائع کیا جاتا تھا۔ شب خون ایسا رسالہ تھا جس میں مغربی ادب کی جھلک صاف نظر آجاتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے مغربی ادب کو کافی اہمیت دی ہے اور اپنے رسالے میں بھی مغربی ادب کو خاطر خواہ جگہ دی ہے۔

ان مختصر ادارتی اقتباسات کے کچھ عنوانات اس طرح ہیں۔

''اچھی شاعری وقبولیت کا تاج۔ جارج آرویل۔ جنوری فروری 1974

ناول کی صورتِ حال۔ برنارڈ برگوتری مارچ اپریل 1974

جدیدیت کی فکری اساس۔ ال مین اور فیڈلسن، اکتوبر نومبر 1974

خالص ناول کا نظریہ۔ آندرے ژید، اگست ستمبر 1976

سرریلزم کیا ہے؟ آندرے بریتوں۔ اکتوبر نومبر 1976

ادب اور فحاشی، جارج اسٹینر۔ مارچ اپریل 1977

نثر نگار کے لیے ہدایات۔ جارج آرویل۔ مئی جون جولائی 1977

شاعر ارادہ اور مراد، ومزٹ اور بیرڈسلی، اگست ستمبر اکتوبر 1977

یہ موضوعات یوں تو مغربی ادب سے مستعار لیے گئے ہیں لیکن اردو ادب میں بھی ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جارج آرویل کا ایک اقتباس اچھی شاعری اور قبولیت کے تاج کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں جارج آرویل نے اچھی شاعری کے مقبول عام ہونے کی وجوہات بتائی ہیں اور لکھا ہے کہ ہم جس عہد میں سانس لے رہے

ہیں اس میں اچھی شاعری چند مخصوص لوگوں کا طرز فکر اور یقین ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ ناول کی صورتِ حال پر برنارڈ برگوشری نے لکھا ہے کہ ناول نگار کے ناقدین بھلے ہی یہ کہہ دیں کہ اچھے ناولوں کا خاتمہ ہوگیا ہے لیکن پھر بھی ناول میں نئے پن اور تازگی کی تلاش باقی ہے۔ ناول کی ہیئت میں تبدیلی ضروری ہے اور تبھی اچھے ناول وجود میں آسکیں گے۔ شب خون پر بھلے ہی جدیدیت کا الزام عائد کیا جاتا رہا ہو لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے اس میں ترقی پسند ادیبوں اور ان کی اشاعت کو بھی کافی جگہ دی ہے۔ کارل مارکس جیسے ترقی پسند ادیب اور مفکر کی تحریروں کو بھی انھوں نے اپنے ادارتی اقتباس میں جگہ دے کر یہ ثابت کردیا ہے کہ شب خون کی اعلیٰ اور معیاری تحریریں کسی خاص تحریک یا مہم سے مبرا ہیں۔ شب خون جس وقت جاری ہوا تھا اس دور کے آس پاس مغرب میں فحش ادب کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ لوگ غلامی اور قید سے چھٹکارا پاکر ذہنی آسودگی حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے ادب کا سہارا لینے لگے تھے لیکن حقیقتاً یہ ادب انسان کے لیے نقصان دہ تھا۔ اس طرح کے ادب اور فحش نگاری پر جارج اسٹینر کا یہ اقتباس مارچ اپریل 1977 کے شمارے میں شائع کیا گیا تھا:

> ''اس زمانے کے فحش نگار ہماری یہ آخری اور سب سے زیادہ ضروری پرائیویسی کو درہم برہم کردیتے ہیں وہ ہمارے تخیلاتی تفاعل کو خود ہی انجام دینے لگے ہیں۔ وہ ان الفاظ کو ہم سے چھین لے جاتے ہیں جو ہماری راتوں کی ملکیت ہیں اور انھیں اپنی فراز بام سے پکار پکار کرلوگوں کو سناتے ہیں انھیں کھوکھلا کردیتے ہیں۔ اس طرح ادب کی آزادی اور ہمارے سماج کی داخلی آزادی کو نیا خطرہ Censorship یا اظہار کی تنگی نہیں ہے۔ (یہ خطرے تو پرانے ہیں) خطرہ اس میں ہے کہ فحش نگار اپنے پڑھنے والوں، اپنے کرداروں اورزبان تینوں کے ساتھ ایک نہایت لاپرواہ قسم کی حقارت کا اظہار کرتا ہے کیوں کہ وہ ہمارے خفیہ خوابوں کو تھوک کے بھاؤ بیچتا ہے۔ یہ کتابیں انسان کو کم آزاد اور کم منفرد بنادیتی ہیں۔ یہ زبان کو مفلس تر

کردیتی ہیں کیونکہ ان کے ذریعہ امتیاز اور جذباتی تحرک کی تازگی کی صلاحیت زبان کم ہوجاتی ہے۔ یہ کتابیں نئی طرح کی آزادی نہیں بلکہ غلامی کی علمبردار ہیں۔'' (54)

مغربی ادب کے ان اقتباس میں ناول کے مسائل، نئی شاعری کی صورتِ حال، ادب اورادیب کے رشتوں، دوسرے فنون لطیفہ جیسے آرٹ اور فنکاری، لوک گیتوں جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔تقریباً سارے موضوعات ہی ایسے ہیں جو اردوزبان وادب کی صورتِ حال سے پوری طرح مربوط ومبسوط نظرآتے ہیں۔ ان اقتباسات کو علاحدہ طور پر اگر کتابی سائز میں شائع کردیا جائے تو یہ اپنے آپ میں منفرد اور لاجواب انتخاب ہوگا۔ ان میں ایسے ایسے معاملات ومسائل کو موضوع سخن بنایا گیا ہے جو اس سے قبل کہیں نظرنہیں آتے ہیں۔ مثلا سائنس اورشاعری کوموضوع بناتے ہوئے ایف ایل لیوس کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''انیسویں صدی کی سائنس نے سائنسی آلات کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے شاعری کو ٹاٹ باہر کردیا لیکن مجھے لگتا ہے کہ بیسویں صدی کی سائنس دروازہ کھول کر شاعری کا خیرمقدم کرتی ہے۔ سائنس نے جو کچھ شاعری سے لیا تھا اس کی جگہ اسے کچھ دیا بھی ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ قوس قزح کوئی پرواز کرتی ہوئی دیوی نہیں ہے بلکہ روشنی کی لہروں کا کھیل ہے لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر سائنس کہتی ہے کہ لہریں بھی کچھ نہیں محض واہمہ ہیں علامت ہیں اور کچھ ہمارے حسی تاثرات کو بیان کرنے کا طریقہ ہے۔ کلا سیکیت، رومانیت اور واقفیت۔ ایف ایل لیوکس۔'' (55)

شب خون کے ان اقتباسات میں ہمیں موضوعات کا بھی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ تانیثی ادب جیسے موضوعات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ،وضیعات کے دفاع میں مئی جون جولائی 1991، اگست ستمبر اکتوبر 1991۔ نئی تاریخیت یا مارکسی وضیعات نومبر 1991 تا اپریل 1992 ناول کی خصوصیات، بافن کی نظر میں، مئی تا اکتوبر 1992 کثیر الصوت ناول کا

نظریہ۔ میخائل باختن۔ جنوری فروری 1993 دریدا سے بات چیت، مارچ تامئی 1993، تحریری متن، زبانی متن اور بھرتری ہری۔ جولائی 2002، شاعری اور کذب مئی 2002، ولی کی لاش کی بے حرمتی اور مزار کی شہادت، اپریل 2002 وغیرہ قابل ذکر عنوانات ہیں۔ ان اقتباسات میں جہاں اہم مغربی ادیبوں کے شہ پاروں کا بہترین انتخاب پیش کیا گیا ہے وہیں ان کی شعری تخلیقات کے بھی ترجمے شائع کیے گئے ہیں۔

اردو زبان میں شب خون ایسا واحد رسالہ ہے جس نے ادارتی اقتباس میں اس طرح کا تجربہ کیا ہے، اداریہ کسی رسالے یا اخبار کی اپنی پالیسی پر مبنی ہوتا ہے اور اداریے سے اس رسالے یا اخبار کی سمت ورفتار کا اندازہ ہوتا ہے لیکن شب خون میں اداریہ شائع نہ کرکے مغربی ادیبوں کے اقتباسات پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ اداریہ کسی اخبار یا جریدے کے لیے کتنا اہم اور ضروری ہے۔ کچھ اہم ناقدین کا خیال ہے کہ اداریہ کسی اخبار یا رسالے کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک انسان کے لیے سانس لینا، لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے اس معاملے میں روایت سے بغاوت کی ہے اور اداریہ نہ شائع کرتے ہوئے بھی اپنے رسالے کو کامیاب وکامران بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ان کا رسالہ اپنے عہد کا ممتاز اور قابل ذکر رسالہ ہے۔ جدیدیت کی سمت ورخ طے کرنے میں اس رسالے نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس رسالے کی طرز پر ہی بعد میں ذہن جدید، نئی کتاب وغیرہ شروع کیے گئے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ شب خون کے ان ادارتی اقتباسات کو ایک جگہ جمع کرکے انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ یہ اردو ادب کے موجودہ مسائل کو دور کرنے اور اس کی موجودہ ترقی کو نئی رفتار دینے میں معاون ثابت ہوگا۔ شب خون ایسا رسالہ ہے جس نے 40 سال کی عمر پائی لیکن ان چالیس برسوں میں اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کا آخری شمارہ بھی کافی ضخیم اور دستاویزی نوعیت کا ہے۔ اس شمارے کو کافی اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ بھلے ہی آج شب خون شائع نہ ہو رہا ہو لیکن 1966 سے 2005 تک کے شمارے اپنے آپ میں وہ دستاویز ہیں جن میں اردو ادب کی ترقی اور عصری رجحان سے مطابقت کا راز پنہاں ہے۔

ایوان اردو: دہلی اردو اکادمی کی جانب سے شائع کیے جانے والے اس اہم اورمعروف رسالے میں سرکاری پالیسی اورحکومت کے منصوبوں کوملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔حکومت کی اردو کے تئیں کوششوں،مختلف بڑے لیڈروں کی اردو کے لیے خواہشات اوراردو کی صورتِ حال کے تعلق سے اس رسالے کے اداریے میں کافی کچھ شائع کیاجاتاہے۔ اس کے پہلے شمارے مئی 1987 میں حرف آغاز کے عنوان سے تحریر کیے گئے اداریے میں کہا گیا ہے کہ اردو رسائل کے لیے دہلی موزوں جگہ ہے اور یہاں سے قدیم زمانے میں بھی اردو کے اچھے اخبارات ورسائل شائع ہوتے رہے ہیں اورآج بھی شائع ہورہے ہیں۔ ایوان اردو بھی اردو کے فروغ کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ اس رسالے کا مقصد ہے کہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب وتمدن کو ایک نئی سمت عطا کی جائے۔ اس کے علاوہ ایوان اردو کے ذریعے اردو حلقے میں روشن خیالی کوعام کیاجائے گا۔عقل واستدلال کے دائرے میں دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ مدیر نے لکھاہے کہ ہم کوشش کریں گے کہ اردو کے تعلق سے مختلف افراد کے درمیان جو بدگمانیاں ہیں وہ دور ہوسکیں۔

جون 1987 میں حکومت کے ذریعے اردو کی ترقی کے لیے کی گئی کوششوں کا خیرمقدم کیا گیاہے اور حکومت کی پالیسیوں کی ستائش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں آزادی کے بعد اردو کی صورتِ حال پربھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اگست1983 کے اداریے میں اردووالوں کو اپنے تمام کام اردو زبان میں انجام دینے کامشورہ دیا گیا ہے۔ یہ بھی درخواست کی گئی ہے کہ کاروبار کا حساب یا گھر کے لکھنے پڑھنے کے کام کاج سب کچھ اردوزبان میں کیاجائے تب ہی اردو کی ترقی ممکن ہے۔اردو کے یوم اور ہفتے منانے پربھی زوردیا گیا ہے۔

ایوان اردو کے ابتدائی اداریے جناب مخمورسعیدی نے تحریر کیے ہیں۔ زیادہ تر اداریوں میں انھوں نے اردو کی صورتِ حال، اردوزبان میں کام کرنے کامشورہ اورتعلیم کی صورتِ حال، صدرجمہوریہ کی اردو سے متعلق تقریر، قلم کاروں اورشعرا کی وفات، اردو اور ہندی زبانوں کے رشتے، اردو کے لیے تعصب، بہارمیں اردو کو دوسری سرکاری زبان

بنایا جانا، ملک میں مختلف جگہوں پر اردو زبان کا غیر معیاری اور غلط استعمال، خاص نمبرات کا اعلان اور قارئین کے لیے نیک خواہشات وشکریہ جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔

مئی 1990 کے شمارے میں سید شریف الحسن نقوی کے ذریعے حرف آغاز کے تحت لکھے اداریے میں ڈاکٹر امبیڈکر کے تشکیل کردہ ہندوستانی آئین کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جمہوری نظام اور جمہوری اصولوں کو سمجھنا آج بہت ضروری ہے تب ہی ملک کی سالمیت اورامن وسکون کو ہم برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''ایک جمہوری نظام میں شدت، تخریب کاری اور قتل وغارت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں دویادو سے زیادہ گروہ اپنے اختلافات باہمی افہام وتفہیم سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جن امور پر اختلافات دور نہ ہوسکیں ان کے حل کے لیے بھی پرامن ذرائع ہی اختیار کرتے ہیں۔ ہمارا آئین بھی ہمیں یہ سکھاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم اس کے برعکس کوئی طریق کار اختیار کرتے ہیں تو وہ غیر آئینی طریق کار ہوگا۔قومی دستور کا احترام اور اس کی پیروی ہمارا خوشگوار فرض ہے۔ دستور میں ہمیں فکر وعمل کی جو آزادیاں دی گئی ہیں ان کے استعمال سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا اور اگر کوئی روکتا ہے تو ہم اس کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہیں لیکن ان آزادیوں سے تجاوز ہمیں صرف انتشار اور تباہی کے راستوں پر لے جائے گا۔کسی مثبت کامیابی کی طرف نہیں۔'' (56)

جون 1990 کے شمارے میں وزیرخارجہ اندر کمار گجرال کو دفتر اردو اکادمی میں دیے گئے استقبالیہ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس اداریے میں گجرال کمیٹی کی سفارشات اور اس سے اردو زبان وادب کو ہونے والے فائدوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اداریے میں یہ کہا گیا ہے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر اگرعمل درآمد ہوجاتا تو اردو والوں کے بہت سارے مطالبات پورے ہوسکتے تھے۔ ایک قومی زبان جس طرح کی نا انصافیوں کا شکار ہورہی ہے اس کی تلافی کرنا ممکن تھا۔

جولائی 1990 کے اداریے میں اترپردیش کے وزیر اعلیٰ جناب ملائم سنگھ یادو کے ذریعے جنوبی ہندوستان کی ایک زبان کو انگریزی زبان کی جگہ پر استعمال کرنے کے اعلان سے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وزیر اعلیٰ نے جنوبی ہندستان کی کسی زبان کو شمالی ہندستان کے تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کی بات کی ہے لیکن شمالی ہندوستان کی ایک معروف اور رابطے کی زبان اردو کی جانب ان کا دھیان نہیں گیا۔ جبکہ ہندوستان میں صرف دو ہی زبانیں اردو اور ہندی ایسی ہیں جو ملک گیر سطح پر بولی، لکھی پڑھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ یہی ہندی اور اردو ایسی زبانیں ہیں جو پورے ملک کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی ترجمان کہی جاسکتی ہیں۔ دوسری زبانیں کافی ترقی کے باوجود بھی خود کو علاقائی اثرات سے آزاد نہ کراسکیں۔ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا ہے لیکن اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ عوام کے علاوہ حکومت بھی اس زبان کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھے اور اس زبان کی ترقی اور اس کے فروغ کی نہایت سنجیدگی سے کوشش کرے۔ تب ہی اردو کو اس کا جائز اور مناسب حق مل سکے گا اور اردو زبان پورے ملک میں فخر سے سر اٹھا سکے گی۔

اگست 1990 کے شمارے میں ہندوستان کی آزادی کو یاد کیا گیا ہے۔ آزادی کی 43ویں سالگرہ پر ملک کے موجودہ حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ ملک میں اب صورتِ حال مختلف ہے اور شرپسند عناصر فرقہ واریت کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ ادھر دو چار برسوں میں ایسے واقعات میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ملک میں پھیل رہی شرپسندی اور بے اطمینانی پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ بھی فرقہ واریت کو ہوا دیتے ہیں انھیں سمجھنا چاہیے کہ اس راستے پر چل کر وہ خود اپنی قیمتی زندگیاں برباد کر رہے ہیں اور ساتھ میں پوری قوم کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنے مقاصد کی معقولیت کو ثابت کردیں اور اس کے لیے پرامن طریقہ کار اپنائیں تو ملک کا ہر انصاف پسند انسان ان کا ساتھ دے گا۔ اس طرح سے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر اور نفرت وعداوت کی فضا قائم کرکے کبھی بھی ملک میں امن وسکون نہیں قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ملک ترقی کے راستے پر گامزن ہوسکے گا۔

ستمبر 1990 میں سید شریف الحسن نقوی حرف آغاز کے تحت رقم طراز ہیں کہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی اردو کی صورتِ حال بہتر نہیں ہے اور وہاں اردو کی حالت خود اردو کے قلم کار حضرات ہی خراب کررہے ہیں۔ 'حرف آغاز' میں بہار اردو اکادمی کے رسالے 'زبان وادب' کے اداریے میں کی گئی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ آج اردو زبان ترقی کے راستے پر گامزن تو ہے لیکن خود اردو والے ہی اردو کے حق میں اچھا نہیں کررہے ہیں اردو زبان کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایسے تعلیم یافتہ افراد اردو کو کس طرح فائدہ دے سکتے ہیں۔ اس بات پر تشویش ظاہر کی گئی ہے کہ ایسے ریسرچ اسکالرز اور تعلیم یافتہ افراد اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں پڑھانے جائیں تو اردو زبان وادب کے فروغ اور ترقی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایسا تعلیمی معیار کی پستی کی وجہ سے ہورہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے افراد کو اردو کی صحیح تعلیم اور اردو کے صحیح اصولوں کو سمجھنا پڑھنا چاہیے۔ اگر ہم خود اپنی زبان میں غلطیاں کرنے لگیں گے تو ہماری زبان ترقی کے راستے پر کس طرح چل سکتی ہے۔

اکتوبر 1990 کے اداریے میں بھی پچھلے اداریے کی ہی طرح غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس دفعہ دہلی کے اردو اخبار میں کی جانے والی غلطیاں پیش کی گئی ہیں۔ اداریے میں مثال دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ آج کل اخباروں میں کیسی کیسی غلطیاں کی جارہی ہیں اور یہی اخبارات قاری پڑھیں گے اور ان غلطیوں کو وہ بھی دہرائیں کریں گے۔ سید شریف الحسن نقوی اداریے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''کوئی بھی زبان جب اپنے ارتقا کے مراحل طے کرتی ہوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے تو وہاں کے اثرات لازمی طور پر قبول کرتی ہے مگر قبول کرنے کا یہ عمل اگر اس کے بنیادی لب ولہجے کو متاثر کرنے لگے تو اس پر روک لگانا ضروری ہوجاتا ہے۔ اگر ہم اردو کو ایک ملک گیر زبان سمجھتے ہیں جو درحقیقت وہ ہے۔ تو صرف دہلی یا لکھنؤ کے محاورے سے سند حاصل

> کرنا غلط ہوگا۔ ہندوستان بھر میں جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے وہاں کی لسانی عادتوں کا لحاظ ضروری ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ اردو صرف ونحو کے بنیادی تقاضوں سے روگردانی نہ کی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو معیاری زبان کا تصور ہی ذہنوں سے محو ہوجائے گا اور اس کے نتیجے میں جو لسانی انارکی پھیلے گی وہ اس زبان کے ڈھانچے کو ہی تباہ کر کے رکھ دے گی۔ اردو کی کشش کا راز اس کے الفاظ کے سامعہ نواز، صوتی آہنگ، جملوں کی خوشنما تراش خراش، اس کی اثر انگیز ترسیلی صلاحیت اور اس کے لہجے کی سلاست وروانی میں ہے۔ اگر اس کی ان خصوصیات کو صدمہ پہنچا تو رفتہ رفتہ اس کی مقبولیت میں بھی کمی آسکتی ہے اس لیے اردو کے اہل قلم کا خواہ وہ ادب سے وابستہ ہوں خواہ صحافت سے، یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس کی ان امتیازی خصوصیات کی پاسداری کریں جو اسے دوسری زبانوں سے ممیّز وممتاز کرتی ہیں۔'' (57)

نومبر 1990 کے شمارے میں مذہبی رواداری اور غیر فرقہ وارانہ تہذیبی رویے کی اہمیت پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو زبان وادب کی بنیاد انسان دوستی پر رکھی گئی ہے۔ اردو کے بیشتر شعرا وادبا نے مذہبی رواداری اور انسانی محبت واتحاد کے ہی نغمے سنائے ہیں۔ اردو زبان کی یہ چاشنی ومحبت کے ترانے آج بھی موجود ہیں۔ اس طرح کی سوچ رکھنے والے شعرا وادبا کی تعداد بڑھی ہی ہے۔ ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ شاعر وادیب عملی طور پر میدان میں آئیں اور ایک ساتھ مل کر اتحاد واخوت کے ساتھ ملک کی سالمیت کے لیے ایکتا کی صدیوں پرانی روایت کا تحفظ کریں۔

دسمبر 1990 کے شمارے میں مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق کچھ اہم مضامین شائع کیے گئے ہیں اور اداریے میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔ اداریے میں مولانا آزاد کی تحریروں کے چند اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ

ایوان اردو اورامنگ میں تجارتی اداروں کے اشتہارات کی اشاعت شروع کرنے سے متعلق اعلان بھی شائع کیا گیا ہے۔

جنوری 1991 میں بھی مذہبی رواداری اوراخوت ومحبت کی باتیں کی گئی ہیں نیز اردو کے شعرا کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں زمانہ قدیم سے ہی مختلف مذاہب و مسالک کے افراد ایک ساتھ رہتے چلے آرہے ہیں اور ہندوستان کی پہچان ہی یہاں کی یگانگت اورمحبت رہی ہے۔ اپریل 1991 میں اداریہ نہیں شائع ہوا ہے۔ بلکہ بلراج کومل کی نظم 'سرگوشی' شائع ہوئی ہے۔

ایوان اردو کے اداریوں میں ہمیں جہاں ملک کی سالمیت اور مذہبی رواداری کی باتیں ملتی ہیں وہیں اردو زبان وادب کی چاشنی بھی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر شعیب رضاوارثی لکھتے ہیں:

> ''دہلی اردو اکیڈمی کی جانب سے شائع ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ اس کی پالیسی میں سرکاری پروپیگنڈے کی شمولیت لازمی ہے۔حکومت کے ہراقدام کی تعریف برسراقتدار جماعت کے سرکردہ لیڈروں کی مدح سرائی، ملک کے سیاسی نظام کے قصیدے وغیرہ جیسے عناصر تو اس رسالے کے اداریوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ عصری حالات و واقعات اور اردو سے متعلق مسائل پر بھی اکثر اداریوں میں اظہار خیال کیا گیا ہے اوربعض مفید بحثیں اس ضمن میں زیرقلم آگئی ہیں۔'' (58)

ماہنامہ ایوان اردو میں ہمیں مختلف ملکی وغیرملکی حالات کے تعلق سے بھی کافی جانکاری مل جاتی ہے۔ اس کے اداریوں میں بھی ادب کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ کوموضوع سخن بنایا جاتا رہا ہے۔ ادب وزبان کی مقصدیت کو واضح کرنے کی بہتر انداز میں کوشش کی گئی ہے۔ آج بھی اس کے اداریے اردو حلقے میں مشہور ومقبول ہیں۔

ذہن جدید: جدیدیت کو فروغ دینے کے لیے شروع کیا گیا ادب آرٹس کلچر کا ترجمان رسالہ ذہن جدید اس معاملے میں قابل ذکر اوراہم رسالہ ہے کہ اسے زبیر رضوی جیسے علم ودانش کے پیکر اور جدید شاعر کا ساتھ ملا ہے۔ زبیر رضوی نے رسالے کودوسرے تمام جرائد

سے منفرد بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ رسالے میں اردو ادب کے علاوہ غیر ملکی ادب، آرٹس، تھیٹر، فلم، رقص جیسے موضوعات پر مضامین اور تبصرے شائع ہوتے رہے ہیں جو دیگر اردو رسالوں میں نہیں نظر آتے۔ اپنے پہلے شمارہ میں ہی زبیر رضوی نے اعلان کیا تھا کہ یہ رسالہ دوسرے رسالوں سے الگ ہوگا اور اس میں وہ سب کچھ ہوگا جسے آج کا قاری پڑھنا چاہتا ہے۔ ذہن جدید کو زبیر رضوی نے مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کی یاد میں جاری کیا تھا۔ ذہن جدید کے اداریوں میں رسالے کے تعلق سے لکھا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ شائع ہونے والے مضامین، عصری واقعات وحالات کو بھی موضوع قلم بنایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''یہ بات ہم نے پہلے بھی لکھی تھی کہ اردو میں لکھی گئی بیشتر تنقید ایسی ہے جو ایک ہی زاویے کی پابند ہو کر پورے تخلیقی منظرنامے کو ایک ہی مقام سے دیکھ رہی ہے۔ترقی پسند پر خواہ جدیدیت کے اثرات ہوں یا ترقی پسند کے جدیدیت پر، ابھی تک دونوں کے تنقیدی لب و لہجے میں سر مو فرق نہیں آیا۔ تخلیق کے تئیں پرانے اور نئے ادبی میلانات کی دہائی دینے والوں نے کبھی کسی کی پگڑی اچھال دی اور کبھی کسی گنجے سر پر فضیلت کی دستار رکھ دی۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ بعض نقادوں نے اپنی ساری توانائی ایسے شاعروں اور افسانہ نگاروں کا سربلند کرنے پر لگا دی جن کی تخلیق سانسیں اکھڑی اور جلد اکھڑ جانے والی تھیں۔ یہ صورت حال ہمارے جیسوں کے لیے اور بھی تکلیف دہ تھی کہ ہم ادب کو ٹھہر ٹھہر کے اور دہائیوں کے وقفے کے ساتھ پڑھنے کے عادی ہیں۔''(59)

زبیر رضوی کا یہ اداریہ آج کی تخلیقی اور تنقیدی صورتِ حال پر ایک طنز ہے۔ انھوں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ آج تنقید کسی افسانہ نگار یا شاعر کو اچھا یا برا ثابت کرنے کے لیے کی جاتی ہے، جبکہ تنقید صرف اس لیے کی جانی چاہیے کہ وہ شاعر یا افسانہ نگار کتنا بہتر اور اچھا ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ موجودہ منظر نامے میں یہی نظر آتا ہے کہ آج نااہل افراد ادب

کے میناروں پر بیٹھ کر ادب کے بڑے فیصلے کر رہے ہیں۔ انھیں اس مقام تک پہنچانے والے بھی ان کے جیسے ہی نقاد ہیں۔ دوسری جانب نہ جانے کتنے ایسے ادیب ہیں جو اہلیت رکھتے ہوئے ان نام نہاد نقادوں کی وجہ سے اپنے قلم کو آرام دے بیٹھے ہیں۔ ادب کسی کی جاگیر نہیں ہے کہ وہ اس پر حکومت کرنا شروع کر دے۔ ادب تو زمین کا ایک ایسا حصہ ہے جہاں ہر طرح کے پودے پیدا ہوتے ہیں اور سب ایک ہی مٹی سے جنم لیتے ہیں۔ ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ چیزوں کو اپنانے کی صلاحیت ہو۔ دوسری زبانوں کا ادب ہو یا علاقائی ادب، ان سب سے ادب کا ذخیرہ بڑھتا ہے۔ ادب کو زرخیز اور بیش قیمت بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے ادب اور زبانوں کا اثر قبول کیا جائے۔ ادب ایک لافانی شے ہے اور اسے لافانی رکھنے کے لیے مختلف النوع اثرات کا شامل ہونا بے حد ضروری ہے۔ جیسا کہ زبیر رضوی اپنے اداریے میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارا زاویہ یہ ہے کہ ادیب اور دانشور دوسری زبانوں کے اثرات ضرور قبول کرے۔ ان میں ہونے والی تخلیقی سرگرمیوں اور نظریاتی مباحث سے خود کو باخبر بھی رکھے لیکن اس سب کو 'تیار مال' کی صورت لاد کر رسالوں اور کتابوں میں ڈھیر نہ کر دے کیونکہ جب تک نظریہ سازی کو اپنے معاشرے کے ردو قبول کی سائیکی اور شعور سے وابستہ کر کے ہم اپنے نقد و نظر کی بساط نہیں بچھائیں گے ہمیں مات ہونی ضروری ہے۔
>
> ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ علاقائی زبانوں کی نمائندہ تخلیقات کو اردو میں ترجمہ کرنے کا رویہ بڑھ رہا ہے، خاص طور سے ہندی سے کافی کچھ ترجمہ ہونے لگا ہے۔ ابھی بہت سی علاقائی زبانوں کے نمائندہ ادب اور ان میں ہو رہے ادبی مباحث سے اردو قاری کو متعارف کرانا اور اسے باخبر رکھنا ضروری ہے۔'' (60)

زبیر رضوی نے رسالے کو منفرد بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ نئی غزل نمبر،

جدید نظم نمبر کے علاوہ فسادات کے افسانوں پر مشتمل ایک خصوصی شمارہ بھی شائع کیا تھا، جس کی اردو داں ادبی حلقے میں خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔ اس شمارے میں منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری کے علاوہ حسین الحق، ساجد رشید، سریندر پرکاش، وغیرہ کے افسانے شائع ہوئے تھے۔ فسادات کو ادب میں کافی جگہ دی گئی ہے۔ فسادات پر لکھا گیا منٹو کا افسانہ کھول دو، بیدی کا لاجونتی، حیات اللہ انصاری کا شکر گزار آنکھیں اور اشفاق احمد کا گڈریا آج بھی نوادرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے افسانے دوبارہ نہیں تخلیق کیے گئے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جس دور میں یہ افسانے تخلیق کیے گئے اس وقت موضوعات اور حالات کچھ مختلف تھے اور موجودہ عہد کے مسائل وحالات کچھ دوسرے ہیں۔ موجودہ حالات میں فسادات، جرم وبدعنوانی، استحصال، ذات پات، مذہبی دہشت گردی کا حصہ بن گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو زبیر رضوی کا اداریہ:

> ''فسادات پر لکھے ادب کی پرکھ کرتے ہوئے ممتاز شیریں اور محمد حسن عسکری کے زاویوں میں اب خاصا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں اب اتنے برسوں بعد اہم فسادات کو 47 والی آنکھ سے نہیں دیکھتے کہ فسادات بھی اسی طرح ہندستانی سائیکی کا حصہ بن گئے ہیں جس طرح دہشت گردی، ذات پات کی تفریق، جرائم، بھوک، استحصال اور بدعنوانی ہماری شریانوں میں داخل ہوکر ہمارے خون کی سرخی کو گدلا اور مٹ میلا کررہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں فرد کی کوئی اپنی شناخت نہیں ہے اور حسب نسب کے بغیر وہ کسی قطار شمار میں نہیں ہے۔ اس لیے شہروں شہروں انسانی لاشوں کے ڈھیر بن جانے والے ملبے سے ہی ناک پر رومال رکھ کر گزر جاتے ہیں۔ اکیسویں صدی اگر ہندستانی معاشرے میں فرد کے وقار اورانسانی جان کی قدروقیمت کا احساس دلانے میں بیسویں صدی سے زیادہ ناکام رہی تو فسادات کے ادب کو پڑھتے ہوئے نہ کوئی آنکھ نم ناک ہوگی اور نہ ہی میر کا یہ شعر انسان کے اندرون میں دردمندی پیدا کرسکے گا:

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک

مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا (61)

زبیر رضوی نے اداریے میں بڑے ہی تلخ انداز میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری نس نس میں زہر بھر گیا ہے اور ہم ہندستان میں آئے دن ہونے والے فسادات کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔

ذہن جدید ایک ایسا رسالہ ہے جس نے ادب کو ادب سے آگے بڑھ کر، اوپر اٹھ کر جانچا اور پرکھا ہے۔ ادب صرف لکھنے پڑھنے اور سنانے کی چیز نہیں ہے بلکہ ادب ہماری شریانوں میں، ہمارے خون میں شامل ہونا چاہیے۔ غالب جیسے بڑے اور عظیم شاعر پر یوں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن نئے اور جدید انداز اور میڈیم کے حوالے سے ان کی شاعری پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا ہے، دسمبر 1998 تا فروری 1999 کے شمارے میں زبیر رضوی نے غالب کی ایک نئے انداز میں باز یافت کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسے مضامین کو جگہ دی ہے جو غالب کی شخصیت کی نئی جہتوں سے روشناس کراتے ہیں۔ غالب اور ہندستانی فنون لطیفہ کے عنوان کے تحت غالب کا دشت امکاں غالب اور صادقین، کتھک رقص اور غالب کی غزل، ٹی وی سریل غالب، فلم مرزا غالب، غالب کو بڑے ڈرامہ نگار کا انتظار ہے اور غالب کا جسم جیسے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شمارے میں غالب کو ایک نئے اور منفرد انداز میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں تو غالب کی شاعری پر سیکڑوں سمینار ہوتے ہیں، مختلف پہلوؤں سے غالب کی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن غالب جیسا شاعر اور ادیب صرف اپنی شاعری یا خطوط تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی اپنی شخصیت میں ہی اتنی پرتیں ہیں کہ انھیں دریافت کرنے میں صدیاں ناکافی ہوں گی۔ ان کی زندگی کے ہر گوشے میں ایک نیا فنکار، نئی سوچ اور نئے تخیلات کا پیکر نظر آتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کی شاعری اور شخصیت کے ہر پہلو اور ہر زاویے پر قلم اٹھایا جائے اور تحقیق کی جائے۔ تب کہیں جا کر غالب کی صحیح بازیافت ممکن ہو سکے گی اور غالب کو ہم ان کا صحیح مقام دے

پائیں گے۔ ملاحظہ ہو:

''آزادی کے یہ پچاس برس یقینی طور سے غالب کی بازیافت کے برس ہیں، لیکن کتنا بڑا المیہ ہے کہ جاتی ہوئی اس بیسویں صدی میں کسی نے ہندستانی فنون لطیفہ پر غالب کی شخصیت اور شاعری کے اثرات پر توجہ نہیں دی۔ نہ سیمینار کرانے والوں کو توفیق ہوئی کہ وہ ہندستانی مصوری، تھیٹر، رقص، سنگیت، فلم، ریڈیو، ٹی وی کے میڈیم پر غالب کے اثرات پر ایک بھرپور سیمینار کا اہتمام کرتے یا ان میں سے کسی ایک موضوع پر کسی موزوں ترین آدمی سے کام کراتے۔ اردو زبان وادب کے فنون لطیفہ سے گہرے اور توانا رشتے کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں آج کے اردواداروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ذہن جدید نے اپنی زبان کے اس شدید نقصان اور زیاں کی تلافی کی خاطر اور فنون لطیفہ سے اردو کے رشتے کو پھر سے جوڑنے کی خاطر اپنے 26 شماروں میں کافی کچھ چھاپا اور اس شمارے میں اسی بڑے نقصان کی بساط بھر تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب اور ہندستانی فنون لطیفہ کے موضوع پر لکھنے لکھانے کی ابتدا ہم نے کردی ہے تاکہ غالب کو ایک جیسی تنقید اور تحقیق کی گھٹن سے باہر لایا جائے۔ ذہن جدید ایسے معاصرین کو اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی دعوت دیتا ہے۔''(62)

ذہن جدید کے اداریوں میں جہاں ادب وہندستانی فنون لطیفہ کی بات کی جاتی رہی ہے وہیں جدید نظم، اردو اکادمیوں کا اردو رسالوں کے تئیں سرد رویہ، اردو رسالوں کی ناکامی اور اردو ادب اور صحافت کے لیے سرکاری گرانٹ نہ ملنے جیسے موضوعات کو بھی اداریے میں اٹھایا ہے۔ ذہن جدید کا جدید نظم نمبر بھی قابل ذکر ہے۔ اس خصوصی نمبر کو دو حصوں میں شائع کیا گیا تھا۔ ذہن جدید کے اداریوں میں فلم اور تھیٹر کو بھی موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ملکی وغیر ملکی خبروں کے حوالے سے بھی کافی کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ ان کے

علاوہ گجرات کے فسادات، گجرات کے زلزلے، بابری مسجد کا انہدام، مقبول فدا حسین کی مصوری جیسے موضوعات پر بھی زبیر رضوی نے قلم اٹھایا ہے۔ کبھی کبھی اداریے میں معروف ادبا کے خطوط بھی شائع ہوتے ہیں۔ مثلاً ستمبر 2001 تا فروری 2002 کے شمارے میں اداریے میں فضیل جعفری کا زبیر رضوی کو لکھا خط شائع ہوا ہے جو انھوں نے آل احمد سرور کی وفات کے حوالے سے لکھا ہے۔

دسمبر تا فروری 2008 کا شمارہ ذہن جدید کا 50واں شمارہ تھا جو ایک خصوصی نمبر کے طور پر شائع ہوا۔ اس کے اداریے میں زبیر رضوی نے ماس میڈیا اور موجودہ اردو زبان کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آج ماس میڈیا میں اردو زبان نے ایک اہم مقام بنالیا ہے اور اردو زبان میڈیا کے ذریعے بہت تیزی سے پھل پھول رہی ہے:

> ''بلا شبہ یہ عہد ماس میڈیا کا ہے اور اس وقت ہندستانی ماس میڈیا میں فنون پر پروگرام، مباحث اور دستاویزیں بنانے کا ایک مقبول سلسلہ شروع ہوچکا ہے آج ماس میڈیا نے جس زبان کو اپنے پیغام کی ترسیل کے لیے کارآمد پایا ہے اور نہایت اثرآفریں جانا ہے وہ اردو آمیز زبان ہے جس کا مزاج داں وہ نوجوان ہے جس نے غیر اردو والوں سے کہیں زیادہ اردو کے ماحول میں آنکھ کھولی اور اس مشترکہ تہذیب کے باقی ماندہ مظاہر کا شاہد بھی بنا اور جس کا تجربہ دوسرے نوجوانوں کے لیے محض دور کا جلوہ بنا رہا ہے۔ یہی وہ پس منظر اور میڈیا کی ترسیلی زبان کے تقاضے ہیں کہ اس وقت 100 سے زائد عام ٹی وی چینلوں اور ایف ایم ریڈیو کے مقبول میٹروں پر اردو لہجے میں ڈوبی سنوری آوازیں اپنا جادو جگا رہی ہیں۔'' (63)

ذہن جدید نے ہمیشہ سے ہی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ اپنے مختلف مضامین اور کالموں سے ادبی تشنگی کو دور کیا ہے۔ ادبی صحافت میں ذہن جدید نے ایک مثالی کردار ادا کرتے ہوئے یہ ثابت کردیا ہے کہ صحافت اگر موجودہ عہد اور تناظر کے حوالے سے کی

جائے تو زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ 50ویں شمارے کے ساتھ ہی زبیر رضوی نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں مختلف ادیبوں کی ذہن جدید کے تعلق سے آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ ذہن جدید کے ابتدائی شماروں پر مختلف اردو و انگریزی رسائل واخبارات کے تبصرے شائع کیے گئے۔

ذہن جدید کے اداریوں کے موضوعات شروع سے ہی کچھ مختلف قسم کے رہے ہیں۔ روایتی رسائل سے الگ ہٹ کر ذہن جدید نے ایک بہتر معیار قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔شمارہ 1 میں آرٹس اورفلم ومیڈیا کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اورذہن جدید کے اجرا کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔شمارہ 3 میں ذہن جدید کی کامیابی اوراس کے پڑھنے والوں کے ردعمل پر اظہار کیا گیا ہے۔شمارہ 8 میں ادبی انعامات اورایوارڈز کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ موجودہ عہد میں ادبی ایوارڈ نے ادب کو کیا نقصانات پہنچائے ہیں۔موجودہ دور میں انعامات کے لیے تجارتی گھرانوں اور کاروباری افراد نے کس کس طرح کا کھیل کھیلا ہے۔ شمارہ 29 میں ساہتیہ اکادمی، مراٹھی ادیبوں اورقومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے حالات پر گفتگو کی گئی ہے اور قومی اردو کونسل کے دوہرے رویے پر تنقید کی گئی ہے۔شمارہ 43 میں پریم چند کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ پریم چند ایک ایسا افسانہ نگار تھا جو معاشرے کی رگ رگ سے واقف تھا۔اس نے سماج کے ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جس پر دوسرے افسانہ نگار قلم اٹھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ذہن جدید کے مختلف اداریوں پر ڈاکٹر شعیب رضا وارثی کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ’’ذہن جدید کے اداریے قارئین کو بلاشبہ سوچنے اور کچھ کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ادب کی صورتِ حال کا صحیح طور پر جائزہ پیش کرنے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جو خوبیاں اورخامیاں ادب اوراد یبوں میں موجود ہیں ان کی طرف قارئین کا دھیان منعکس ہو اورخوبیوں میں اضافے اور خامیوں کو دور کرنے کی شروعات ہو۔ ادب کو صحیح سمت کی طرف موڑنا بھی ان اداریوں کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اداریہ

نویس تمام صورتِ حال سے بخوبی واقف ہو اوراپنی تاریخ اور اسلاف کے چھوڑے ہوئے سرمائے سے نیز ارتقائی مراحل سے کما حقہ آگاہی رکھتا ہو۔‘‘(64)

ذہن جدید کے اداریے اس معاملے میں قابل ذکر ہیں کہ ان میں اردو ادب کو عالمی ادب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ادب کی نئی جہتوں اور ادب کے مختلف گمشدہ عناصر کو قارئین کے سامنے لایا گیا ہے۔موجودہ ادب کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ ادب میں جو جانب داری چل رہی ہے اس سے اردو کا ہی اپنا نقصان ہے۔ ذہن جدید کے اداریے دوسرے رسائل کے اداریوں سے اس لیے بھی منفرد ہیں کہ ان میں اردو ادب کے ساتھ ساتھ غیر ملکی ادب، فنون لطیفہ،فلم، ماس میڈیا، ٹی وی ریڈیو، رقص، موسیقی، تھیٹر، لوک ادب جیسے موضوعات کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ذہن جدید اردو کا واحد رسالہ ہے جس میں عالمی ادب اور ہندستانی فنون لطیفہ پر بھرپور مواد شائع ہوتا ہے۔ اردو رسالوں میں جو کمیاں تھیں اسے ذہن جدید نے پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

ادبی رسائل کی خبریں

صحافت کا دوسرا نام خبرنگاری ہے۔ صحافت کا یہ ایک لازمی جزو ہے۔ جب تک صحافت میں خبروں کا عنصر شامل نہ ہو اسے صحافت نہیں کہا جاسکتا۔ اردو صحافت نے بھی وقت اورحالات کے پیش نظر کافی تجربات کیے ہیں۔ ابتدا سے ہی نئی نئی تبدیلیوں کو قبول کیا ہے اورعصری تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ اگر ہم اخباری صحافت کی بات کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو کی اخباری صحافت کسی دوسری زبان کی صحافت سے کسی طور پیچھے نہیں رہی ہے۔ ملک کے تمام نشیب وفراز میں اس صحافت نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ چاہے وہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی ہو یا ستی پرتھا کا معاملہ، چاہے بنگال کی تقسیم ہو یا ملک کی آزادی کا مطالبہ، اردو صحافت ہرتحریک اور ہرصورتِ حال میں پیش پیش رہی ہے۔

آزادی سے قبل اردو صحافت کا ایک اپنا منفرد معیار اور وقار تھا۔ آزادی کے بعد صورتِ حال تبدیل ہوگئی جیسا کہ سراج انور لکھتے ہیں:

''جنگ آزادی میں اردو صحافت کا نمایاں رول رہا ہے جس کا اعتراف انگریز دانشوروں نے بھی کیا ہے۔ کئی اہم شخصیتیں اخبار نکالنے کے جرم میں جیل بھی گئیں اور ان کے اخبار بند کرادیے گئے لیکن جب آزادی ملی تو صورتِ حال بدل چکی تھی۔ اردو صحافت کو سب سے بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب اس ملک کے پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرساد کے ایک ووٹ نے اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنادیا جب اردو سرکاری زبان نہیں رہی تو اس کے پڑھنے والوں کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی گئی۔''(65)

تقسیم ہند کا سانحہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو جھنجھوڑ کرر کھ دیا۔ اردو کے ساتھ کیے گئے اس سوتیلے برتاؤ کا خمیازہ آج پوری اردو زبان اور صحافت جھیل رہی ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی اور فروغ کا دارومدار اس ملک کے عوام کے ساتھ ساتھ وہاں کی حکومت پر بھی ہوتا ہے۔ اردو اخبارات ورسائل کو آزادی کے بعد کنارے کر دیا گیا اور یہ زبان عوام سے دور ہوتی چلی گئی۔ شاہد کلیم کے الفاظ میں:

''یہ حقیقت ہے کہ تقسیم ہند کے بعد اردو زبان کا وہ مقام نہ رہا جو اس سے پہلے تھا۔ دن بہ دن اس کی عوام میں مقبولیت کم ہوتی گئی اور آج یہ حالت ہے کہ یہ لائبریری اور درسگاہوں تک ہی سمٹ کر رہ گئی ہے۔ کوئی بھی زبان اسی وقت ترقی کے منزل کو چھوسکتی ہے جب اسے عوام کی محبت حاصل ہو، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اردو ذریعہ معاش نہیں رہی نتیجتاً اس کے حامیوں کی ایک بڑی جماعت دوسری زبانوں کی طرف راغب ہوئی، اس طرح اردو لکھنے پڑھنے والوں کی ایک بڑی جماعت ذریعہ معاش کی تلاش میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوئی جس کا اثر یہ پڑا کہ اخبار ورسائل یتیمی کی مار جھیلنے کو مجبور ہوئے اور پھر انھیں زندہ رکھنے کے لیے مدیران اخبار کو

ارباب اقتدار اوراہل رسوخ کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ ارباب اقتدار کی پالیسی پرنٹ میڈیا کے تئیں کیا ہوتی ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ جب حکومت نے اپنی شرطوں پر اردو صحافت کو صرف زندہ رہنے کی اجازت دے رکھی ہے ظاہر ہے ایسی صورت میں صحافتی دیانت داری برقرار نہ رہے گی اور اس کے چہرے پرداغ آئے گا اور جب داغ آئے گا تو اس کی مقبولیت بھی خطرے میں پڑے گی اور اس کا معیار ووقار قائم و زندہ نہ رہ سکے گا۔'' (66)

اردو صحافت میں اگر ہم اخبارات کے علاوہ صرف اردو رسائل کی بات کریں خصوصاً اردو کے ادبی رسائل کی تو ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے ادبی رسائل نے بھی صحافت کے معیار کو قائم رکھا ہے اور خبروں، کالموں، اداریوں کے ذریعے صحت مند اور کامیاب صحافت کے ذریعے اسے استحکام بخشا ہے۔ اردو کے ادبی رسائل میں خبریں بھی نظر آجاتی ہیں۔ اردو رسائل میں شائع خبروں کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(ایک) عام ادبی خبریں۔ اس کے تحت اردو کے تعلق سے جاری سرگرمیوں، سیمیناروں، جلسوں، ادبی انجمنوں کی کارگزاریوں کی خبریں دی جاتی ہیں۔ عام ادبی خبروں کے ہی تحت کتابوں کے اجرا اور نئی کتابوں کا اعلان بھی شامل ہوتا ہے۔(دو) مدیر کی طرف سے اطلاع کے تحت ہم ایسے اشتہارات یا اعلانات کو شامل کر سکتے ہیں جس میں مدیر قارئین کو رسالے کے تعلق سے کوئی اطلاع دیتا ہے۔ یہ اطلاع اداریے میں بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی علاحدہ کالم کے ذریعے بھی اعلانات شائع کیے جاتے ہیں۔ ان میں غلطیوں کی تصحیح، خصوصی نمبر کی تفصیلات، قارئین کا شکریہ وغیرہ شامل ہیں۔

(تین) وفیات کی خبریں۔ ان میں ہم ان خبروں کو شامل کرتے ہیں جن میں کسی اہم شخصیت کی وفات کی خبر دی جاتی ہے اور تعزیت کی جاتی ہے۔ اس کے تحت اس شخصیت کے متعلق دی گئی مختصر معلومات بھی شامل کی جاتی ہیں۔

اردو کے ادبی رسائل میں کبھی کبھی عام ملکی مسائل وحالات سے متعلق بھی خبریں نظر

آجاتی ہیں خاص طور سے ایسے ادبی رسائل جو سرکاری ہیں اور سرکار کی پالیسیوں کے تحت شائع ہورہے ہیں۔ یہاں نیا دور اور آجکل کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ نیا دور میں تو تقریباً ہر شمارے میں ریاست سے متعلق سرکاری پالیسیوں کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ تصاویر بھی خبروں کی صورت میں شائع ہوتی ہیں۔ تصویری صحافت اردو کے ادبی رسالوں میں نہیں ہوتی ہے لیکن نیا دور اس معاملے میں ممتاز ہے۔ اس کے ہر شمارے میں سیاست سے متعلق تصاویر اس کے سرورق اور بعد کے صفحات کی زینت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری ادبی خبریں، اداریے، اعلانات اور اشتہارات کے ذریعے دی جاتی ہیں۔ آجکل کی بھی کم وبیش یہی صورتحال ہے لیکن اس میں تصاویر نہیں شائع ہوتیں۔ ان کی جگہ آجکل کے فائل کے عنوان سے ایک بہت اچھا سلسلہ شائع ہوتا ہے جس کے تحت آجکل کے پرانے فائلوں سے ایک مضمون کو دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ شاعر اور سب رس میں ادبی خبریں اوراعلانات ووفیات کی بھی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ شاعر میں جدید تقاضوں اورعصری علوم کے حوالے سے خبریں مل جاتی ہیں۔ سب رس میں حیدرآباد اور دکن کی خبروں پرزیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی شمالی ہند اور ملک کی مختلف درسگاہوں کے اردو شعبے میں منعقد کیے گئے سیمیناروں اورجلسوں کی خبروں کو بھی شائع کیا جاتا ہے۔ سہ ماہی اردو ادب میں بھی کم وبیش یہی صورتِ حال ہے۔ شب خون میں ہمیں خبروں کا حصہ کم دکھائی دیتا ہے۔ ماہنامہ کتاب نما میں اشتہارات کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے شائع مطبوعات اور دوسری کتابوں کے اشتہارات ایک شمارے میں تقریباً 5 سے 6 صفحات پر پھیلے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ رفتار ادب کے کالم میں غیرادبی، سائنس، سیاست، ادب اطفال پر مبنی کتابوں پر بھی تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ ادبی خبروں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے متعلق خبریں، معروف شخصیات کو ایوارڈ ملنے کی خبریں۔ شعری محفلوں کی خبریں، پی ایچ ڈی ڈگری ایوارڈ ہونے کی خبریں، کسی معروف شخصیت کی وفات پر منعقد تعزیتی جلسے کی خبریں اور معروف شخصیات کی وفات کی خبریں شامل ہوتی ہیں۔ قارئین کے خطوط میں بھی خبروں کے عناصر نظر آتے ہیں۔

قارئین کے خطوط میں غزلوں، نظموں اور مضامین کے حوالے سے دی جانے والی اطلاعات کافی مفید اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی شعر یا مصرعے کی غلطیوں کی اصلاحات کو بھی موضوع سخن بنایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر نامی انصاری چمن گنج، کانپور کا تحریر کردہ یہ خط ملاحظہ کریں:

''حیدرآباد کے یعقوب میراں مجتہدی نے رشید حسن خاں پر جو مختصر مضمون لکھا ہے اس میں انھوں نے کتاب نما کے قارئین کو اطلاع دی ہے کہ 23 فروری کی صبح ان کا فون آیا اور 24 فروری کی شام میں ان کے انتقال پر ملال کی خبر ملی۔

عرض ہے کہ 24 فروری کو رشید حسن خاں زندہ اور توانا تھے۔ 25 فروری کو بھی وہ زندہ تھے 25 اور 26 فروری کی درمیانی شب میں سوا دو بجے ان کی رحلت ہوئی۔ سب کو معلوم ہے کہ رشید حسن خاں تاریخ اور سنہ کے معاملے میں کسی قدر محتاط تھے۔ کیا پس مرگ ان کے ساتھ یہ بھونڈا مذاق نہیں کہ خود ان کی تاریخ وفات لا پروائی اور بے احتیاطی کا شکار بن جائے۔'' (67)

اس کے علاوہ کبھی کبھی ادبی خبروں میں عام خبریں بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔ کتاب نما اردو صحافت کو صحافت کے اعلیٰ معیار تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ماہنامہ ایوان اردو کے اداریے میں خبروں کا عنصر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اشتہارات اور اعلانات بھی شائع ہوتے ہیں۔ اردو خبر نامہ کے عنوان سے ادبی خبروں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس کالم کے تحت مشاعروں کی رپورٹ، تصاویر کے ساتھ خبریں، ادبی کانفرنس، تقریب تقسیم ایوارڈ، سالانہ انعامات کی تقسیم، وفیات، وزیر خارجہ کو استقبالیہ، اردو کے مسائل پر اظہار خیال جیسی خبریں عام طور پر شائع ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کی رائے کے عنوان سے قارئین کے خطوط اور نئی مطبوعات کے عنوان سے کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔ ایوان اردو ایک سرکاری رسالہ ہے اس لیے اس میں بھی سرکاری پالیسیوں اور سرکاری اسکیموں کے متعلق خبروں پر خصوصی دھیان دیا جاتا ہے۔ کسی وزیر یا گورنر کو استقبالیہ دیا گیا

ہو یا کوئی ایسی سرکاری تقریب جو اردو ادارے کے ذریعے منعقد کرائی گئی ہو ایسے جلسوں اورتقریبات کی خبروں پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ جون 1990 میں جناب اندر کمار گجرال کا خیرمقدم کے عنوان سے خبر شائع ہوئی ہے۔اس طرح کی تمام خبروں میں تصاویر بھی شائع کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اداریوں میں بھی خبروں پر توجہ دی جاتی ہے۔ ذہن جدید خبروں کے معاملے میں تھوڑا منفرد ہے اس میں عام ادبی خبروں کے ساتھ ساتھ آرٹ، موسیقی، تھیٹر، فلم اور دوسری تفریحات کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے۔ان کے علاوہ مختلف ثقافتی پروگراموں اورانجمنوں سے متعلق بھی خبروں کو جگہ دی جاتی ہے۔

اردو صحافت خاص طور سے رسائل کی صحافت میں خبروں کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ خبروں کے ذریعے مدیران قارئین کے اورزیادہ قریب آئے ہیں۔اردو حلقے کو اردو سے متعلق سرگرمیوں کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ نئی کتابوں اوروفیات کی بھی جانکاری ہوجاتی ہے۔تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں تو قارئین کے لیے کافی مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

ماہنامہ شاعر میں رفتار کے عنوان سے علمی،ادبی، تہذیبی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان خبروں میں مشاعروں کی روداد، کتابوں کی رسم اجرا، انتقال کی خبریں اورنیم سیاسی خبریں شامل ہیں۔ملاحظہ ہو:

اردو کا حق نہ ملا تو کانگریس کو ووٹ نہ دیں گے

فیروزآباد کے حامیان اردو کا فیصلہ

فیروزآباد ضلع آگرہ یکم جون۔ بدھ کی شب میں ایک جلسہ ڈاکٹر رمیش چند کی صدارت میں حاجی پورہ میں منعقد ہوا۔ قاضی یعقوب علی خان صاحب نے جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے اردو تحریک کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اورکہا کہ اردو کے حقو ق کی پامالی اوراردو کی تباہی کی متواتر ذمہ داری برسراقتدار جماعت کانگریس پر عائد ہوتی ہے۔ اردو کلچرل سوسائٹی کی طرف سے اس جلسہ میں اتفاق رائے سے دوقراردادیں منظور کی گئیں۔ ایک کے

ذریعہ علامہ نیاز فتح پوری ایڈیٹر'نگار پاکستان' کے انتقال پرملال پر دلی رنج
وغم وافسوس کااظہار کرتے ہوئے ان کی وفات کودنیائے ادب اردو کا
ناقابل تلافی نقصان عظیم قراردیا گیا۔دوسری قرارداد میں کانگریس سے
پرزوراپیل کی گئی کہ وہ اردوکے مطالبات پرفوری کارروائی کرےاور یوپی،
بہار، دہلی میں اردوکوسرکاری زبان کادرجہ دے۔ ورنہ اردو دوست عوام
آئندہ الیکشنوں میں پوری طاقت سے کانگریس کے خلاف حامیان اردو
کوبیدار کرنے کی مہم شروع کرنے پرمجبور ہوں گے۔'' (68)

خبروں کے کالم میں اس کے علاوہ اوردوسری خبریں اس طرح ہیں، عابدحسین ادیب کو صدمہ، حضرت بسمل سنسہاروی کاانتقال، مولانا آزاد کے خطوط مطلوب ہیں، نیپال میں مشاعرہ۔

شاعر کے اسی شمارے میں ص 64 پرفلوروزن لوشن کریم کااشتہاربھی شائع ہوا ہے۔ جس میں جلدکوخوبصورت بنانے کے لیےاس کریم کے استعمال کی درخواست کی گئی ہے۔

شاعر کا فروری 1967 میں کرشن چندرنمبر شائع ہواتھا جس میں مختلف زبانوں کے ادیبوں نے ان کی شخصیت وخدمات کاتفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔کرشن چندر کی کہانیاں، ڈرامے اور ناول بھی شائع کیے گئے تھے۔ مارچ 1968 میں افسانہ و ڈرامہ نمبر، فروری 1969 غالب نمبر، گوشہ گیان چندجین، نئی شاعری کے نام،خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر ہیں۔

محفل اپنی کے عنوان سے شاعر میں رسالے کےتعلق سے اہم اطلاعات پیش کی جاتی رہی ہیں۔ اس میں مدت خریداری کے اختتام اور رسالہ شاعر کی تاریخ،غرض وغایت نیز دیگر اطلاعات فراہم کی جاتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ علمی، ادبی اور بہترین خبروں پر مشتمل ایک مستقل کالم رفتاربھی لگاتارشائع ہوتارہاہے،جس میں مختلف ادبی خبروں کوشامل کیاگیا ہے۔ مزید آئندہ شمارے کی جھلک بھی پیش کی جاتی رہی ہے جسے ہم خبروں کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ دسمبر 1967 کے شمارے میں جنوری 1968 کے شمارے کی جھلک پیش کی گئی ہے۔جنوری 1968 میں شاعر کے انتالیسویں سال میں قدم رکھنے پر

شکر ادا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر میں دو نئے ابواب کے اضافے کا ذکر بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> آئندہ عام شمارے سے شاعر میں بہت ہی نمایاں تبدیلیاں زیر غور ہیں دو نئے ابواب کا اضافہ بھی کیا جائے گا۔ زاویے کے تحت اردو کے ممتاز ادیب ونقاد ڈاکٹر محمد حسن اور مطالعہ کے عنوان سے نئی نسل کے مشہور شاعر ندافاضلی مستقل طور پر ہر شمارے میں لکھا کریں گے۔'' (69)

اردو رسائل نے اپنی ادبی صحافت سے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ وہ صحافت کے تمام اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو کے قاری کو اعلیٰ درجے کا ادبی وصحافتی نمونہ پیش کر سکیں۔ چاہے وہ خبریں ہوں، اشتہارات ہوں یا اطلاعات کا کالم ہو، سبھی کالموں میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان سے سبھی اردو والے مستفید ہوں اور ان خبروں سے اردو حلقے میں اردو زبان و ادب کے لیے کوششیں کرنے کا جذبہ پیدا ہو سکے۔

ترتیب، تزئین و آرائش

اردو رسائل نے دیگر عام رسائل کی طرح ہی خود کو دیدہ زیب اور خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ رنگ برنگی تصاویر قارئین کو پہلی نظر میں ہی اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔ ادبی رسائل میں تھوڑی بہت کمی ہوتی ہے تاہم ان کا اپنا منفرد معیار ہوتا ہے اپنا ادبی حلقہ ہوتا ہے، اور زیادہ تر قارئین خوبصورتی اور دلکشی کی بجائے اندر کے مواد پر دھیان دیتے ہیں۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو رسالے کے اندر کے مضامین اور تخلیقات کے ساتھ ساتھ خوبصورتی اور دلکشی، ورق اور چھپائی پر بھی توجہ دیتے ہیں۔ اگر کاغذ اچھا ہوگا، چھپائی اچھی ہوگی تو قارئین اسے زیادہ لمبے عرصے تک محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ سرورق کی تصویر اگر عمدہ ہوتی ہے تو رسالے کی دیدہ زیبی اور خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ خاص طور سے اردو کے ادبی رسائل نے سرورق کی تصاویر کا خاصا خیال رکھا ہے۔ سرورق پر ہمیشہ ایسی تصاویر دی ہیں جو ہنوز ادب سے تعلق رکھنے والی خواتین اور مرد

حضرات اور عام پڑھے لکھے شخص کو پسند آئیں۔ کچھ رسائل کا مزاج رہا ہے کہ وہ سرورق پر کسی خاص ادبی شخصیت کی تصویر شائع کرتے ہیں۔ کچھ رسائل عام فطری وقدرتی مناظر کی تصاویر شائع کرتے ہیں۔ اگر تمام رسائل کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ سرورق پر شائع ہونے والی تصاویر میں معروف ادبی شخصیات کی تصاویر، قدرتی مناظر کی تصاویر، کسی اہم سیاسی شخصیت کی تصویر، پھولوں کی تصاویر، کسی عمارت کی تصاویر، ہندوستان کی دیہی زندگی سے متعلق تصاویر شامل رہی ہیں، پرانے رسالوں شاعر، سب رس، آجکل اور نیا دور کی بات کریں جو کہ آزادی کے قبل سے شائع ہورہے ہیں تو ان میں ہمیں اوپر ذکر کی گئی تمام طرح کی تصاویر دکھائی دے جاتی ہیں۔ شاعر، آجکل اور نیا دور ان تینوں رسالوں کا سائز ایک جیسا ہے جبکہ سب رس کا سائز تھوڑا کم ہوتا ہے۔ سب رس میں ادبی حوالے سے تصاویر نظر آتی ہیں۔ شاعر کے سرورق پر کسی اہم ادبی شخصیت کی تصویر شائع ہوتی ہے۔ آجکل اور نیادور چونکہ سرکاری رسالے ہیں اس لیے ان میں سرکاری معاملات اور پالیسیوں پر مبنی تصویریں شائع کی جاتی ہیں۔ سیاست، معیشت، دیہی وشہری زندگی کی عکاسی اور مختلف سرگرمیوں سے متعلق تصاویر بھی رسالوں کی زینت بنتی ہیں۔ اگر یہ رسالے کسی اہم شخصیت پر خصوصی شمارہ شائع کرتے ہیں تو اس کی تصویر سرورق کی زینت بنتی ہے۔ مثلا نیادور نے جس شخصیت پر بھی خصوصی نمبر شائع کیا ہے اس کی تصویر سرورق پر شائع کی ہے۔ آجکل میں بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ شاعر میں جب جب اہم گوشے شائع کیے جاتے ہیں تو شاعر کے سرورق پر اس تعلق سے تصاویر شائع ہوتی ہیں۔ایک اہم کالم اردو کی نئی بستیاں کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ ان تمام رسائل کے صفحات بڑے اور چھپائی واضح اورعمدہ ہوتی ہے۔ سب رس کی چھپائی مزید بہتر ہوسکتی ہے۔ اس اہم رسالے کے شروعاتی ادوار کے رسالوں میں کاغذ اچھانہیں استعمال کیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد شائع ہونے والے رسالوں میں سہ ماہی اردو ادب کا سائز پہلے بڑا ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کی جسامت تھوڑی چھوٹی ہوگئی اور یہ ڈیمائی سائز میں شائع ہونے لگا۔ اس میں کاغذ نہایت عمدہ استعمال ہوتا ہے اور چھپائی بہت واضح اوراعلیٰ درجے کی ہوتی

ہے۔ شب خون کی چھپائی کو بہت اچھا نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس میں کاغذ بھی اعلیٰ درجے کا نہیں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ رسالہ ادبی رسالوں میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس کے سرورق پر ادب سے متعلق تصاویر اور قلمکاروں کے نام اور کبھی کبھی موضوعات بھی درج ہوتے تھے۔ رسالہ کے بیک پر اشتہارات شائع ہوتے تھے۔ کتاب نما جسے چھوٹے سائز کا بڑا رسالہ کہنا مناسب ہوگا۔ یہ رسالہ ہرطرح سے نہایت عمدہ اور خوبصورت ودلکش ہے۔ اس کے سرورق پر اس ادبی شخصیت کی تصویر شائع ہوتی ہے جو اس مہینے کے شمارے کے لیے مہمان اداریہ تحریر کرتا ہے۔ اس کے بیک کور پر عموماً یونانی دواؤں اور سیرپ کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں یا مکتبہ جامعہ کی کتابوں کے اشتہارات۔ اس کا سائز اردو کے دوسرے تمام ادبی رسائل میں سب سے چھوٹا ہے لیکن یہ رسالہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ بہ آسانی اسے جیب میں رکھا جاسکتا ہے اور سفر میں اچھا ساتھی ثابت ہوسکتا ہے۔

ایوان اردو کے سرورق کے بعد والے صفحے پر ایک تصویر بلا عنوان شائع ہوتی ہے جس کے لیے قارئین سے عنوان یا شعر تجویز کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یہ تصاویر ایسی ہوتی ہیں جن میں ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ایوان اردو کے بیک کور پر سرود رفتہ کے عنوان سے پرانے شعرا کی غزل شائع کی جاتی ہے اور ساتھ میں شاعر کی تصویر مع تاریخ ولادت ووفات بھی شائع ہوتی ہے۔

اشاعت کا وقفہ

یوں تو اردو رسائل اپنی مقررہ مدت اشاعت میں شائع ہوجاتے ہیں لیکن یہ بھی المیہ رہا ہے کہ دیر سے شائع ہونے اور تین تین، چار چار شمارے مشترکہ شائع کرنے میں بھی آگے رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ ان کی اشاعت کچھ مدت کے لیے بند بھی ہوگئی ہے۔ ایسے رسالوں میں سب رس، آجکل، شاعر وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ نیادور، آجکل، سہ ماہی اردو ادب، کتاب نما، ایوان اردو کسی ادبی شخصیت پر خصوصی شمارہ شائع کرتے تھے تو اسے مشترکہ شمارے کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ شب خون اور ذہن جدید

کے شمارے وقت پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان دونوں رسالوں میں سے شب خون بند ہوچکا ہے لیکن ذہن جدید آج بھی رواں دواں ہے۔ ایوان اردو، آجکل، کتاب نما، شاعر اب وقت پر شائع ہورہے ہیں ان کی اشاعت مقررہ وقفے میں ہوجاتی ہے۔ جبکہ نیا دور کی اشاعت میں ابھی بھی ہرماہ تھوڑی تاخیر ہوجاتی ہے۔

حواشی

1. ڈاکٹر شریف الدین، اردو صحافت اور حسرت موہانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 155
2. ڈاکٹر مسکین علی حجازی، اداریہ نویسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، 1991 ص20
3. ایضاً، ص21
4. ایضاً، ص 21
5. ایضاً، ص 21
6. پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص156
7. اردو بک ریویو کے اداریے اور تجزیے، ڈاکٹر غضنفر اقبال، کاغذ پبلشرز، گلبرگہ، 2006، ص 14
8. ایضاً، ص 23-22
9. عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور 1963، ص192
10. ڈاکٹر مسکین علی حجازی، اداریہ نویسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، 1991، ص 241
11. ایضاً، ص 261
12. نورجہاں ثروت ''اردو صحافت میں اداریہ نگاری کی اہمیت'' اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ، اردو اکادمی دہلی، 2007 ص 115
13. فرحت احساس 'صحافت: پیشہ یا مشن'، اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ، اردو اکادمی، دہلی، 2007، ص 127
14. ماہنامہ شاعر، اداریہ جرعات، ممبئی، دسمبر 1966، ص6
15. ماہنامہ شاعر جنوری 1968، رفیع انیس، مکتوبات، ص 68

16. ماہنامہ شاعر اداریہ جرعات، ممبئی، دسمبر 1962، ص 9

17. ایضاً، مئی 1983 ،ص 6

18. ایضاً، جون 1987 ص6

19. ایضاً، اپریل 1994 ص4

20. ایضاً، مئی 1999، ص 4

21. ایضاً، اکتوبر 1999، ص 4

22. ایضاً، اگست 2000، ص6

23. ایضاً، اکتوبر 2000، ص 4

24. ماہنامہ، سب رس، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد، جنوری 1938، اداریہ، پیش لفظ، ص 7

25. ایضاً، جنوری 1947 ص 2

26. ایضاً، جنوری، فروری، مارچ 1994، ص 2

27. ماہنامہ آجکل، آزاد ہندوستان میں آجکل، اداریہ گاندھی نمبر، نئی دہلی، 1948 ،ص 3

28. ڈاکٹر جمیل اختر، اشاریہ آجکل، نئی دہلی، ص 52

29. ماہنامہ آجکل، مئی 1986 ،ص4

30. ایضاً، دسمبر 1990 ،ص 2

31. ایضاً، اکتوبر 2006 ،ص2

32. ایضاً، اگست 2004 ،ص2

33. ایضاً، جولائی 2009 ،ص2

34. ایضاً، اگست 2009 ص2

35. سہ ماہی اردو ادب، اداریہ حرف آغاز، جولائی 1950 ،ص8

36. ایضاً، شمارہ ایک، دو، اداریہ حرف آغاز، 1974 ،ص 14

37. ایضاً، شمارہ تین، چار، 1974 ، اداریہ حرف آغاز، ص4

38. ایضاً، شمارہ دو، تین، 1982 ،شمارہ، ایک، دو، 1983 ، اداریہ پیش لفظ، ص22

39. ایضاً، شمارہ، ایک،1999، اداریہ پہلا ورق،ص 7

40. ایضاً، شمارہ، دو،1999، اداریہ پہلا ورق،ص 10

41. ایضاً شمارہ، دو، 2000 ، اداریہ پہلا ورق،ص 11

42. ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، اشاریہ نیا دور، رامپور رضا لائبریری، رامپور، اتر پردیش، ص 49-48

43. ماہنامہ نیا دور،اداریہ، اپنی بات،فراق نمبر دوم،مئی جون جولائی 1984 لکھنؤ،ص3

44. ماہنامہ نیا دور، اداریہ، اپنی بات،مئی 1985 ،ص 2

45. ماہنامہ نیا دور، اداریہ اپنی بات،جون1990 ،ص 2

46. ماہنامہ نیا دور،اداریہ اپنی بات،نصف صدی نمبر،مارچ تا مئی،1999،ص 4

47. ماہنامہ نیا دور،اداریہ اپنی بات،شکیل بدایونی نمبر،ستمبر اکتوبر2009،ص 3

48. مضمون نیا دور اور اس کے مدیر، عابد سہیل،ماہنامہ نیا دور، جون تا اگست، 2006، ص 25

49. ماہنامہ کتاب نما،مہمان اداریہ،ستمبر 1988

50. ڈاکٹر شعیب رضا وارثی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی 1997 ص 96

51. محمد حسن فاروقی، اردو ذریعہ تعلیم اساتذہ اوروالدین کی ذمے داریاں،مہمان اداریہ، ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر نئی دہلی،ص6-5

52. شگفتہ طلعت سیما، اردو شاعرات رویے اور مسائل،مہمان مدیر، ماہنامہ کتاب نما،ستمبر 2002 ص 5-6

53. ڈاکٹر مہتاب امروہوی،کیا صحافت ادب کا حصہ نہیں، مہمان مدیر ماہنامہ کتاب نما جولائی 2006،ص10

54. جارج اسٹینر،ادب اور فحاشی، شب خون، مارچ اپریل،1977 ص2

55. ایف ایل لیوکس، شب خون، الہ آباد،مئی جون جولائی،1987،ص،1

56. ماہنامہ ایوان اردو، اداریہ، حرف آغاز، مئی 1990، ص 4

57. ماہنامہ ایوان اردو، اداریہ حرف آغاز، دہلی، اکتوبر 1990 ص 4

58. ڈاکٹر شعیب رضا وارثی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگرنئ دہلی 1997 ص 96

59. ماہنامہ ذہن جدید، اداریہ، جون تا اگست، 1994 ،ص 3

60. ایضاً، مارچ تا مئی،1994 ،ص 5

61. ایضاً، دسمبر 1993 تا فروری 1994،ص5

62. ایضاً، دسمبر 1998، تا فروری1999 ،ص 6-5

63. ایضاً، دسمبر 2007 تا فروری2008،ص5

64. ڈاکٹر شعیب رضا وارثی، آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگرنئ دہلی 1997 ص94

65. ڈاکٹر سید احمد قادری، اردو صحافت بہار میں، مکتبہ غوثیہ نیو کریم گنج گیا بہار2003، ص 222

66. شاہد کلیم (آرہ) اردو صحافت بہار میں، ڈاکٹر سید احمد قادری، مکتبہ غوثیہ نیو کریم گیا، بہار2003 ص220

67. ماہنامہ کتاب نما، کھلے خطوط، کالم، اکتوبر 2006، 86

68. ماہنامہ شاعر، علمی ادبی تہذیبی خبریں، رفتار، جون1966 ،ص65

69. ماہنامہ شاعر، علمی ادبی تہذیبی خبریں، رفتار، جنوری 1968 ،ص 66

عہد حاضر کے اہم رسائل و جرائد

آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت میں مختلف تجربے کیے گئے ہیں۔ زیادہ تر ادبی رسائل کسی نہ کسی تحریک، انجمن یا تنظیم سے وابستہ رہے ہیں یا ایک مخصوص موضوع، مواد اور دائرے کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اردو کی ادبی صحافت نے آزادی کے بعد اس لحاظ سے بھی کافی اہم مقام حاصل کیا کہ قاری کو اپنی دلچسپی اور موضوع کے اعتبار سے رسالے کا انتخاب کرنے کی آزادی تھی۔ کچھ اہم اور قابل ذکر رسالے ایسے بھی رہے ہیں جنھوں نے کسی تحریک اور کسی انجمن کا ترجمان بننے کی بجائے خالصتاً ادب کی خدمت کرنے کو ترجیح دی۔ ایسے رسالوں کی تعداد حالانکہ کم ہے لیکن ایسے رسائل نے صحافت، خاص طور سے اردو کی ادبی صحافت میں اپنا ایک منفرد معیار قائم کیا ہے اور ادب کی خدمت کرنے میں دوسرے رسائل سے کسی طور پیچھے نہیں رہے۔

رسائل کے خصوصی نمبر

اہم شخصیات پر خصوصی ضخیم نمبر شائع کرنا ادبی صحافت کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اہم شخصیات پر نمبر شائع کرنا اور پورا رسالہ ان کے نام سے شائع کرنا بھی ایک نیا تجربہ تھا جس

کی شروعات ممبئی میں صابر دت نے کی تھی۔ انھوں نے 1975 میں فن اور شخصیت کی شروعات کی تھی۔ اس رسالے نے غزل نمبر، جاں نثار اختر نمبر، فیض نمبر اور کملیشور نمبر جیسے یادگار اور اہم نمبرات شائع کیے تھے۔ صابر دت سے قبل بھی اردو رسائل میں خصوصی نمبر کسی اہم شخصیت پر شائع ہوتے رہے ہیں لیکن صابردت اس معنی میں قابل تعریف ہیں کہ ان کا ہر شمارہ ایک خاص شخصیت نمبر ہوتا تھا۔ پاکستان سے نکلنے والے رسالے نقوش کا بھی یہاں ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ اس کا بھی ہر شمارہ خصوصی نمبر ہوتا تھا۔

صابردت کی ہی طرز پر وقار قادری نے اعتراض کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا تھا جس کا پہلا شمارہ اپریل 2005 میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ پہلا خصوصی شمارہ ندا فاضلی نمبر تھا۔ وقار قادری نے اس پہلے شمارے میں اس سوال کا جواب بھی دیا ہے کہ آخر اعتراف کا پہلا شمارہ ندا فاضلی کے ہی نام سے کیوں شائع کیا جارہا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ندافاضلی موجودہ عہد کے ممتاز اور مقبول شاعروں میں سے ہیں جن کی تخلیقی کاوشوں نے بعد کی نسل کو کافی متاثر کیا ہے۔ ندا فاضلی بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن ان کے شعری اسلوب کا بھی جواب نہیں۔ وہ الیکٹرانک میڈیا، فلم اور ٹی وی سے بھی جڑے رہے ہیں۔ اس خصوصی نمبر میں ندافاضلی کے ادبی سفر کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تقریباً 50 برسوں کی ان کی طویل ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس خصوصی نمبر میں ندافاضلی کی اہم رنگین تصاویر کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ندا فاضلی پر وارث علوی، ڈاکٹر شمیم حنفی، بشرنواز، محترمہ رفیعہ شبنم عابدی، انورخاں، پروفیسر ظہیر علوی جیسے اہم ادیبوں نے کافی بہتر اور تنقیدی مضامین پیش کیے ہیں جنھیں پڑھ کر ندافاضلی کی شاعری اور ان کی نثر نگاری کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگا یا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انور ظہیر خاں، سلطان سبحانی، ڈاکٹر پریمی رومانی، پروفیسر قاسم امام، حامد اقبال صدیقی، یوسف ناظم، زبیر رضوی، رتن سنگھ، عتیق اللہ، سلام بن رزاق، علی احمد فاطمی اور اقبال رضوی کی تحریریں بھی ندافاضلی کے فن اور ان کی ادبی خدمات کا خاطر خواہ احاطہ کرتی ہیں۔ رسالہ 'اعتراف' کے آخری سو صفحات میں ندافاضلی کے مضامین، نثر و نظم، خطوط وغیرہ کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اعتراف کا پہلا خصوصی شمارہ تقریباً 450 صفحات پر

مشتمل ہے۔ اس کی قیمت 250روپے رکھی گئی تھی۔ اعتراف کے مدیران میں ڈاکٹر رام پنڈت، اسلم پرویز اوروقار قادری جیسے اہم ادب نواز شامل ہیں۔ اعتراف کے اس پہلے خصوصی نمبر پرتبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی (صدرشعبہ اردو انجمن کالج، بھٹکل (کرناٹک) لکھتے ہیں:

> ''اعتراف کا یہ ندا فاضلی نمبر، ندا کی شخصیت اورشاعری میں فضیلت کا جورنگ پایاجاتا ہے اس سے شرح وبسط کے ساتھ متعارف کراتا ہے اور آئندہ ندا کےفن پر کام کرنے والوں کے لیے دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک تاثر یہ بھی قائم ہوتا ہے کہ آج ندا فاضلی کی علمی وادبی سطح پر ہر ترقی، مادی عروج اورتمام کامیابیوں کے باوجود زندگی ان کے بس سرابوں کا سفر ہے۔
> زندگی جاگی ہوئی آنکھوں کا رنگین فریب... جوبھی گزرا وہ سرابوں کے سفر سے گزرا۔'' (1)

خصوصی نمبرات کی اپنی الگ پہچان رہی ہے۔ایسے ہی خصوصی نمبروں کے لیے رسالہ سہ ماہی 'ترکش' مشہوررہا ہے جوکلکتہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ 2004 میں شائع ہوا تھا۔ رسالے نے اپنی اشاعت کے ساتھ ہی ادبی حلقے میں کافی اہم مقام بنا لیا تھا۔ ترکش کے مدیر فراغ روہوی ہیں۔ترکش کی شروعات موجودہ دور کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے قدامت پسندی سے الگ ہوکرایک انفرادیت کی شکل میں کی گئی تھی۔ترکش کوعصری ادب کا بے باک ترجمان کہاجاتا ہے۔ ترکش کو جدید ترٹکنالوجی کی مدد سے خوبصورت اور دیدہ زیب بنانے کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ ترکش کے خصوصی نمبروں میں جاویددانش نمبر کا ذکر کیاجاسکتا ہے۔ یہ نمبر جنوری تا مارچ 2005 میں شائع ہوا تھا۔ ترکش کے اس خصوصی نمبر میں جاوید دانش کی شخصیت وفن پر مشتمل 64اہل قلم کی نگارشات کوشامل کیاگیا ہے۔ ان مضامین میں جاوید دانش کی شاعری، دیارغیر میں اردو کے لیےان کی خدمات اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ سہ ماہی رسالوں میں ترکش کا

ایک الگ اورمنفرد مقام ہے۔ یہ رسالہ آج بھی ادب کی خدمت کرنے میں پیش پیش ہے۔

اکیسویں صدی کے کچھ اہم رسائل و جرائد

21ویں صدی میں یوں تو بڑی تعداد میں اردو کے رسائل شائع ہورہے ہیں۔ ان رسائل میں بڑی تعداد ایسے رسالوں کی ہے جو پہلے سے ہی نکل رہے ہیں اور کچھ گنے چنے رسائل ایسے ہیں جن کی شروعات 20ویں صدی کے آخری برسوں میں ہوئی ہے۔ ایسے رسائل میں عارف اقبال کا اردو بک ریویو،ممبئ کا ماہنامہ تحریرنو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عارف اقبال نے اردو بک ریویو کی شروعات 1995 میں کی تھی۔ یہ رسالہ اپنے منفرد تحقیقی مشمولات اور تبصروں کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس رسالے نے اپنی انفرادیت بہت مختصر وقت میں قائم کردی تھی اورآج بھی یہ رسالہ اردو کی خدمت کرنے میں دوسرے رسائل سے کچھ معاملوں میں بہت آگے چل رہاہے۔ عارف اقبال کی علمی بصیرت اور صحافتی ہنرمندی کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔ عارف اقبال نے یہ ثابت کردیا ہے کہ کم پیسوں میں بھی معیاری رسالہ نکالا جاسکتا ہے۔ اردو میں حوالوں، تبصروں اورخصوصی طور پر ریسرچ اسکالرز کے لیے وقف اپنی طرز کا یہ واحد رسالہ ہے۔ یوں تو یہ رسالہ ماہنامہ ہے لیکن مالی پریشانیوں کے باعث اس کی اشاعت میں تاخیر ہوتی رہتی ہے۔ بسااوقات یہ رسالہ 2 مہینوں اورکبھی کبھی تین مہینوں میں مشترکہ طور پر شائع ہوتا ہے۔ رسالے کے مدیر جناب عارف اقبال سے میں نے ملاقات کی اوران سے رسالے کی غرض وغایت پر کافی تفصیلی گفتگو کی۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو میں اس طرز کے رسالے کی ضرورت طویل عرصے سے محسوس کی جارہی تھی، اس لیے ہم نے اس کی شروعات کی۔ یہ رسالہ کسی تحریک یا انجمن سے وابستہ نہیں ہے بلکہ خالصتاً اردو کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ عارف اقبال اس معاملے میں قابل تعریف ہیں کہ خالصتاً اردو ادب کا طالب علم نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اردو کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ دوسرے اردوداں حضرات کے لیے ایک سبق ہے۔ عارف اقبال نے ثابت کردیا ہے کہ اردو کی خدمت کرنے کے لیے اردو کا درد اور خلوص ہونا چاہیے۔ ضروری

نہیں کہ اردو کا پروفیسر یا اردو کی انجمن ہی اردو کی خدمت کریں۔ اردو بک ریویو کے علاوہ عارف اقبال ایشیا کے عظیم جاسوسی ناول نگار ابن صفی کے ناولوں کو باوقار انداز میں شائع کرنے کے لیے جانے جاتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی شروعات نئے ہنگاموں اورجدید ٹکنالوجی کی سوغات لے کر آئی۔ بیسویں صدی کے اواخر اوراکیسویں صدی کے اوائل میں منظر عام پرآنے والے رسائل کی ایک بڑی تعداد ہے۔ یہ رسائل ہرموضوع پر شروع کیے گئے تھے۔ ادبی رسائل، سماجی رسائل، سیاسی رسائل۔ ان کے علاوہ مختلف قارئین کی پسند کو دھیان میں رکھتے ہوئے رسائل کی شروعات کی گئی تھی۔اسلامی رسائل،بچوں کے رسائل، خواتین کے رسائل، فلمی رسائل، طبی رسائل، مزاحیہ رسائل اور دوسرے موضوعات پرمبنی رسائل بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسلامی رسائل میں اسلامی موضوعات اورمضامین کااحاطہ کیاجاتا ہے۔ اسلامی رسائل میں کچھ اہم نام یہ ہیں۔ دعوت، الجمعیۃ، الحسنات، تجلی، اسلام اورعصرجدید وغیرہ۔

نعرۂ تکبیر: اسلامی رسالوں میں ایک نام ماہنامہ نعرہ تکبیر دہلی کا ہے جس کی شروعات 2004 میں کی گئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر افروز عالم قاسمی ہیں۔ اس کے صفحات کی تعدادتقریباً 40 ہوتی ہے۔اس اسلامی مجلّے میں درس قرآن وحدیث، محفل سیرت النبیؐ جیسے اہم موضوعات پر موادنظرآتے ہیں، ساتھ ساتھ طب وصحت، مجاہدین آزادی کا تعارف، پکوان،تعبیرخواب، اورادبی لطیفے بھی شامل ہوتے ہیں۔اس رسالے کا نام سن کر ذہن میں جوشبیہ ابھرتی ہے وہ خالص مذہبی اوراسلامی رسالے کی ہوتی ہے۔لیکن اس میں ادبی اورسماجی مضامین بھی شامل ہوتے ہیں اور ایک عام قاری کی دلچسپی کاسامان بھی ہوتا ہے۔یہ رسالہ الہند تعلیم جدید فاؤنڈیشن، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی سے نکلتا ہے۔ یہ رسالہ الہند تعلیم جدید فاؤنڈیشن کا ترجمان ہے اور اس میں اس ادارے کے متعلق کافی اشتہارات بھی شائع کیے جاتے ہیں۔

مژگاں: ادبی رسائل میں ایک اہم نام کولکاتا سے نکل رہے سہ ماہی مژگان کا لیاجاسکتا ہے۔ اس سہ ماہی رسالے کے مدیرنوشادمومن ہیں۔ یہ کافی ضخیم مجلّہ ہے اورآئے دن اہم ادبی

شخصیات پر اہم نمبر بھی شائع کرتا رہتا ہے۔ اس رسالے کا شمارہ جولائی تا دسمبر 2005 گوشہ نصر غزالی پر مبنی ہے۔ اس شمارے کو محترمہ خورشید جہاں نے ترتیب دیا ہے۔ اس میں مظفر حنفی، نور الہدیٰ، ظہیر صدیقی، ظہیرانور، راشد انور راشد وغیرہ کے مضامین وتبصرے شامل ہیں۔ مژگان کے کالموں میں لاگ لپیٹ کے بغیر اور اکیسویں صدی کے روشن چراغ قابل ذکر ہیں۔ ان کالموں میں تبصرے اور اہم نئے شعرا کی تخلیقات پیش کی جاتی ہے۔

اردو کونسل پمپری چنچوڑ کا مجلّہ پمپری (چنچوڑ) مہاراشٹر سے شائع ہونے والا سالانہ مجلّہ ہے۔ اس کا پہلا شمارہ 1999 میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ مجلّہ اردو کونسل پمپری چنچوڑ مہاراشٹر کا ترجمان ہے۔ اس ادارے کی مختلف کارکردگیوں کی جھلک عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ ادارہ جدید تعلیم وتربیت، انٹرنیٹ ایجوکیشن، کمپیوٹر تعلیم کے لیے کافی کوشش کررہا ہے۔ اس ادارے کے مجلّے کی ادارت قاسم زبیری کے ہاتھوں میں ہے اور اس کی معاون مدیرہ ایس ایم شیخ ہیں۔

ماہنامہ نقوش عالم: ماہنامہ نقوش عالم بنگلور سے شائع ہورہاہے۔ یہ رسالہ دارالعلوم محمدیہ کا ماہانہ اصلاحی اورفکری ترجمان ہے۔ اس رسالے کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی اور مدیر ڈاکٹر محمد فاروق اعظم قاسمی ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ 1990 میں شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ آج بھی علم ومعرفت کے میدان میں روشنی بکھیر رہاہے۔ اس کے اہم قلم کاروں میں خوشتر نورانی علیگ اور یعقوب سروش اہم ہیں۔ موضوعات کا تنوع اس رسالے کو اور بھی منفرد اور ممتاز بناتا ہے۔ فروری، مارچ 2006 کا شمارہ مشترکہ شائع ہوا تھا جس میں خوشتر نورانی علیگ کا ایک اہم مضمون 'جہاں کی خاک سے انساں بنائے جاتے ہیں' شائع کیا گیا تھا۔ اپریل 2006 میں خصوصی شمارہ مدارس نمبر شائع ہوا تھا۔

کل اور آج کے فنکار: گوالیار سے شائع ہونے والا ادبی ماہنامہ 'کل اور آج کے فنکار' اس معاملے میں منفرد ہے کہ اس میں قدیم اور جدید رنگ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ادبی فن اور فنکاری سے متعلق موضوعات کو خاص جگہ دی جاتی ہے۔ اس رسالے کی شروعات 2002 میں کی گئی تھی۔ اس کے مدیر قمرالدین برتر ہیں۔ ویسے تو یہ مجلّہ کافی کم صفحے کا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود

اس میں اقبال انصاری، شرون کمار ورما، نادم بلخی، آنند لہر، تاباں ضیائی اور ابراہیم اشک جیسے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شامل ہوتی ہیں۔

رنگ و بو: حیدرآباد سے ماہنامہ رنگ وبو شائع ہورہا ہے۔ جس کے مدیر مجتبیٰ فہیم ہیں۔ خالص ادبی رسالہ ہے اس کے قلم کاروں میں وزیر آغا، تو قیر عباس، بیکل اتساہی، ابراہیم اشک، ظہیر غازی پوری، مظہرالزماں خاں، سعید رحمانی اور ڈاکٹر م۔ق۔سلیم جیسے افراد شامل ہیں۔ ماہنامہ رنگ وبو کا نومبر 2005 میں اطیب اعجاز نمبر شائع ہوا تھا۔

تحقیقاتِ اسلامی: علی گڑھ سے سہ ماہی تحقیقات اسلامی جنوری 1982 میں شروع کیا گیا تھا۔ جسے معروف عالم دین اور اسلامی اسکالر مولانا جلال الدین عمری نے جاری کیا تھا۔ اس رسالے میں اسلامی تعلیمات، اختلافی مسائل، تفسیر، حدیث، تصوف، تاریخ ومعاشیات کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ پر بھی کافی مواد شائع کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ علمی وتحقیقی مقالات بھی اس رسالے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

اسباق: ماہنامہ اسباق کی شروعات 1980 میں ہوئی تھی۔ یہ رسالہ اپنے خالص ادبی مزاج کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس کے مدیر نذیر فتحپوری ہیں۔ یہ ماہنامہ پونے سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں غالب، اقبال، انیس کے مطالعات، علی گڑھ تحریک جیسے موضوعات پر تحقیقی مقالات شائع ہوئے ہیں۔ جولائی 2005 تا دسمبر 2005 میں اس رسالے کے 25 سال پورے ہونے پر اس کا سلور جوبلی نمبر شائع کیا گیا تھا۔ اس رسالے میں ترجمے بھی شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ آج بھی مہاراشٹر کے ادبی رسالوں میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔

طوبیٰ: جامعہ ابن تیمیہ کا ترجمان ماہنامہ طوبیٰ چمپارن سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ 2001 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے مدیر محمد راشد المدنی تھے۔ ابھی کچھ دنوں سے اس رسالے کے ادارتی فرائض جناب ظل الرحمٰن نبھا رہے ہیں۔ دینی مدارس اور اسلام سے متعلق عصری موضوعات کے علاوہ مسلمانوں کی تعلیم وتربیت اور جدید تعلیمات سے متعلق کافی موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔

ادب ساز: سہ ماہی ادب ساز کی شروعات اپریل 2006 سے کی گئی تھی۔ اس کا پہلا شمارہ اپریل

تا جون 2006 پر مبنی تھا۔ اس کے مدیر معروف طنز ومزاح نگار نصرت ظہیر ہیں۔ یہ رسالہ کافی ضخیم ہے اور اس میں ادب او ر موجودہ مناظر کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس پہلے شمارے میں حمایت علی شاعر اور سید محمد اشرف کے گوشے کے ساتھ ساتھ امرتا پریتم پر مختصر گفتگو، تہذیبی مکالمہ اورتصادم،سوانحی ناول، سفرنامہ، آپ بیتی اورطنز ومزاح غرض کہ ادب کے ہرگوشے کی خوبصورت اور بہترنمائندگی کی کوشش کی گئی ہے۔ نصرت ظہیر معروف صحافی ہیں اورانھیں اردوزبان وادب پرکافی دسترس حاصل ہے۔ ان کے مضامین روزنامہ راشٹریہ سہارا کے علاوہ دوسرے اخبارات ورسائل میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ موجودہ عہد میں طنز ومزاح لکھنے والوں میں نصرت ظہیر کو اہم مقام حاصل ہے۔

گل بوٹے: ممبئ سے ادب اطفال کے فروغ کے لیے ماہنامہ گل بوٹے کی شروعات 1996 میں کی گئی تھی اس کے مدیر فاروق سید ہیں۔ انھوں نے بچوں کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے رسالے کو خوبصورت اوردلچسپ بنانے کی ہرممکن کوشش کی ہے۔ اس مجلّے میں کارٹون، مضامین، کہانیاں، اور گیت وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیرملکی مصنّفین کے ناول بھی شامل اشاعت ہوتے ہیں۔ جے کے رولنگ کی ہیری پورٹر سیریز کا اردو ترجمہ بھی اس رسالے میں شائع ہورہاہے۔

یوجنا اردو: ماہنامہ یوجنا وزارت اطلاعات ونشریات کے تحت اور پبلی کیشنز ڈویژن کے زیراہتمام ملک کی بارہ زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ یہ منفرد رسالہ اردو کے علاوہ انگریزی ہندی، آسامی، گجراتی، کنٹر، ملیالم، مراٹھی، تمل، اڑیا، پنجابی اور تیلگو زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ یہ سرکاری رسالہ ہر خاص وعام میں یکساں طور پرمقبول ہے۔ اس مجلّے کی حیثیت دستاویزی ہے اس کا انگریزی اور ہندی ایڈیشن تقریباً 53 برس پہلے شروع کیا گیا تھا لیکن اردو ایڈیشن کی شروعات یکم اپریل 1981 میں کی گئی تھی۔ جنوری 2007 میں ماہنامہ یوجنا نے اپنی پچاسویں سالگرہ گولڈن جوبلی منائی تھی۔ ماہنامہ یوجنا میں معیشت، بجٹ، سیاست، سماجی، دیہی وشہری زندگی، ملک کی صورتِ حال پراچھا خاصا مواد شائع ہوتا ہے یہ اپنی طرز کا واحد رسالہ ہے۔ مسابقتی امتحانات کی تیاری کرنے والوں کے درمیان یہ رسالہ خصوصی طور پر

مقبول ہے۔ ملک کے ترقیاتی منصوبوں، تجارتی و صنعتی پروگراموں، اقتصادیات، تاریخ، فلسفہ، تہذیب وتمدن، سائنس، ماحولیات، انسانی حقوق، ادب اور کتابوں پر تبصرے کے ساتھ ساتھ اور بھی دوسرے موضوعات پر مبنی مضامین یوجنا میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ واحد رسالہ ہے جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق تمام مضامین اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح کا دوسرا رسالہ اردو میں نہیں ہے۔ یوجنا کے مدیر ابرار رحمانی اور عابد کرہانی قابل ستائش ہیں کہ اردو میں اس طرح کے موضوعات کو نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کے مجلّے کی جو خصوصیات ہونی چاہیے وہ سب اس رسالے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ رسالے کی قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں اس لیے اسے بآسانی خریدا جاسکتا ہے۔ بھلے ہی اس میں ادب کے حوالے میں مضامین یا نگارشات کم ہوتی ہوں لیکن ایک عام قاری کو حکومت کی مختلف اسکیموں، منصوبوں اور ملک کی زراعتی صورتِ حال اور دیگر حالات سے واقف کرانے میں یہ رسالہ بہت حد تک کامیاب ہے۔ مختلف موقع کی مناسبت سے یہ رسالہ خصوصی نمبر بھی شائع کرتا ہے۔ اس رسالے کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس رسالے میں جموں وکشمیر کے حوالے سے خصوصی گوشہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کیریئر گائیڈنس، کمپیوٹر ٹکنالوجی، واٹر پروجیکٹ، سیاحت، ایجادات، قومی یکجہتی، گاندھیائی فلسفہ، آزادی ہند، بیمہ صنعت، میڈیا، حفظان صحت، خواتین کا تحفظ، حقوق اطفال، حق اطلاعات کا قانون، بین الاقوامی تجارت، زرعی صنعت کچھ ایسے اہم موضوعات ہیں جن پر اکثر اس رسالے میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

جہانِ کتب: ماہنامہ جہان کتب ایک ساتھ تین زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اس کی شروعات جولائی 2004 میں معروف صحافی اور ادیب محمد عارف اقبال نے کی تھی۔ لگاتار دو سال تک انھوں نے رسالے کی ادارت بحسن وخوبی انجام دی۔ جون 2006 میں ان کی ادارت میں اس رسالے کا آخری شمارہ شائع ہوا تھا۔ عارف اقبال کے بعد ادارت محمد ناصر خاں اور فاروق ارگلی سنبھال رہے ہیں۔ یہ رسالہ کچھ وقفے کے بعد سے لگاتار شائع ہو رہا ہے۔ رسالے کے خصوصی نمبرات کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ محمد عارف اقبال کی ادارت میں

رسالے کے دوخصوصی نمبر شائع ہوئے تھے۔ اپریل 2007 میں رسالے کا رحمت للعالمین نمبر شائع ہوا جو اپنی نوعیت کا دستاویزی شمارہ تھا۔ اس اہم خصوصی نمبر میں حضور اکرمؐ سے متعلق کافی اہم مضامین مثلاً محسن انسانیت، داعی اعظم کی مثال، نورنبوت، سرور کائناتؐ کا سفرنامہ حج، سرکار دوعالم کا آخری حج، دربار نبوت کی حاضری جیسے اہم اور تاریخی مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔

ماہنامہ بزم ادب: اس رسالے کی شروعات 1997 میں ہوئی تھی یہ رسالہ خواتین کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں خواتین قلم کاروں کی تخلیقات ہی شائع ہوتی ہیں۔ اس رسالے کی شروعات معروف شاعر وتنقید نگار خلیل الرحمٰن اعظمی کی اہلیہ نے کی تھی۔ یہ رسالہ آج بھی شائع ہورہاہے۔موجودہ دور میں رسالے کی مدیرہ راشدہ خلیل ہیں۔ یہ سالانہ جریدہ ہے اور خواتین کے مختلف موضوعات پر مبنی تحریریں مردوں کو بھی دلچسپی لینے پر مجبور کردیتی ہیں۔یہ اپنی طرز کا منفرد رسالہ ہے جس میں صرف خواتین کی تحریروں کو شامل اشاعت کیا جاتا ہے۔

جہان غالب: یہ غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی کا ششماہی جریدہ ہے۔ اس کا پہلاشمارہ مئی 2006 میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کا دوسرا شمارہ نومبر 2006 میں اور تیسرا شمارہ مئی 2007 میں شائع ہوا تھا۔ غالب کے کلام پر تحقیقی مضامین کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اس رسالے میں معروف محققین اور ناقدین کی تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ اسے اعلیٰ درجے کے تحقیقی مجلوں کی فہرست میں رکھا جاسکتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سہ ماہی جریدے غالب نامہ کی طرز پر ہی اس رسالے کی شروعات کی گئی ہے۔ غالبیات کی تفہیم میں یہ رسالہ کافی سرگرم کردار ادا کررہاہے۔ اس رسالے کے مضامین تین حصوں، تفہیم غالب، فکر غالب، اور نثر غالب میں تقسیم ہوتے ہیں۔ان موضوعات کے تحت غالبیات پر اعلیٰ درجے کی تخلیقات اور تنقیدی نگارشات شائع کی جاتی ہے۔

سہ ماہی نئی کتاب: اس کا پہلا شمارہ مارچ، اپریل، مئی 2007 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس رسالے کے مدیر شاہد علی خاں ہیں اور جوائنٹ ایڈیٹر ایس اے رحمٰن۔ شاہد علی خاں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ کتاب نما کی ادارت کرتے ہوئے اور بطور جنرل منیجر گزارا ہے۔ انھیں

ادارت کا کافی طویل تجربہ ہے۔ انھوں نے اس تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئی کتاب کی شروعات کی ہے۔ یہ رسالہ کافی جاذب نظر ہے اس کے مشمولات مجموعی طور پر متاثر کن ہیں۔میں نے شاہد علی خاں سے ملاقات کرکے اس رسالے کی غرض وغایت پر گفتگو کی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ رسالہ دوسرے رسالوں سے کسی حد تک منفرد ہے۔ اس میں سبھی طرح کی تخلیقات کو جگہ دی جاتی ہے۔اس رسالے کا مقصد ہے کہ نئے لکھنے والے قلم کاروں کو پرانے اور بڑے ادیبوں کے درمیان متعارف کرایا جائے۔

جہانِ اردو: اردو زبان کا ایک اہم رسالہ سہ ماہی جہان اردو بہار کے مشہورومعروف ادبی شہر دربھنگہ سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ اردو ادب میں تحقیق وتنقید اور تاریخ کے حوالے سے کافی اہم مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اس رسالے کے مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد ہیں۔ یہ رسالہ عصری اردو ادب کا بہترین ترجمان ہے۔ اس رسالے کے اہم قلم کاروں میں شہاب ظفراعظمی، ڈاکٹر ابوبکر رضوی وغیرہ شامل ہیں۔ اس رسالے کے کالموں میں جہان تنقید وتحقیق، جہان تلخ وشیریں، خصوصی مطالعہ، جہان فسانہ، جہان شعرا ور جہان کتب شامل ہیں۔ رسالے میں ڈاکٹر مشتاق احمد کے مضامین اورتبصرے کافی علمی بصیرت لیے ہوتے ہیں۔

ترجمان اسمبلی: ترجمان اسمبلی کی شروعات بہار قانون ساز اسمبلی کے ترجمان رسالے کے طور پر ہوئی تھی۔ بہار قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر اُدے نارائن چودھری کی سرپرستی میں اس ششماہی رسالے کی شروعات کی گئی تھی۔ اس کا پہلاشمارہ مارچ، 2006 میں منظر عام پر آیاتھا۔ اس رسالے کے چیف ایڈیٹر برج کشور پربھات، مدیر محمد زبیل اور معاون مدیر ڈاکٹرنسیم اختر ہیں۔ رسالے میں بہار قانون ساز اسمبلی سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی گوشہ بھی شائع کیاجاتا ہے۔ بہار میں اردو زبان کی ترویج وترقی کے حوالے سے بھی کافی مواد رسالے کواہم اورممتاز بناتا ہے۔

نوائے ادب: ممبئی سے شائع ہونے والا سہ ماہی نوائے ادب کافی اہم اورمشہور رسالہ رہا ہے۔ یہ تقریباً 50برسوں سے لگاتار شائع ہوتا آرہاہے۔اس رسالے کے کارگزار مدیر شمیم طارق

ہیں۔ جولائی سے ستمبر 2006 کے شمارے میں اولیائے کرام کے ملفوظات پر کافی اہم مواد شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں عبدالقادر جیلانی کی شاعری کی خصوصیات، خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کی علمی وادبی وراثت، خاندان برکات کے مصنّفین اور تصنیفات کا اشاریہ، خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب کلام کی حقیقت،'ہند ایرانی تہذیب میں مچھلی' اور'اردو میں وہابی ادب' جیسے اہم مضامین نے شمارے کی قدر و قیمت اور بہتری میں چار چاند لگادیے ہیں۔

دوماہی ظرافت: اس رسالے کی شروعات 2005 میں بنگلور میں ہوئی تھی۔ اس کے مدیر عظیم الدین عظیم ہیں۔ جولائی اگست 2006 میں رسالے کا ساتواں شمارہ شائع ہوا ہے۔ شمارے میں خاکے، گلہائے رنگا رنگ، تبصرے، تاثرات کے علاوہ بچوں کے کالم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔موسیقار نوشادعلی اور انور مینائی کی وفات پر خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ظرافت پر مشتمل تحریریں قارئین کے لیے بڑے اچھے انداز میں پیش کرتا ہے جس کے لیے اس رسالے کے مدیر عظیم الدین عظیم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ماہنامہ ذکریٰ جدید: اس مذہبی اور معاشرتی رسالے کی شروعات رامپور میں ہوئی تھی لیکن بعد میں یہ رسالہ 2004 سے دہلی سے شائع ہونا شروع ہوگیا۔ جماعت اسلامی ہند کی مرکزی شوریٰ کے رکن مولانا یوسف اصلاحی اس رسالے کے مدیر ہیں۔نومبر 2006 میں اس رسالے کا 32واں شمارہ شائع ہوا ہے جو اسلام کا خاندانی نظام نمبر ہے۔اس شمارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجاہد الاسلام قاسمی، محمد یوسف اصلاحی کے اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں۔مغرب کا خاندانی نظام ٹوٹ چکا ہے۔خاندانی تعلقات کے آداب، والدین کے حقوق اور اولاد کے فرائض اور اولاد کے حقوق، والدین کے فرائض اسلام کا خاندانی نظام، عورت اور اسلام، نکاح اسلام میں، کفو برادری اور جہیز، خاندانی منصوبہ بندی جیسے اہم اور معلوماتی مضامین کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ اس اہم شمارے کے مطالعے سے اسلام کے خاندانی نظام اور اہم معاملات سے متعلق مسائل کو سمجھنے اور بآسانی حل کرنے میں مدد ملے گی۔

سہ ماہی احوال وآثار: اس رسالے کا آغاز جولائی 1994 میں ہوا تھا۔ اس کے مدیر مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی ہیں۔ یہ رسالہ حضرت مفتی الٰہی بخش اکادمی، مولویان، کاندھلہ،

ضلع مظفر نگر سے شائع ہوتا ہے۔ شمارے میں اسلامی مفسرین اور اکابرین کی قیمتی اور نایاب تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ جنوری تا مارچ 2008 کے شمارے میں ''دل زخم زخم لوگو، کوئی ہے جسے دکھائیں'' کے عنوان پر دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے سربراہ اور ناظم اعلیٰ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے انتقال پر اداریہ تحریر کیا گیا ہے۔ مضامین کے حصے میں شاملی، تھانہ بھون اور مظفرنگر کی کچھ بستیوں میں 1857 کے جہاد اور معرکہ آرائی کی روداد کو شائع کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اسلامی تحقیق وتنقید اور مدارس اسلامیہ اور عصری تعلیم وتربیت اور موجودہ اسلامی نظام پر نہایت اہم اور دقیق مضامین شائع کرتا ہے۔

ماہنامہ شگوفہ: یہ رسالہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔ یہ ایک طنزیہ ومزاحیہ رسالہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ہیں۔ یہ کافی پرانا اور اہم رسالہ ہے جسے شائع ہوتے تقریباً 40 سال ہوگئے ہیں۔ زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان اس رسالے میں اعلیٰ درجے کی شگفتہ اور مزاحیہ تحریریں شامل اشاعت ہوتی ہیں۔ مجلس ادارت میں حمایت اللہ۔ طالب خوندمیری، ڈاکٹر حبیب ضیا شامل ہیں۔ مجلس مشاورت میں، نریندرلوتھر۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ایم اے باسط، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، محمد علی رفعت، جیسے قابل اور اہم طنز ومزاح نگار ہیں۔ اس رسالے کی فہرست کو بھی مزاحیہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ شمارے کے قلم کاروں کو 'اس تھیلی کے چٹے بٹے' کا نام دیا گیا ہے تو منظومات کو 'چورن' لکھا گیا ہے۔ اہم قلمکاروں میں مجتبیٰ حسین، سید نصرت، یوسف مرزا، اطہر فاروقی وغیرہ ہیں۔ شمارے کے سرورق پر لکھا گیا یہ شعر رسالے کو اور بھی جاذب بناتا ہے:

پت جھڑ کی رت میں کاغذی پھولوں کے درمیاں
میں ہی تو ایک پھول بچا ہوں گلاب کا
سیاح دور دور سے آتے ہیں دیکھنے
پتھریلے شہر میں وہ اکیلا درخت ہے (2)

حیدرآباد سے نکلنے والا یہ طنزیہ ومزاحیہ رسالہ اس معنی میں منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں طنز ومزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ادب کی چاشنی بھی برقرار ہے اور ہم تھیلیوں

کے چٹوں بٹوں کے چورن کی وجہ سے مسکراتے ہوئے اردوادب کی شیریں زبانی سے محظوظ ہوتے رہے ہیں۔

ماہنامہ امکان: اس رسالے کا پہلا شمارہ مشترکہ تھا جونومبر، دسمبر 2000 میں شائع ہواتھا۔ تقریباً 100 صفحوں پر مشتمل یہ رسالہ ادبی حلقوں میں کافی ممتاز ہے۔ اس رسالے کی سرپرستی معروف شاعر ملک زادہ منظورکرتے ہیں۔ مدیر معاون۔پرویز ملک زادہ۔ قاضی ممتاز علی، شاہد وحید ہیں۔اس رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف شاعر ڈاکٹر گلزاردہلوی کہتے ہیں کہ رسالہ ہرلحاظ سے تمام ادبی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔کفیل آزر کا خیال ہے کہ رسالے کا معیار اس میں چھپنے والی تخلیقات سے طے کیا جاتا ہے۔ امکان ایک خوبصورت رسالہ ہے اور اس میں چھپنے والی تخلیقات معیاری ہیں۔ جبکہ ملک زادہ منظور اپنے رسالے کے تعلق سے کہتے ہیں:

> ''زیادہ ترار دورسالے بڑے ناموں کو جگہ دیتے ہیں مگر امکان میں چھپنے والے زیادہ تر مضامین نظمیں،غزلیں،افسانے نئے اور ابھرتے ہوئے اردو کے ان فنکاروں کے ہوتے ہیں جو گاؤں یا اپنے شہر یا قصبہ میں رہ کر اردو ادب کی خدمت کررہے ہیں۔امکان کے صفحات پر نئے کے ساتھ ساتھ پرانے چراغ بھی روشن ہوئے ہیں جن کی روشنی سے اردو ادب منور ہورہا ہے۔''(3)

عرفان صدیقی۔منور بستوی،ظہیرا حمد صدیقی،عرفان احمد، پروفیسر سید عقیل، اطہررحمانی، ظفر گورکھپوری جیسے اہم شعرا و ادبا کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔اس رسالے کے اہم کالموں میں کسک،عرفان، درپن، میزان، الجھن، تنظیم، چلمن، نیرنگ، سفر، سروکار، نظرپارے شامل ہیں۔

ماہنامہ 'شاندار': اسے مشہور ادیب جناب نیاز جیراج پوری شائع کررہے ہیں۔یہ رسالہ اعظم گڑھ اترپردیش سے شائع ہوتا ہے۔ اس ادبی رسالے میں کہنہ مشق شاعروں اورادیبوں کے ساتھ ساتھ نو آموز شعرا اورنثر نگاروں کی نگارشات بھی شائع ہوتی ہیں۔ اس رسالے کا

ایک مشہور کالم 'کل کا ستارہ' ہے جس میں ابھرتے ہوئے نئے شاعر کے کوائف اور غزلیں شامل اشاعت ہوتی ہیں۔

کچھ اہم رسائل

ماہنامہ 'لاریب' لکھنؤ (مدیر: رشید قریشی)، ماہنامہ 'گونج' نظام آباد، ماہنامہ 'لمس کی خوشبو' گولکنڈہ (مدیر: اطیب اعجاز)، پندرہ روزہ 'سیکولر محاذ'، پٹنہ، (مدیر: ریاض عظیم آبادی)، پندرہ روزہ 'وسیلہ' کڈپہ وغیرہ اہم رسائل ہیں۔

انشا: کلکتہ سے شائع ہونے والا دوماہی رسالہ 'انشا' بہت اہم ہے اور گزشتہ 29 برسوں سے ادب کی خدمت کررہا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ 1985 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے مدیر معروف شاعر ونثر نگار ف س اعجاز ہیں۔ یہ رسالہ جدید اور قدیم ادب کے ساتھ ساتھ موجودہ منظر نامہ پر مبنی مضامین بھی شائع کرتا ہے۔ رسالے کا اداریہ کافی اہم اور مقبول ہے اس کے اداریوں میں معاشرے کے حالات، سیاست، شعر وادب کے موجودہ منظرنامے، کے علاوہ فلموں، موجودہ ترسیلی نظام جیسے موضوعات کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے۔ انشا کے سرورق پر بھی ایک غزل یا نظم شائع کی جاتی ہے۔ رسالہ بڑے سائز میں نہایت جاذب نظر ہوتا ہے۔ اس کے مدیر جناب ف س اعجاز کو لوک لیکھک سمان ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ اردو ادب کے لیے مغربی بنگال میں جناب ف س اعجاز نے کافی محنت کی ہے۔ ان کی اردو نظموں کا بنگالی اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔

'انشا' نے مختلف ادوار میں کئی اہم نمبرات شائع کیے ہیں۔ عالمی اردو افسانہ نمبر، بابری مسجد نمبر اور گفتنی نمبر بہت مقبول ہوئے ہیں۔ گفتنی نمبر میں گزشتہ 23 برسوں کے اداریوں کا انتخاب شائع ہوا ہے۔ ان اداریوں میں نہایت اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اداریوں کو پڑھ کر کوئی بھی ادبی ذوق وشوق رکھنے والا شخص ف س اعجاز کی قلمی وادبی صلاحیت کا قائل ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ ان اداریوں میں پروردگار شعلے، ہمارے وزیراعظم کے کپڑے، آج کے مشاعرے، عشق بن یہ ادب نہیں آتا، جرم کی رفتار، نظریہ اور قیادت کی

ضرورت، انتخابی پھنسیاں، سلسلہ عراق کا، بدھادیب کی حقیقت پسندی، 26/11 اور پندرھویں لوک سبھا، عالمی اردو افسانے کا عالم، برطانیہ میں اردو کی بقا کا مسئلہ، اختر الایمان، جدیدیت کے تناظر میں وغیرہ موضوعات پر مبنی یہ اداریے ادب کے ساتھ ساتھ ملکی وغیر ملکی منظرنامے کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ ف س اعجاز کے اداریے بڑے ہی چبھتے ہوئے اور دوٹوک ہوتے ہیں ان کا قلم بڑے ہی بے باک انداز میں تبصرے کرتا ہے۔ روزنامہ سیاست کے سلیمان اطہر جاوید اپنے کالم ادبی ڈائری میں لکھتے ہیں:

> ''انشا کے اداریوں کی خصوصیت اس کے مدیر ف س اعجاز کا جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنایا ہوا دوٹوک رویہ ہے۔ وہ غیر معمولی معروضیت کے ساتھ اور تکلف برطرف والے پیرایہ میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنوں کی دکھتی رگوں پر بھی ہاتھ رکھتے ہیں اور دوسروں کی کوتاہیوں اور خامیوں کو بھی آئینہ دکھائے جاتے ہیں۔ ان کی نظر بلند اور فکر عمیق ہے۔ وہ موضوع اور متعلقات موضوع کا نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ تجزیہ کرتے ہیں اور جو بات کہتے ہیں خدالگتی۔ ہمارے یہاں یوں نڈر اور بے خوف ہوکر مصلحتوں کو خاطر میں لائے بغیر لکھنے والے تھے اور ہیں ضرور لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ ف س اعجاز نے آئین جواب مرداں حق گوئی و بے باکی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے صحافت کی ذمہ داری فرض شناسی اور صحافت کی جن اقدار کی توضیح وتشریح کی ہے وہ صحافت کی اعلیٰ اقدار پر پورے اترتے بھی ہیں۔'' (4)

دوماہی انشاء میں افسانے، خودنوشت، شعری نگارشات، سفرنامے اور احوال واخبار کے عنوان سے ادبی وغیر ادبی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ف۔س اعجاز نے اردو صحافت کی ترقی کے سفر میں ایک بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی صحافتی لیاقت وصلاحیت سے انشا کو بین الاقوامی معیار عطا کیا ہے۔ انشاء کے مطالعے اور ان کے اداریے گفتنی کے مطالعے سے ان کی صحافتی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ف۔س اعجاز ایک ایسے ادبی صحافی

ہیں جنھیں اردو ادب وصحافت کے ساتھ ساتھ ملکی وغیر ملکی حالات وواقعات کا بھی پورا علم ہے اورانھیں مختلف ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر بھی دسترس حاصل ہے۔ ادبی رسائل کا ایک ٹرینڈ یہ ہے کہ وہ ادب سے باہر نہیں نکلتے اورایک محدود دائرے میں ہی بند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک عام اردو قاری کی دلچسپی کی چیزیں خالص ادبی رسائل میں نہیں کے برابر ہوتی ہیں۔ لیکن انشاء میں ان روایتوں کے برخلاف صحافت کے فن کے اعتبار سے مختلف مواد ومضامین کو شامل کیا جاتا ہے جو اس رسالے کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ادب کسی سماج سے الگ نہیں ہے اور سماج ومعاشرے ہی ہمیں ادب کا درس دیتے ہیں۔ سماج ومعاشرے کے بغیر خالص ادب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ عام قاری کی دلچسپی کی چیزیں۔ مثلاً حالات حاضرہ، خبریں، طلبا سے متعلق نگارشات، مزاحیہ مضامین، تصاویر وغیرہ شائع کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اور انشا میں یہ سب کچھ شائع کیا جاتا ہے۔ انشاء کے گفتنی نمبر پر سلیمان اطہر جاوید تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غرض کیفیت اور کمیت دونوں زاویوں سے انشاء کے گفتنی نمبر کی اہمیت ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ادبی جرائد کے یہاں بھی یہ رنگ ملتا ہو لیکن بیشتر کے پاس اداریوں کی یہ خوبی نہیں پائی جاتی۔ ایسے مدیروں کو گفتنی نمبر کا مطالعہ ضروری ہے تا کہ انھیں معلوم ہو کہ حق وصداقت کس کا نام ہے، جرأت وبے باکی کس کو کہتے ہیں اور بے خوف و نڈر ہونا کیا ہے؟ اگر ہمارے چند مدیران کے رویہ میں بھی تبدیلی آجائے اوروہ اپنی آواز بلند کریں تو یہ ان کے لیے فال نیک ہوگا ہی انشاء کے مدیر ف۔س اعجاز کی کامیابی بھی ہوگی۔'' (5)

اردو رسائل وجرائد کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ایک اہم بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ کسی ادارے یا علمی درسگاہ سے نکلنے والے جریدے نے بھی اردو کی ادبی صحافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ درسگاہ کا ادبی مجلّہ سالانہ شائع ہوتا ہے۔ اور اس میں اس ادارے کے نئے قلمکاروں اور اساتذہ کی تحریروں کو شامل اشاعت کیا جاتا ہے۔ ایسے

رسالوں نے اپنی ایک منفرد شناخت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس طرح کے رسالوں میں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد آگے چل کر اہم اور مایہ ناز ادیبوں میں شمار کی گئی ہے۔ ایسے اہم رسالوں میں دہلی یونیورسٹی کا سالانہ مجلّہ، جامعہ ملیہ کا سالانہ مجلّہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سالانہ مجلّہ اہم اورقابل ذکر ہیں۔ ایسے جریدوں میں ایک اہم جریدے کا اضافہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سالانہ مجلّے کے طور پر ہوا ہے جس میں اساتذہ اورطلبا کی تحریریں شامل ہیں۔

ہندوستانی زبان: یہ سہ ماہی رسالہ ہے جوممبئ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اکتوبر 1969 میں منظر عام پرآیا تھا۔ یہ ایک تحقیقی رسالہ ہے جو ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شائع ہوتا ہے۔مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹرممبئ کا ترجمان یہ رسالہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی معیاری مضامین پیش کرتا رہاہے۔ جولائی،ستمبر 2010 پرمبنی تازہ شمارے میں اردوصحافت کاقومی کردار (ڈاکٹرلطیف سبحانی) مولانا ابوالکلام آزاد کاتعلیمی نظریہ،عصری معنویت ڈاکٹرمجیر احمد آزاد، اردو کا پہلا شرح نگار نقاد(داؤ دکشمیری) جیسے اہم تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ اس رسالے کے مدیران ڈاکٹر ستیلا گپتا اورمحمد حسین پرکار ہیں۔ رسالے کے ہندی زبان کے حصے میں ہندی صحافت، زبان وادب سے متعلق بیش بہا مضامین ہیں۔ یہ رسالہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی میں بھی اہم کردار اداکررہا ہے۔ عام روایتی رسائل سے قطع نظر یہ رسالہ ایک محدود حلقے میں کافی مقبول ہے۔ ادب کے سنجیدہ قاری کو یہ رسالہ اردو زبان وادب کے گمنام گوشوں کی سیر کراتا ہے۔

گلبن: ثریا ہاشمی اورسید ظفر ہاشمی کی ادارت میں دوماہی رسالہ گلبن جنوری 2003 سے لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا۔ اس سے قبل یہ رسالہ احمد آباد سے شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ تقریباً 33برسوں سے شائع ہورہا ہے۔ پہلے ماہانہ تھا لیکن 1987 میں اسے دوماہی کردیا گیا۔ رسالے میں ادبیات کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کا بھی ایک کالم ہے جو رسالے کو مزید خوبصورتی بخشتا ہے۔ رسالے میں افسانے، غزلیں، مضامین وغیرہ شامل اشاعت کیے جاتے ہیں۔ رسالے میں گلبن کے قارئین کی آراء کوبھی شامل کیا جاتا ہے۔جس سے یہ

بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اردو کے قاری گلبن کو نہایت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

ترسیل: یہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ برائے فاصلاتی تعلیم، سری نگر کا سالانہ ادبی و تحقیقی مجلّہ ہے۔ پروفیسر ریاض پنجابی وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کی سرپرستی میں شائع ہونے والا یہ مجلّہ اردو اور فاصلاتی تعلیم کے موضوعات پر اعلیٰ پائے کے مضامین شائع کرتا ہے۔ پروفیسر سفینہ، الطاف انجم اور عصمت آرا اس مجلّے کے مدیران میں شامل ہیں۔

صدا: کشمیر سے ہی بین الاقوامی 'صدا' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ شائع ہوتا ہے جس کی مدیرہ سیدہ نسرین نقاش ہیں۔ یہ رسالہ بھی اپنے مضامین، افسانوں اور غزلوں و نظموں وغیرہ کے لیے کافی مقبول ہے۔ کلچرل سوسائٹی سری نگر کا ترجمان یہ رسالہ کشمیر میں اردو زبان وادب اور تمدن کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتا آرہا ہے۔

یہ صبح: یہ ادبی سہ ماہی رسالہ ہے جس کی شروعات جنوری تا مارچ 1998 کے شمارے سے ہوئی تھی۔ اس کے مدیر سید نوشاد علی اور مرتب ارتضیٰ کریم تھے۔ پہلے شمارے کے اداریے نوید صبح میں مدیر لکھتے ہیں:

> ''ادبی رسالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نئے ادبی رسالے کی اشاعت کبھی نوید صبح ہوتی تھی فی زمانہ کسی رسالے کی اشاعت کے فوراً بعد یہ خیال اور سوال سر اٹھاتا ہے کب تک؟ اردو میں رسالوں کی ولادت اور وفات کا سلسلہ اس قدر سنگین اور تیز ہے کہ یہ سوال اتنا غیر فطری بھی نہیں ہے۔ ہم بھی یہ صبح کی نوید صبح لے کر اس عزم کے ساتھ آپ کے سامنے آئے ہیں کہ اسے مسلسل جاری رکھنے کی سعی کریں گے۔ لیکن کیا یہ آپ کے تعاون کے بغیر ممکن ہے؟ ہمیں آپ کے مشورے اور معاونت کی ضرورت ہے۔ اس کے سہارے ہم اپنی صبح کو خوشگوار تازہ دم اور بامقصد بناسکیں گے۔ کسی نے کہا بھی ہے۔ Morning shows the day سو آیئے ہم ادب میں ایک نئی صبح کا استقبال کریں اور اس کے مزید تابناک ہونے کی مل جل کر کوشش کریں۔ سید نوشاد علی۔'' (6)

یہ صبح کا پہلا شمارہ تقریباً 275 صفحات پر مبنی تھا۔ شمارے میں بحث خیز، بازیافت، خصوصی گوشہ، دوسری زبانوں سے، اس شمارے کی شخصیت، مقالے، افسانے، شعروسخن، محاسبے اور ادبی سماج کے عنوان سے کالم ہیں۔ یہ رسالہ ادبی رسالوں سے کسی حدتک منفرد ہے۔ اس کے کالم ہی اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ رسالے کو بہت سوچ سمجھ کر اور ادب کی صورتِ حال کا بہ نظر غائر مطالعہ کرکے نکالا گیا ہے۔ بازیافت کے تحت فراق گورکھپوری کے افسانے شائع کیے گئے ہیں۔ فراق سے لوگ ایک اچھے شاعر کے طور پر واقف ہیں۔ لیکن بطور افسانہ نگار ہم میں سے کم لوگ ہی جانتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادب کا بھی رسالے میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہد رزمی لکھتے ہیں:

> ''زیر تبصرہ رسالہ ادبی سہ ماہی یہ صبح شمارہ نمبر 1 جنوری تا مارچ 1998 ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مشمولات آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ علاوہ بریں مصاحبے اور ادبی سماج جیسے گوشے رسالے کو نہ صرف عصری معنویت بخشتے ہیں بلکہ ایک نئی طرح کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ مقالے، افسانے، شعروسخن اور تبصرے اعلیٰ ذوق کے غماز ہیں۔ غرض یہ ہے کہ رسالہ یہ صبح دریا کو کوزے میں بند کرنے کا عمل ہے۔''(7)

سہ ماہی استعارہ: اس رسالے کی شروعات جولائی اگست ستمبر 2000 سے ہوتی ہے۔ بیاد سراج منیر اور ادب کے سناٹوں کو توڑتی ہوئی تیسری آواز کے طور پر شروع کیے گئے اس رسالے کے مدیران میں محمد صلاح الدین پرویز اور حقانی القاسمی کا نام شامل تھا۔ رسالے کی شروعات میں ہی یہ اعلان کردیا گیا تھا کہ یہ رسالہ ہرقسم کی ادبی سیاست سے پاک ہے اور اردو ادب پر طاری جمود کو ختم کرنے کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ ترقی پسند اور جدید شاعروں وقلم کاروں کو رسالے میں جگہ دی گئی ہے۔ دیوندر اسر، محمود ہاشمی، وہاب اشرفی، وارث علوی، مشرف عالم ذوقی، ابوالکلام قاسمی، گوپی چند نارنگ، نندکشور وکرم، ترنم ریاض اور وزیر آغا جیسے اہم ناقدین، افسانہ نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات نے رسالے کو جدت، علمیت اور ایک نیا حسن عطا کیا ہے۔ استعارہ کے مدیر رسالے کے متعلق لکھتے ہیں:

''کوئی پوچھتا ہے کہ ادب کا سناٹا کیا ہوتا ہے؟ تو کسی کی یہ پکار سنائی پڑتی ہے کہ تیسری آواز کیا بلا ہے؟ادب کے ان اندھے کوروؤں کو کوئی کیا بتائے کہ جب دور دور تک کوئی پکار سنائی نہیں دیتی تو صرف سناٹے کی حکمرانی ہوتی ہے اور جب لہروں کی بھیڑ میں وہ ''بڑی موج'' جو دکھائی نہیں دیتی اسے دریافت کرلیا جائے تو وہ تیسری آواز ہوتی ہے اور وہی 'روح عصر' کہلاتی ہے۔کیا اردو میں صرف اجہل الجاہلین ہی رہ گئے ہیں۔کیا ان لوگوں نے غالب کو بھی نہیں پڑھا جنھیں قطرے میں بھی دجلہ نظر آتا تھا اور ہمیں تو گنگا میں بھی نہر فرات کی پکار سنائی دیتی ہے۔

استعارہ نہ قطرہ ہے، نہ گنگا ہے، یہ دجلہ،نہر فرات اور سرسوتی ہے،جب گنگا جمنا کا سنگم ہوتا ہے،تو خاموشی سے ایک ندی اور آکے مل جاتی ہے جو سرسوتی کہلاتی ہے، جسے آج تک کوئی تلاش نہیں کر پایا لیکن یہ ہوتی ضرور ہے۔یہی دجلہ،فرات،یہی سرسوتی تو تیسری آواز ہے۔

استعارہ تیسری آواز کا ترجمان صرف اس معنٰی میں ہے کہ اس کا کسی گروہ سے کوئی نظریاتی انسلاک نہیں۔ہم ادب کو ایک کھونٹے میں باندھنے کے خلاف ہیں۔ڈنگر یا جانور نہیں کہ ایک ہی کھونٹے میں بندھے رہیں۔'' (8)

استعارہ نے جدید رجحانات کے سرد ہونے کے بعد ادب پر طاری جمود کو کم کرنے کی کوشش کی۔ استعارہ نے نئے پرانے اور آزمودہ قلم کاروں کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ استعارہ نے اپنے پہلے ہی شمارے سے ہندوستان و پاکستان میں قارئین کا ایک بڑا حلقہ بنا لیا تھا۔ استعارہ کے قابل مدیر صلاح الدین پرویز اور حقانی القاسمی نے رسالے کو جاذب نظر اور دوسرے رسالوں سے ممتاز بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ رسالہ کافی ضخیم تھا اور تقریباً 430 صفحات پر شائع ہوتا تھا۔اس رسالے نے اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

مباحثہ: ادبی اعتبار سے نہایت زرخیز صوبہ بہار سے شائع ہونے والے رسالے میں مباحثہ

کافی مقبول عام رسالہ ہے۔ یہ رسالہ چار مہینوں کے وقفے پر شائع ہوتا ہے۔لیکن رسالے کا 33واں شمارہ اگست تا دسمبر 2009 پر مشتمل مشترکہ شمارہ شائع ہوا ہے۔ وہاب اشرفی اس کے مدیر رہے ہیں اور ہمایوں اشرف معاون مدیر کی ذمے داریاں نبھا رہے ہیں۔ پٹنہ سے شائع ہونے والے اس رسالے کو اردو کے عظیم قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ رسالے میں اعلیٰ درجے کے تحقیقی وتنقیدی مضامین، افسانے اورغزلیں ونظمیں شائع کی جاتی ہیں۔ اس شمارے میں مشتاق صدف، احمد سجاد، ظہیر انور، عبدالصمد، پروین شیر، اقبال مجید، معصوم عزیز کاظمی، وہاب اشرفی، عطاعابدی، ناوک حمزہ پوری جیسے شعرا وادبا کی تخلیقات شامل اشاعت کی گئیں ہیں۔ رسالے کے مشمولات اورترتیب دیکھ کر وہاب اشرفی کی تنقیدی صلاحیت کے ساتھ ساتھ صحافتی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔ وہاب اشرفی نے ادب کے مختلف حلقوں اور مختلف رجحانوں سے قطع نظر اردو ادب اور زبان میں خالص علمی وتنقیدی مجلّہ پیش کیا۔''غزل ہے شرط'' رسالے کا ایک اہم کالم ہے۔ جس کے تحت غزلوں کے منتخب اشعار کو شائع کیا جاتا ہے۔ ادبی رسالوں میں یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ اس سے کسی شاعر کے اہم خوبصورت اورسنجیدہ اشعار کو ایک ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ رسالے کے اداریے میں عام طور پر رسالے کے مشمولات کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ رسالے میں شائع ہونے والے خطوط میں بھی قارئین اپنی بے لاگ رائے لکھتے ہیں اور اسے بھی وہاب اشرفی من وعن شائع کرتے تھے۔ وہاب اشرفی کا یہ رسالہ ادبی صحافت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ معراج احمد معراج مباحثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مباحثہ کے کچھ شماروں کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ اس معیار کے رسائل ہندوپاک سے بہت کم ہی نکل رہے ہیں۔ اس خالص ادبی رسالے میں سارے مشمولات انتہائی معیاری اور پرمغز ہوتے ہیں جب مدیر ہی ایک قابل اور معتبر ونکتہ رس انسان ہیں تو ان کا رسالہ کیوں نہ بلند مرتبے کا ہوگا۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ شب خون میں شامل اشاعت ہوکر فخر محسوس کرتے تھے

اور ایک یہ زمانہ ہے کہ شاعر وادیب مباحثہ میں چھپنے کے متمنی ہیں۔'' (9)

وہاب اشرفی کا اداریہ اتنا جامع اور مبسوط ہوتا تھا کہ قاری مباحثہ کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہوجائے۔ اداریے میں مدیر جس انداز میں مختلف قلم کاروں کی تخلیقات پر تبصرہ پیش کرتے تھے وہ وہاب اشرفی جیسا ناقد اور صحافی ہی کرسکتا تھا۔ کم الفاظ میں کسی تحریر پر ایسا تبصرہ پیش کرنا، جس سے قاری متاثر ہوجائے ادب میں ایک آرٹ کی حیثیت رکھتا ہے، وہاب اشرفی اس فن سے پوری طرح واقف رہے اور اسے بڑے اچھے انداز میں برتتے آئے ہیں۔ وہاب اشرفی اور ہمایوں اشرف کی کوششوں سے مباحثہ ادبی رسائل میں اپنا منفرد مقام بنا چکا ہے اور ادب کے سنجیدہ قارئین میں یہ رسالہ کافی مقبول ہے۔ صوبہ بہار سے شائع ہونے والے رسائل میں اس کا اپنا معیار ہے جو اسے دوسرے ادبی رسالوں میں ممتاز بناتا ہے۔

ماہنامہ سبق اردو: گوپی گنج بھدوہی سے شائع ہونے والے اس رسالے کا پہلا شمارہ جولائی 2004 میں منظرعام پر آیا تھا۔ رسالے کے مدیر دانش الہ آبادی ہیں۔ دانش الہ آبادی، شمس الرحمٰن فاروقی سے اپنی شاعری کی اصلاح کراتے رہے ہیں۔ وہ ہندی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اردو زبان وادب کی محبت سے منہ نہیں موڑ سکے۔ پہلے پہل انھوں نے روشن چراغ کے نام سے ایک اردو ماہنامہ شروع کیا جو زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ بعد میں انھوں نے ادب کے صالح ترجمان کے طور پر 'ماہنامہ سبق اردو' کی شروعات کی جو اب بھی جاری ہے۔ رسالے کی شروعات پر مبارکباد دیتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ نوجوان اور ہونہار ادیب اور شاعر دانش الہ آبادی گوپی گنج بھدوہی سے سبق اردو نام کا علمی اور ادبی پرچہ نکال رہے ہیں، اس میں شگفتہ اور فائدہ بخش تحریروں کو شائع کیا جائے گا۔ اور غیر متعصّبانہ مذہبی، اسلامی تحریریں بھی ہوں گی، رسالہ نکالنا تو آسان ہے مگر اسے اچھے معیار کے ساتھ کچھ مدت تک سہی لیکن پابندی سے جاری رکھنا مشکل ہے۔ اس وقت تو ہمارے یہاں درجنوں رسالے نکل رہے ہیں۔ مگر پھر

بھی کوئی اچھا رسالہ نکلے تو اپنی جگہ بنالے گا۔ مجھے یقین ہے کہ سبق اردو

مفید اور کامیاب رسالہ ثابت ہوگا۔'' (10)

ماہنامہ سبق اردو کے مشمولات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رسالے کو ادب کے عام قاری سے لے کر اردو ادب کے طالب علموں کی ضرورتوں کو خیال میں رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے۔ رسالے میں اہم قلم کاروں کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کو موقع دیا جانا بھی رسالے کے مدیر کے عقل ودانش کو ظاہر کرتا ہے۔ رسالے میں اردو ادب کی تمام اصناف کے ساتھ ساتھ معلومات افزا مضامین بھی شائع کیے گئے ہیں۔ پہلے شمارے میں مکاتیب غالب، غالب کی قصیدہ گوئی، نذیر احمد بحیثیت ایک فنکار، سرسید کی ظرافت نگاری جیسے نادر مضامین شامل اشاعت ہیں جبکہ سعادت حسن منٹو، ویریندر پٹواری، یٰسین احمد اور ترنم ریاض کے افسانے بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ شاعری کے حصے میں بیکل اتساہی، کلیم بہرائچی، جمیل فاطمی، ڈاکٹر فراز حامدی اور عطاء الرحمٰن طارق جیسے شعرا کو جگہ دی گئی ہے۔

ادبی رسائل کی ضرورت و اہمیت

یوں تو ملک کے طول وعرض سے سیکڑوں اردو رسالے شائع ہو رہے ہیں لیکن ان میں ایسے رسالے کم ہیں جو ادب کے سنجیدہ قاری کو اردو ادب وزبان سے متعلق معیاری اور اعلیٰ درجے کے تنقیدی وتحقیقی مضامین فراہم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اردو رسالے شروعات تو بہت دھوم دھام سے کرتے ہیں اور بڑے ناقدین اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات شائع کر کے رسالے کو مقبول اور بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن کچھ شماروں کے بعد ان کا رنگ پھیکا ہونے لگتا ہے اور وہ اپنے معیار کو برقرار نہیں رکھ پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی رسالے بہت جلد دم توڑ دیتے ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ ادبی رسائل کے ساتھ سرکولیشن سے جڑا ہوا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں سے نکلنے والے رسائل بھی بہت محدود افراد تک پہنچ پاتے ہیں۔ بہت سارے افراد رسالہ پڑھنے کے متمنی تو ہوتے ہیں لیکن رسالہ وہاں پہنچ نہیں پاتا ہے۔ ابھی تک ہندوستان میں ادبی رسائل کی خراب صورتِ حال کو بہتر

بنانے سے متعلق کچھ خاص کوششیں بھی نہیں کی گئیں ہیں۔ جبکہ اس سمت میں کوششیں کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

کسی بھی رسالے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ رسالے کی غرض وغایت، مقاصد اور اس سلسلے میں تمام تر تحقیقات کرلی جائیں اور قاری کی عین پسند کے مطابق مجلّہ جاری کیا جائے۔ اس میں اہم اور دلچسپ گوشوں کا خاص خیال رکھا جائے، تب ہی وہ مجلّہ یا جریدہ کامیاب ہوگا۔ اردو کے مجلوں اور رسائل کی کامیابی اورترقی کے لیے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اس کی سرپرستی قبول کی جائے، ایسے رسالوں کے سالانہ خریدار بنائے جائیں۔ آج کی صورتِ حال دیکھ کر بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو ایک ایک کرکے تمام رسالے دم توڑ دیں گے۔ اردو کے قاری جو بآسانی دوچار اردو رسالوں کے خریدار بن سکتے ہیں وہ بھی اردو کے رسالے کو مفت اور تحفتاً حاصل کرکے پڑھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ جتنی قیمت وہ رسالوں کی اداکریں گے اس سے کہیں زیادہ پیسے ایسے قارئین کے بچے اپنے موبائل اورانٹرنیٹ اوردوسری غیرضروری اشیا اورکاموں پر خرچ کردیتے ہیں۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اردو جرائد ورسائل سے اس طرح بے اعتنائی برتی جارہی ہے جبکہ ان کے گھروں میں روزانہ ٹائمس آف انڈیا اور ہندوستان ٹائمس پہنچتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انگریزی اخبارات کا معیار اچھا ہوتا ہے لیکن کم از کم یہ سوچ کر کہ اردو اخبارورسائل کی مدد ہی کریں۔ اردو کے نام پر چار پیسہ خرچ کردیں ہم ایسا نہیں کرپاتے۔ جو اس لائق نہیں ہیں بات ان کی نہیں ہے بلکہ جوقارئین اس قابل ہیں کہ وہ اتنا خرچ برداشت کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ بھی اردو کے رسائل واخبارات کوخرید کر پڑھنے کی بجائے مانگ کر پڑھنے پر ترجیح دیں تو افسوس ہوتا ہے، اردو کا دم بھرنے والے لوگ ہی جب اردو کی دشمنی پر کمر بستہ ہوں تو کیا کہا جا سکتا ہے۔ اردو کے مستقبل اوراردو کے نام پر آنسو بہا دینا اورسمیناروں، پروگراموں میں طویل مقالے پڑھ دینے، تقاریر کردینے سے اردو کا حق ادانہیں ہوجاتا ہے۔ اگر ہمیں اردو کو زندہ رکھنا ہے، تو ہمیں خود ہی اس کو سینچنا ہوگا، اس کی حمایت کے لیے آگے آنا ہوگا۔ اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اس

سمت میں سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی، تب ہی ہم اردو کو اس کا جائز حق دلانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اردو زبان کی آبیاری کے لیے اردو قاری سے جو بھی ہوسکے اسے ضرور کرنا چاہیے۔کم از کم اردو کا ایک رسالہ جاری کرائے، ایک اخبار خرید کر پڑھے۔ اس کے علاوہ کوشش کی جائے کہ دوسرے افراد بھی اردو کی سمت راغب ہوں۔تبھی ہم اردو کو ایک کامیاب اور ترقی یافتہ جدید زبان بنانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

بات چاہے اردو رسائل کی ہو یا اردو اخبارات کی آج ہرجگہ کشمکش اور انتشار برپا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص سچی کوشش بھی کرتا ہے تو لوگ اسے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہوتی ہے لیکن اس کی خامیوں کے لیے اس کی اچھائیوں کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے اس لیے ہمیں چاہیے کہ ایسے افراد کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کی کوششوں میں خود بھی شامل ہوں اوردوسروں کو بھی شامل ہونے کی دعوت دیں۔

اردو زبان آج رابطے کی زبان ہے۔ دنیا کے تقریباً سبھی اہم مقامات پر اس زبان کے بولنے اورسمجھنے والے موجود ہیں۔ بس آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود اس زبان کے تحفظ میں سامنے آئیں، آگے آئیں اورہمیں خود ہی عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ اردو کے نام پر اپنی دوکان چمکانے والوں کوبھی اس سمت میں دھیان دینے کی ضرورت ہے۔کچھ اخبار کے مالکان ایسے بھی ہیں جو اشتہارات اور سرکاری امداد کے لیے اخبار کوجاری رکھے ہوئے ہیں۔ایسے اخباروں میں خبروں کا معیار اچھا نہیں ہوتا اور اس میں کام کرنے والے افراد کوبھی اتنی کم تنخواہ دی جاتی ہے کہ اس میں ایک شخص کا خرچ چلنا بھی مشکل ہے لیکن دوسری طرف اسی اخبار کا مالک کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی یہ بے حسی ہے کہ وہ اردو کے نام پر دولت سمیٹ رہے ہیں۔ اشتہارات اورگرانٹ کی مدد سے ایک مہینے میں لاکھوں روپے کما رہے ہیں لیکن اپنے یہاں کام کرنے والوں کو اپنے ڈرائیور سے بھی کم تنخواہ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے ضمیر سے سوال کرنا چاہیے کہ اپنے اداریوں میں تو وہ اردو کا رونا روتے ہیں اور مضامین میں اردو کی ترقی کی

بات کرتے ہیں۔ سمیناروں میں اردو کی ناکامی اور اردو کے پچھڑے پن کا رونا روتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اپنے قول و فعل میں کتنے سچے ہیں۔ بڑے بڑے لیڈروں، وزیروں کی سرپرستی میں رہ کران کے ساتھ تصویریں کھنچوالینا بہت آسان ہے۔ کچھ قریبی تنظیموں کی مدد سے دوچار ایوارڈ حاصل کرلینا تعریف کی بات نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کو احساس ہونا چاہیے کہ وہ اپنے کام میں کس قدر سنجیدہ ہیں۔انھیں ذرا بھی احساس جرم یا احساس ندامت نہیں ہوتا کہ وہ اردو کے نام پر جو دولت بٹور رہے ہیں وہ کس قدر جائز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سارے لوگ ایسے نہیں ہو سکتے، چند لوگوں کی وجہ سے ہم سبھی کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے، ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ زیادہ تعداد اردو کے لیے بے لوث اور سچی خدمت کرنے والوں کی ہے۔ مجھے خود بھی امید ہے کہ اردو کے تئیں ایسے افراد کی خدمت سے ایک دن اردو ایسے مقام پر پہنچ جائے گی کہ ملک کے طول وعرض میں اردو کا بول بالا ہوگا اور اردو کی تعلیم حاصل کرنا فخر کی بات سمجھی جائے گی۔

اردو زبان میں یوں تو مختلف موضوعات پر کئی رسائل موجود ہیں لیکن ان میں بہت کم ہی ایسے ہیں جو قارئین کے ادبی ذوق پر پورے اترتے ہیں اور قارئین کی بہتر ڈھنگ سے ادبی تشکیل کرپاتے ہیں۔ اگر ہم ادبی رسائل پر نظر ڈالیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادبی رسائل میں بھی کافی خامیاں موجود ہیں۔ کچھ گنے چنے رسائل ہی ہیں جو ادب و زبان کی سچی خدمت کررہے ہیں اور کامیابی کی راہ پر رواں دواں ہیں، ورنہ زیادہ تر رسالے تو کسی نہ کسی تحریک یا انجمن سے وابستہ ہیں اور دوسرے رسالوں یا محققین کو خود سے کمتر سمجھتے ہیں نیز ادب سے نیچے اتر کر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ادب کے نام پر بے ادبی کا وہ ہنگامہ کھڑا کرتے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ خطوط اور جوابات در جوابات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑتا ہے اور آخر میں مدیر کو معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ براہ کرم اب یہ سلسلہ بند کریں۔ یہ صحیح ہے کہ ادبی بحث ومباحثوں کا ادب وزبان کی ترقی میں اہم کردار رہا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے درمیان بحث ہو یا ماہنامہ شاعر کے صفحات پر گوپی چند نارنگ کا مکالمہ یا پھر گیان چند جین

کی ایک بھاشا دو لکھاوٹ اور بعد ازیں شمس الرحمٰن فاروقی اور دوسرے ناقدین کا جواب۔ ظاہر ہے کہ ادب میں ایسی باتیں زیب نہیں دیتی ہیں لیکن ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اس طرح کی بحثوں سے کہیں نہ کہیں ادب کو فائدے بھی ہوئے ہیں اور ان بحثوں نے نئی تحقیقات کے لیے راہیں بھی ہموار کی ہیں۔ لیکن جب اسی طرح کی بحثیں ادب کے صفحات سے نکل کر ذاتیات کا احاطہ کرنے لگیں تو ایسی بحثیں کہیں نہ کہیں اردو کی ترقی میں روکاوٹ بھی کھڑی کرتی ہیں۔

اگر ہم اردو کی تاریخ کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو کو تحریکوں سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔ علی گڑھ تحریک، ترقی پسندی، جدیدیت اور اب مابعد جدیدیت نے ادب کو کافی کچھ دیا ہے جس پر ہم اردو والوں کو فخر ہوسکتا ہے۔ ادب کے ایسے قیمتی شہ پارے منظر عام پر آئیں تو اردو ادب کو ناز ہوگا لیکن جب یہی تحریکیں ادب اور زبان کی خدمت سے الگ ہو کر ذاتیات اور ایک دوسرے کو ہدف بنانے لگتی ہیں تو ایسی تحریکیں یقیناً ادب کے لیے نقصان دہ ہیں۔ ادب اور خاص طور سے اردو کے لیے موجودہ دور سخت اور دشوار ہے۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی حالت بہتر ہے اور اس میں ترقی ہورہی ہے لیکن ہم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اردو کا گزشتہ دور بہت زیادہ اچھا تھا جب پورے ملک کے کونے کونے میں اردو بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی تھی اردو کے سیکڑوں اخبارات ورسائل جاری تھے لیکن آج کا زمانہ بالکل مختلف ہے اور ابھی ہمیں اردو کے تئیں بہت سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بیدار ہوکر اردو کے حق میں آواز بلند کرنی ہوگی، اپنے حق کے لیے آگے آنا ہوگا، اس زبان کی جھوٹی ترقی کے نام پر اس کا استحصال کرنے سے باز آنا ہوگا، تب ہی ہم اردو کو اس کا جائز حق دلا سکیں گے۔ زبانی جمع خرچ سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ہے۔ ہم اپنے آپ سے سوال کریں کہ ہم خود اردو کی ترقی کے لیے کتنے سنجیدہ ہیں اور عملی طور پر کیا کر رہے ہیں۔ اس کا جواب ہی ہمیں اردو کی ترقی کی راہ ہموار کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

موضوع اور زبان

صحافت اورادب ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ان کے درمیان رابطے کے موضوع پر کافی کچھ لکھا جاچکا ہے۔ ادب کے بغیر ہم صحافت کومکمل نہیں کہہ سکتے اورصحافت میں اگر ادب کا عنصر شامل نہ ہوتو وہ صحافت ادھوری رہتی ہے۔آزادی کے بعد نکلنے والے رسائل میں بھی ہمیں یہ رشتہ واضح طور پرنظرآتا ہے۔آزادی سےقبل اور اردوصحافت کے ابتدائی دور میں یہ رشتہ کچھ زیادہ مضبوط تھا۔خاص طور سے سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق سے قبل اس دور کی صحافت میں ہمیں ادب کا عنصر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔اس دور میں اردو ادیب اورکامیاب قلم کار ہی صحافت کے پیشے میں داخل ہوتا تھا۔کم پڑھالکھا یا آج کے دور کاصحافی اس دور کی صحافت کے لیے موزوں نہیں تھا۔صحافت میں وہی کامیاب ہوسکتا تھا۔جسے ادب کی تمام اصناف،فصاحت وبلاغت اور شعرفہمی میں کمال حاصل ہوتا تھا۔جیسا کہ ڈاکٹرصالح عبد اللہ لکھتے ہیں :

> ''انیسویں صدی کی اردوصحافت پر ادبی رنگ چڑھاہوا تھا۔خبریں اس طرح مرتب کی جائیں کہ ہرجملہ ردیف وقافیہ کا پابند ہوتا۔کبھی کبھی جملوں کا وزن بھی برابر ہوتا۔مثلاً واجدعلی شاہ کی معزولی پر اخبارطلسم لکھنؤ نے لکھا،''زبان کی گردش نے عجیب ویرانی دکھا ئی تمام خلق کو رقت تھی یہ حیرانی دیکھ کرحسرت تھی۔ دیکھنے والوں کادل کراہتا تھا مگر کیاہوسکتا تھا ایک دوسرے کا منہ تکتاروتا بلکتا تھا''۔اسی طرح کی زبان سحر سامری میں بھی ملتی ہے۔جو ایک ہفتہ وار اخبار تھااور 1856 کے آس پاس چھپتا تھا۔
>
> اخبارات میں چھپنے والے اشتہارات کی زبان بھی رنگین ہوتی بلکہ کبھی کبھی نظم میں اشتہار بھی چھپتا تھا۔عام طور پر اخبار کے سرورق پر اشعار لکھے جاتے۔مثلاً اعظم الاخبار میں یہ شعرلکھا ہوتا :

اسم اعظم کا وظیفہ مطبع اعظم میں ہے

نام سے جس کے یہ کاغذ اعظم الاخبار ہو ! (11)

انیسویں صدی کے اواخراور بیسویں صدی کی شروعات میں جتنے بھی اخبارات شائع ہورہے تھے ان سب کی زبان اور اسلوب میں ادب کا رنگ غالب تھا۔ سرسید نے عام فہم اردو زبان کو فروغ دیا۔ جس سے عوام میں ایک نئے اسلوب نگارش کا چلن عام ہوا۔لیکن اس وقت کے اخبار و رسائل ساتھ ساتھ اد ب کے خالص رنگ سے بھی لبریز ہیں۔ دوسرے اخبارات ورسائل مثلاً پیسہ اخبار، زمیندار، اردوئے معلّی، مدینہ، الہلال والبلاغ، زمانہ، مخزن، دلگداز کا اپنا ایک امتیازی مقام تھا، ان تمام اخبارات ورسائل کی کامیابی میں ان مدیران کا ہاتھ شامل تھاجو اردو ادب کی مقتدر شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان اخبارات ورسائل نے عوام کی نہ صرف صحت منداورتوانا صحافت کے ذریعے ذہنی پرورش کی بلکہ اردو ادب کوتقویت پہنچانے میں بھی اہم کرداراداکیا۔ بیسویں صدی کی صحافت نے ملک کی ترقی کے لیے عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کامیابی وکامرانی کی سمت میں قدم بڑھائے۔ دوسری زبانوں کی صحافت کی طرح اردوصحافت نے بھی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اردوادب کوفروغ دینے میں بھی پیش پیش رہی۔ آزادی کے بعد کے حالات اردو کے لیے سازگارنہیں تھے لیکن اس کے باوجود بڑی تعداد میں اردو رسائل واخبارات ملک کے کونے کونے سے شائع ہوئے۔اکیسویں صدی کی شروعات تک اردوصحافت نے کئی نشیب وفراز دیکھے ہیں اور آج اردوصحافت کافی توانا بھی ہوچکی ہے۔ جدیدٹکنالوجی کے ساتھ دیگر وسائل کواپنائے ہوئے کامیابی کے سفر پر گامزن ہے۔ایک خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ اب اردوصحافیوں کی پیشہ ورانہ تربیت کے سلسلے میں پیش رفت کی جارہی ہے جس سے یقیناً اردوصحافت اوراردوزبان کی ترقی کونئی جہت نصیب ہوگی۔

عہد حاضر کے رسائل کا ذکر کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ آج ملک کے مختلف گوشوں سے ہرقسم کے رسائل شائع ہورہے ہیں۔ا ن میں بڑی تعداد غیرادبی یا عام قسم کے رسالوں کی ہے۔ ادبی رسائل کی تعداد کم ہے لیکن ان رسائل میں اردو ادب کی اصناف،

موضوعات اورزبان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اردوکی ادبی صحافت غیرادبی یا پاپولر(عام ادبی) صحافت سے زبان وبیان، موضوعات اور اصناف کے معاملے میں کہیں آگے ہیں۔ عام سستے رسائل کے خریداروں کی تعداد زیادہ ہے اور ملک کا ایک بڑاطبقہ ان رسائل کو پڑھتا ہے جن میں خواتین سے متعلق رسائل کی تعداد سب سے زیادہ لیکن ادبی رسائل کے ساتھ سرکولیشن کے کچھ مسائل ہیں جن کی وجہ سے ایسے رسالے ایک چھوٹے قصبے یا گاؤں کے قاری تک نہیں پہنچ پاتے۔ لیکن ان سب دشواریوں کے باوجود ادبی رسائل کا اپنا ایک معیار اور وقارہے۔ اردو صحافت نے ادب تخلیق کرنے اور پروان چڑھانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ڈاکٹر مہتاب امروہوی کے الفاظ میں:

> ''جہاں اردوصحافت نے جنگ آزادی میں ناقابل فراموش اہم کردار ادا کیا۔وہاں دوسری جانب اردو ادب کی مختلف اصناف کے فروغ میں بھی اپنی سرگرمی کوتاہنوز جاری رکھا ہے۔لیکن مقام حیرت ہے کہ صحافت کی مشہوراصناف کوآج بھی ادب کے اس حصے میں شامل نہیں کیا گیا ہے جس کا استحقاق ہونا چاہیے تھا۔
>
> اردو ادب کی ہرصنف کی تعمیم میں صحافت نے مرکزی رول نبھایا خاص طور پر افسانہ، داستان، غزل، ڈراما، سفرنامہ وغیرہ کو بذریعہ اخبارات ورسائل عام قاری کے مطالعہ تک پہنچایا گیا اور اس کی مقبولیت کو طشت ازبام کیا گیا۔لیکن اگرہم غورکریں تو معلوم ہو گا کہ جتنا تحقیقی کام افسانہ غزل، ڈراما اورسفرنامہ پر ہوا اس کا دسواں حصہ بھی فن صحافت کی کسی بھی صنف پرنہیں ہوا۔ اس امر کے اخلاقی مجرم وہ صحافی بھی کہے جاسکتے ہیں جنھوں نے ازخوداس صنف کواردو ادب سے باہرکی چیزتصور کیا اور دروازے سے باہر رکھا۔'' (12)

ڈاکٹر مہتاب امروہوی کی مندرجہ بالا باتوں سے انکارنہیں کیا جاسکتا۔ اردوصحافت نے اردو ادب وزبان کوعام کرنے اورایک عام قاری تک غالب، میرواقبال، پریم چند، منٹو،

بیدی، کرشن چندر کو پہنچانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ صحافت اور ادب کے درمیان رشتے کو ایمانداری سے اجاگر کیا جائے۔ اس سمت میں سنجیدگی سے تحقیق کی جائے۔ ہم صحافت اور ادب کے درمیان کوئی خط یا لکیر نہیں کھینچ سکتے یا ان دونوں کو ایک دوسرے میں پوری طرح شامل بھی نہیں کر سکتے۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی کی صحافت میں جہاں زبان و بیان کی بڑے پیمانے پر غلطیاں نظر آتی ہیں وہیں سنجیدہ ادب نے صحافت کو پروان چڑھایا ہے۔ آج بھی ایک عام قاری اخباری اور ادبی صحافت میں سنجیدہ ادب کو تلاش کرتا نظر آجاتا ہے۔ شاید ہی اردو کا کوئی اخبار یا مجلّہ ایسا ہو جس کے صفحات پر ادبی اصناف یا ادبی شخصیات سے متعلق مضامین یا تخلیقات موجود نہ ہوں۔ آج کہیں نہ کہیں عام اخباری صحافت بھی ادب کے شانوں پر سوار ہے اور ادب کی شیرینی اور چاشنی کو اپنائے ہوئے ہے۔ عام ادبی رسائل میں ہمیں خالص ادب نظر آتا ہے۔ لیکن نیم ادبی رسالوں میں یا پاپولر رسائل میں بھی ادب کی اصناف پر مضامین یا نگارشات مل جاتی ہیں۔ اگر خالص ادبی رسائل کی بات کریں تو اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے رسالوں نیا دور، آجکل، شاعر، اردو ادب، سب رس، کتاب نما، ایوان اردو، ذہن جدید، فکر و تحقیق، غالب نامہ، نئی کتاب، انشاء، مریخ، زبان و ادب وغیرہ میں تمام ادبی اصناف پر مبنی مضامین و نگارشات شائع کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ قارئین کے خطوط، اداریہ نویسی، اشتہارات اور خبریں، تبصرے بھی شائع کیے جاتے ہیں جو کہ خالصتاً صحافت کا جزو ہیں۔ ان رسائل کے موضوعات خالص ادبی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان مضامین میں تنوع بھی نظر آجاتا ہے۔ عالمی صورتِ حال، حالات حاضرہ، تعلیم و تربیت، تاریخ و سیاست، دیہی زندگی، سماجی موضوعات و شخصیات پر مبنی مضامین اور تخلیقات بھی نظر آتی ہیں جو ادبی رسائل کو اس معاملے میں امتیاز و وقار عطا کرتی ہیں کہ ادبی رسالے بھی وقت و حالات اور صحافتی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ آزادی کے بعد اردو کے ادبی رسائل کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شعیب رضا وارثی لکھتے ہیں:

''ان رسائل میں جو شعری اصناف شائع ہوئیں ان کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ آزادی کے بعد اردو ادب جن نئی ہیئتوں اور اسالیب سے روشناس ہوا، ان کی ترجمانی اور نمائندگی ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ہر دور کے نامور قلم کاروں نے نت نئے تجربات کیے اور اسلوب کی سطح پر کئی اہم اضافے سامنے آئے۔ کلاسیکی اسلوب کے ساتھ نئے علامتی اسالیب کی ترجمانی میں آجکل، تحریک، محور، تخلیق، تلاش، سطور، معیار، تناظر، شعور، ذہن جدید، کتاب نما اور ایوان اردو پیش پیش ہیں۔ شاہراہ، عصری ادب، عصری آگہی نے پہلے پہلے عوامی اسالیب کو اختیار کیا پھر کلاسیکیت کی آمیزش سے جدید اسلوب کو فروغ دیا۔

موضوعات کی سطح پر بھی ان رسائل میں شائع ہونے والی تخلیقات میں تنوع ملتا ہے۔ تقسیم کے بعد کے مسائل، ہجرت، اغوا، فسادات، سیاسی وسماجی انتشار جیسے موضوعات ہمیں آجکل، شاہراہ، عصری ادب، عصری آگہی وغیرہ میں زیادہ ملتے ہیں۔ جب کہ انسان کی داخلی کیفیات، تنہائی، خوف، تشکک، ماضی پرستی، و مذہب پرستی، رشتوں کی شکست و ریخت پر مشتمل موضوعات سطور، تخلیق، تلاش، محور، ذہن جدید، وغیرہ میں زیادہ برتے گئے۔ تحریک، معیار، تناظر، شعور، کتاب نما، ایوان اردو وغیرہ رسائل میں ہر قسم کے موضوعات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ آخری دور کے رسائل مثلاً ذہن جدید اور شعور وغیرہ میں کسی نظریاتی قید کا سراغ نہیں ملتا۔ شعور البتہ ایک عجیب مزاج کا حامل رہا ہے۔ اس میں اسلوب کی سطح پر جدیدیت اور موضوع کے اعتبار سے اشتراکیت کا زور زیادہ ہے۔'' (13)

شعیب رضا کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد کے رسائل کے موضوعات میں کافی تنوع تھا۔ اردو ادب کی مختلف تحریکات کی پیروی کرتے ہوئے اردو رسائل نے صحافت کو بھی ذہن میں رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ عصری مسائل اور موضوعات پر بھی قلم

اٹھایا گیا۔ اکیسوی صدی کے اوائل کے رسائل پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں افسانوں، نظموں، غزلوں اور دوسری اصناف میں عام سماجی وسیاسی حالات کی بھرپور عکاسی نظرآتی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت، دہشت گردی، گجرات کے ہندومسلم فسادات، 9/11 کا حادثہ۔سونامی جیسے سمندری طوفان کی تباہی یا اس طرح کے دوسرے حادثات و واقعات سے ادب کی تمام اصناف متاثر نظر آتی ہیں۔ جدید زندگی، تنہائی پسندی، رشتوں کا بکھراؤ،عوام کا حکومت سے اعتماد ختم ہوجانا۔دیہی زندگی کی مشکلات ومسائل، جیسے حالات و واقعات بھی ادب کا حصہ بنتے رہے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ادب کسی ایک نظریے یا سوچ کا نام نہیں ہے بلکہ ادب کی تخلیق میں ہمیں زندگی کی تمام گہرائیوں اور گیرائیوں کا بخوبی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ سماج اورمعاشرے میں بکھرے ہوئے کرداروں کے ذہن اوران کی سوچ کی گہرائی میں اتر کر ہی صحیح ادب تخلیق کیا جاسکتا ہے اور وہی ادب کامیاب بھی کہلاتا ہے۔اگر ہم ادب کومحض چند موضوعات تک محدود کردیں تو ادب سمٹ کر رہ جائے گا اور ایک مخصوص دیوار سے آگے اس کی رسائی ممکن نہیں ہوسکے گی۔صحت مند ادب وہی ہوتا ہے جس میں معاشرے کی اور عوام کی سچی ترجمانی کی جائے۔ اگرایک عام قاری بھی کوئی افسانہ پڑھے توافسانے کا کوئی نہ کوئی کردار اس کے ذہن پر دستک دے اور وہ قاری افسانے کے کرداروں میں خودکو تلاش کرے، تب ہی ایک کامیاب ادب کی صحیح تخلیق ممکن ہے اورظاہر ہے کہ ادب کی صحیح تخلیق ہی اس کی ترقی کی ضامن ہے۔

اکیسویں صدی کے اخبارات ورسائل کے زبان واسلوب عام فہم ہیں۔ اس میں ہمیں ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ عوام کی روزمرہ کی زبان بھی نظرآتی ہے۔اسی زبان کی وجہ سے صحافت اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور ادبی نثرکوفروغ دینے اور ادب کو گھر گھر پہنچانے میں اسی عام فہم صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بقول پروانہ ردولوی:

> ’’اردوصحافت نے اردو زبان کوفروغ دے کر ادبی زبان بنانے کے سلسلے
> میں جو خدمت انجام دی ہے اس سے لاکھ چشم پوشی کی جائے مگر جب کوئی
> بھی اردو زبان کے فروغ کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ سب سے پہلے اردو

صحافت ہی کا ذکر کرے گا جس نے اردو کے نثری ادب کا باقاعدہ آغاز کیا اور
اردو شاعری کو بند کمروں اور نجی محفلوں سے عوام تک پہنچا کر اسے مقبول
بنایا۔'' (14)

معروف صحافی پروانہ ردولوی کی اس بات سے کسی طور انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اردو زبان وادب کی آبیاری کرنے میں صحافت نے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ صحافتی زبان کا اپنا ایک منفرد اسلوب نگارش ہے جس نے عوام میں اپنی جگہ بنائی اور ایک عام قاری ادب سے اورزیادہ قریب ہوا۔ اس قربت نے زبان اور ادب کو کافی فروغ دیا خالص ادبی الفاظ اور اصطلاحات عام لوگوں کی زبان وبیان کا حصہ بنے۔ اس بابت ڈاکٹر صالح عبداللہ کہتے ہیں:

''معیاری صحافت نے ہردور میں ایسی زبان اوراسلوب کو اپنا یا جس کو قاری آسانی سے سمجھ لے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی بول چال کے الفاظ صحافت میں شامل ہوتے گئے اور قارئین کے دل میں جگہ بناتے گئے۔ پھر جب قبول عام کی سند حاصل ہوگئی تو ادب نے بھی اپنے دروازے کھول دیے۔ اب جبکہ دنیا کے ہر حادثے اور واقعے کی خبر سب سے پہلے دینے کی ہوڑسی لگ گئی ہے ایسے میں زبان وبیان کے لہجے بھی بدل گئے ہیں۔ اسی صورت میں ایسا اسلوب جسے صحافتی اسلوب کہا جاسکے اس کے معیار متعین نہیں کیے جاسکے۔ دراصل یہ ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ زبان کے فطری تقاضے کے برخلاف تھا۔ اس لیے صحافتی زبان کے نت نئے اسلوب فطری عمل کے تحت گڑھے جاتے ہیں یا اپنے آپ وضع ہوجاتے ہیں۔'' (15)

موجودہ صحافت کے منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو یہ واضح ہوجائے گا کہ آج صحافت اور ادب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، ان میں کوئی تفریق نہیں برتی جاسکتی ہے۔ صحافت میں کالم نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، رپورتاژ، انٹرویو، فیچر نویسی، مزاحیہ کالم ومزاحیہ شاعری جیسی اصناف داخل ہوئیں اورصحافت کو ایک نیا مقام اور وقار عطا کرنے میں ان

اصناف کا اہم کردار رہاہے۔ اردو کالم نگاری نے اردوصحافت میں امتیازی مقام حاصل کیا اورصحافت کو ایک نئی سمت ومقام دیا جس سے اخبارات ورسائل کو بھی ادبی وقار حاصل ہوا۔ ادب اورصحافت کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ صحافت کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ بحث کی جائے اور اس سمت میں تحقیق وتخلیق کے نئے در کھولے جائیں جن سے ماضی کی صحافت کی بازیافت ہو اورموجودہ صحافت کی سمت متعین کرنے میں بھی مدد مل سکے۔

ادبی قدر و قیمت

اکیسویں صدی کی شروعات سے ہی ٹکنالوجی اور کمپیوٹر جیسی مشینوں کا استعمال صحافت کے کسی بھی شعبے میں ضروری ہوگیا ہے۔ اکیسوی صدی، نئے ہنگامے، نئی ایجادات اور نئی سہولتیں لے کر آئی۔ اگر اہم الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ پرنٹ میڈیا یااخباری صحافت کی بات کریں تو یہ اندازہ ہوگا کہ نئی صدی میں مشین انسانوں پرحاوی ہے۔لوگ اخبارات ورسائل سے زیادہ توجہ ٹی وی اورالیکٹرانک میڈیا کودیتے ہیں۔ معاشرے کا ایک بڑا طبقہ خبروں اورمعلومات کے لیے ٹی وی ریڈیواورانٹرنیٹ پرانحصار کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی رسائل واخبارات کی تعداد کچھ کم ہوئی لیکن سماج کا ایک بڑاطبقہ اب بھی اخباری صحافت اور رسائل کوترجیح دیتاتھا۔ ادبی رسائل ملک کے تمام حصوں سے شائع ہورہے تھے لیکن ان کی پہنچ بہت کم افرادتک تھی اورکم ہی لوگ ادبی رسائل کا مطالعہ کرتے تھے۔ بڑے شہروں میں تو ادبی رسائل بآسانی دستیاب ہوجاتے ہیں لیکن چھوٹے شہروں اورقصبوں میں ادبی رسائل نہیں ملتے جس سے ادبی ذوق وشوق رکھنے والے قارئین کی تشنگی برقرار رہ جاتی ہے۔نئی صدی میں بہت سارے نئے رسائل کی شروعات ہوئی اورکئی رسالے بند بھی ہوگئے۔شمس الرحمٰن فاروقی کا شب خون کافی اہتمام کے ساتھ بند ہوا۔ پرانے رسالوں میں شاعر، نیادور، آجکل، اردو ادب، کتاب نما، وغیرجاری ہیں اوران کا مطالعہ کرنے والوں میں قارئین کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔نئی صدی میں بھی کچھ رسائل کی شروعات ہوئی ہے جن میں شاہدعلی خاں کا نئی کتاب۔

تحریرِ نو وغیرہ شامل ہیں۔ یہ رسائل ادبی حلقے میں مقبول تو ہیں لیکن ان کی اشاعت کافی محدود ہے اور ملک کے تمام حصوں تک یہ رسائل پہنچ بھی نہیں پاتے۔

ادبی رسالے نہ صرف تخلیقی نگارشات کو شائع کرتے ہیں بلکہ زبان وادب کی بازیافت، نئی تحقیق، نئے نظریے اور قاری وقلمکار کے درمیان ایک ترسیل کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ ادبی رسالے اپنے معیار کے مطابق تحریریں شائع کرتے ہیں اورتحریروں کے انتخاب واشاعت میں بھی اس معیار کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ادبی رسالوں کا ایک اہم حصہ قارئین کے خطوط پر مبنی ہوتا ہے، جس میں قاری رسالے کے تعلق سے اپنے خیالات اوررجحانات کے حوالے سے چھیڑی گئی بحثوں نے ادب کو نئے افق تک پہنچانے میں تعاون کیا ہے۔ بحث اور مباحثے کے ذریعے ادب کے نئے دریچے کھلتے ہیں اورادب کے قاری اورقلم کار کو نئے محرکات اور نئے نکات سے سابقہ پڑتا ہے جن پر عمل کرکے ادب کی سمت متعین کی جاتی ہے۔ ان مباحثوں میں کبھی کبھی جانب دارانہ رویوں اور بے بنیاد الزامات سے ادب کو نقصان بھی ہوا ہے۔ لیکن شب خون، آہنگ، صبا، ایوان اردو اور سوغات جیسے رسائل میں شائع کیے گئے مباحثوں نے اردو ادب وزبان پر چھائے جمود کو کم کرنے کی ہرممکن کوشش کی ہے۔ ان مباحثوں میں رسائل نے بھی اپنا رخ اور اپنا نقطہ نظر پیش کیا اور بحث کے شرکا نے اپنی آراء سے علمی وادبی موقف کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی ادبی رسالوں میں چھیڑی گئی بحثوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’ادبی جرائد کی تاریخ میں بعض ادبی رویے عام مضامین میں ظاہر ہوتے رہے ہیں اور بیش تر ادبی بحثوں نے جریدے کے رول کو نمایاں کیا ہے۔ اب بحثوں کی نوعیت مختلف جرائد میں مختلف ہوسکتی ہے۔ کبھی کسی بحث کا آغاز اداریے میں بیان کیے جانے والی تخلیقات بعض مباحث کومہمیز کرتی ہیں اور بسا اوقات قاری کے خطوط ادبی مباحث کو ایک خاص رخ دے دیتے ہیں مگر بحث وتمحیص کے اس پورے عمل میں ادارہ صرف تماشائی کارول ادانہیں کرتا، اس کا اپنا زاویہ نظر، اگر جریدے کے صفحات میں

سامنے نہیں آتا تو اکثر ادبی مباحث لاسمتی کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ مدیر
کی ذمے داری ہے کہ وہ جریدے میں اٹھنے والے مباحث کو کوئی نہ کوئی
رخ ضرور دے، بحث کے اسلوب کو متوازن رکھے، توازن کے امکان کی
مزاحمت کرے اور اداریے یا ادارتی نوٹ کے ذریعے اداریے کے نقطۂ نظر
کو سامنے لائے۔''(16)

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی ان باتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ادبی مباحث میں غیر جانب دارانہ رویے کے ساتھ ساتھ رسالے کے اپنے موقف کا واضح ہونا بھی ضروری ہے۔ جب تک رسالے کا مدیر اپنا موقف نہیں واضح کرے گا تب تک رسالے کے معیار اور مقام کا تعین نہیں کیا جاسکے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اردو رسائل نے ادب کے ساتھ ساتھ تمام سماجی، ملکی وغیر ملکی تحریکوں اور صورتِ حال کی نمائندگی کی ہے۔ ادب کے رویوں کو عصری صورتِ حال سے ہم آہنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اردو کے شروعاتی دور سے لے کر آج تک ان رسائل کی فائلوں میں اردو ادب وزبان کی تاریخ وترقی اور ان کی سمت ورفتار کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

صحافت اورادب میں کوئی واضح فرق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک ادبی صحافت کا تعلق ہے تو ادب کی ترویج واشاعت، ادب کے فروغ وترقی میں ادبی صحافت کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ روزنامہ اور ہفتہ وار اخبارات میں بھی ادب سے متعلق مضامین اورتخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔لیکن ادبی صحافت کے زمرے میں بالخصوص ایسے رسائل آئیں گے جن میں خالصتاً ادب سے متعلق نگارشات شائع ہوتی ہیں اورخبروں سے لے کر تجزیے، مضامین،تخلیقات وغیرہ صرف ادب کے دائرے تک ہی محدود ہوں۔ یہاں یہ بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ رسالے میں عام سماجی موضوعات اورخبروں پر مشتمل مضامین بھی شائع کیے جاتے ہیں۔کبھی کبھی ادب کے محرکات ان خبروں اور عام موضوعات سے ہی جنم لیتے ہیں۔ ادبی صحافت کے ذریعے نئے قلم کاروں کو ادبی حلقے میں روشناس بھی کرایا جاتا ہے اورادب کی کئی نامور شخصیتوں نے ان رسائل کے توسط سے ہی شہرت اور

ناموری حاصل کی تھی۔ اہم تحریکات اور رجحانات کو نئی سمت دینے میں بھی ادبی رسائل نے قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔

زبان کی ترقی کے لیے ذرائع ترسیل کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ میڈیا اور ٹکنالوجی اپنی جگہ ہیں لیکن کاغذی تحریر کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ رسائل وجرائد یا تحریر شدہ کتابوں کو ہم جتنا آرام وسکون کے ساتھ بیٹھ کر یا لیٹ کر مطالعہ کرسکتے ہیں وہ انٹرنیٹ، کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ سے فی الحال ممکن نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل اور بیسویں صدی کے اواخر تک اردو رسائل کا بول بالا رہا ہے۔ ادب سے لے کر صحافت تک، ان رسائل نے امید سے بڑھ کر اپنا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ کوئی بھی زبان صرف شاعری یا افسانے کے ذریعہ ترقی نہیں کرسکتی بلکہ اس میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کی صلاحیت ہونی ضروری ہے۔ ڈاکٹر محمد انورالدین لکھتے ہیں:

> ''کوئی بھی زبان صرف شعروشاعری، ڈرامہ، افسانہ یا ناول نگاری کے لیے نہیں ہوتی بلکہ زبان کو زندگی کے ہمہ جہتی رخ کی عکاسی بھی کرنی چاہیے اور یہی عکاسی دراصل زبان کو ایک مضبوط بنیاد اور استحکام بخشتی ہے۔ زبان میں مختلف موضوعات کے اظہار کے لیے صلاحیت ہونی چاہیے اسی سے زبان کے دائرے میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر زبان کو وسیلہ اظہار بنایا جاتا ہے زبان میں زندگی کی رنگارنگی وسعت وجامعیت کا اس طرح اظہار ہوتا ہے۔'' (17)

ڈاکٹر محمد انورالدین نے جس نکتے کو واضح کیا ہے، جان گلکرسٹ اور سرسید احمد خاں نے اس نکتے کو سمجھتے ہوئے ہی اردو میں مختلف علوم کی کتابوں کے ترجمے کو پیش کرنے کی کوشش شروع کی تھی۔ دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد کی خدمات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رسائل میں ادب وزبان سے متعلق موضوعات کے ساتھ ساتھ ضرورت کے مطابق دوسرے موضوعات پر مبنی رسائل بھی شروع کیے گئے اور سائنس، سماج، سیاست، اقتصادیات جیسے موضوعات پر بھی رسائل شائع ہونے شروع ہوئے۔ خالص ادبی موضوعات میں بھی نئی فکر

اور نئے گوشوں کو سامنے لانے میں رسائل نے اہم کردار ادا کیا۔ رسائل نے اپنے گوناگوں موضوعات سے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا اور اردو زبان کو بھی ایک زندہ اور کامیاب زبان بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ رسائل نے ادب کی تاریخ وتفہیم میں بھرپور تعاون کیا اورادبی تاریخ کے گمنام گوشوں کو واضح کیا۔ وقت اورحالات کے مطابق رسائل نے تمام تحریکات ورجحانات کو اپناتے ہوئے ادب کی سمت ورفتار متعین کرنے میں اپنا تعاون دیا۔ اردوزبان کو ملک کی اہم زبان اوررابطے کی زبان بنانے میں ادبی رسائل کا ہی ہاتھ رہا ہے۔ نگار، مخزن، ہمایوں اودھ پنچ، تہذیب الاخلاق، اردوئے معلیٰ، الہلال اور البلاغ نے اردو کی تعمیر وترقی میں جو کردار ادا کیا ہے اس سے ہم کبھی انکار نہیں کرسکتے۔ ان رسائل میں ادب کے ساتھ دوسرے تمام سماجی وسیاسی اورضروری موضوعات کو جگہ دی جاتی تھی جو رسائل کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ان کے علاوہ رسائل کے ادبی معیار میں بھی کوئی کمی نہیں دیکھی گئی۔ ان رسالوں کے مدیر بھی خالصتاً ادب کے لوگ تھے جو اپنی صحافتی خدمات سے زیادہ اپنی ادبی خدمات کے لیے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے ادب کے ساتھ ساتھ صحافت میں بھی صحافتی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اعلیٰ درجے کی صحافت پیش کی جو ان کی علمی وادبی صلاحیت کا ثبوت ہے۔

اردو کی ادبی صحافت اپنے اندر ہندوستانی تاریخ کے کئی ادوار سمیٹے ہوئے ہے۔ رسائل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان رسائل نے زمانے کے سیکڑوں نشیب وفراز سے گزر کر اپنے قارئین کو ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر، اردوزبان وادب کے فروغ اورلوگوں میں اردوزبان کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے کی ہرممکن کوشش کی۔ رسائل نے جہاں اپنے ایک نظریے یا موقف کو عام کرنے کی کوشش کی وہیں ادب کی مختلف تحریکوں کے عروج وزوال میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعدصورتِ حال نامساعد ہونے کے بعد بھی ان رسائل نے لگن اور اردو کی خدمت کے جذبے سے منہ نہیں موڑا۔ طباعت کی بے پناہ پریشانیوں کے باوجود رسائل شائع ہوتے رہے۔ ادبی رسائل کے مدیروں کے پاس وسائل اورسرمایے کی کمی بھی رہی ہے جس کی وجہ

سے رسائل ایک محدود حلقے تک ہی پہنچ پاتے ہیں اور اردو کا ایک بڑا طبقہ ان رسائل کے مطالعے سے محروم رہ جاتا ہے۔

نئی صدی اورنیا ملینیم بلاشبہ ترقی اور طاقت کا ایک نیا دور لے کر آئے ہیں، آج انسان چاند پر پہنچ چکا ہے۔ خلاؤں کی سیر کررہا ہے۔ زمین چھوٹی ہوتی جارہی ہے۔ لوگوں کی سوچ تبدیل ہوگئی ہے۔ دنیا گلوبل بستی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ لیکن ان سب ترقی کے باوجود معاشرے میں ڈھیروں پراگندگی اورمسائل درآئے ہیں۔ لوگ عجیب بے بسی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ رشتوں، رابطوں، انسانیت اور ہمدردی سے لوگوں کا ناطہ ٹوٹ گیا ہے۔ معاشرہ زوال پذیر ہے۔ انسان مشینوں کا غلام بن کررہ گیا ہے۔ ایسی نفسانفسی کی صورتِ حال میں لوگوں کی دلچسپی پڑھنے لکھنے سے ختم ہوتی جارہی ہے۔ تحریر شدہ ورق کی بجائے لوگ برقی کتابوں یا برقی وسائل اورذرائع پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ لوگوں کے پاس نہ کسی دوست احباب سے ملنے کا وقت ہے اور نہ ہی کسی رسائل کو پڑھنے کا۔ اب رسائل وجرائد کو صرف وہی حضرات ہاتھ لگاتے ہیں جو اس سے جڑے ہیں یا ان کے لیے ان کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ لوگوں کے پاس اب ڈھیروں وسائل اور دلچسپیاں موجود ہیں۔ رسائل آج بھی شائع ہورہے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوچکی ہے۔ کہنے کو تو ہم ترقی کے ساتویں آسمان پر پہنچ گئے ہیں لیکن مغربی تہذیب ومعاشرے کی تقلید نے ہمیں اپنے ادب، اپنی صحافت، اپنی پہچان، اپنی تہذیب وتمدن اوراپنی زبان سے دور کردیا ہے۔ آج ترقی کا معیار تبدیل ہوکررہ گیا ہے۔ آج ترقی سے مراد مغرب کی اندھی تقلید یا انگریزی کا زبردست علم ہے۔ اب ایسے دگرگوں حالات میں اردو کی ادبی صحافت کس طرح اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرسکے گی۔ اردو رسائل آج ملک کے تقریباً تمام حصوں سے شائع ہورہے ہیں لیکن ان کا سرکولیشن ہزاروں میں بھی نہیں ہے۔ ارد وصحافت اوراردو رسائل کے فروغ کے لیے سب سے پہلے ہمیں بنیادی وجوہات کا پتہ لگانا ہوگا، تب ہی ہم صحیح طور پر سمجھ سکیں گے کہ اس سمت میں کیا کوششیں کی جائیں۔ اردو رسائل کو نہ ہی مالی تعاون ملتا ہے اور نہ ہی ان کا جریدہ ڈھیر سارے لوگ خرید کر پڑھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے رسائل کے مدیران کو جلد ہی

رسالہ بند کرنے پر مجبور ہوجاتا پڑتا ہے۔ اگر رسائل وجرائد کو قائم رکھنا ہے تو اردو کے لیے کام کرنے والے اداروں کو ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی۔ کچھ کتابوں پرانعامات دے دینے سے یا مختلف موضوعات پر سیمینار کا انعقاد کرادینے سے اردو اکادمیاں اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتیں۔ اردو اکادمیوں کو سرکار سے کروڑوں میں امداد حاصل ہوتی ہے لیکن اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے یہ اکادمیاں سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کررہی ہیں۔ سیمینار میں مقالہ پڑھوانے، کتابوں پر انعامات دینے کے لیے بھی بہت جوڑ توڑ ہوتی ہے۔ معروف ادیب وتنقید نگار اور اہم مقام پر فائز حضرات کیا کیا کوششیں نہیں کرتے۔ جبکہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان وادب کے تحفظ کے لیے مناسب اور منظم اقدامات کیے جائیں۔ اگر اردو اکادمیوں نے اور دوسرے اداروں نے اردو کی بقا وحفاظت کے لیے سنجیدہ کوششیں نہ کیں تو اردو کا وجود ختم ہوجائے گا۔ آج والدین اپنے بچوں کو اردو ادب کی تعلیم دیتے ہوئے اسی لیے گھبراتے ہیں کہ اس شعبے میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔ آج دنیا سائنس کی ہے اورلوگ جدید شعبوں اور جدید ٹکنالوجی کی جانب زیادہ متوجہ ہورہے ہیں۔ اردو کی صورتِ حال بہتر نہیں ہے۔ اردو سے متعلق کسی شعبے میں چاہے وہ اخبارات ہوں، ٹی وی ہو یا رسائل ہوں۔ اتنے کم پیسے ملتے ہیں کہ انسان اپنا خرچ بھی مشکل سے چلا پاتا ہے۔ اب ایسی حالت میں لوگ کیوں اردو پڑھیں گے یا کیوں اس زبان سے جڑیں گے۔ اردو کے تحفظ کے لیے اکادمیوں اوراداروں کو سنجیدگی سے کوشش کرنی چاہیے ورنہ یہ زبان اوراس کے رسائل اوراس کی صحافت قصہ پارینہ ہوکر رہ جائے گی۔

حواشی

1. ماہنامہ اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی، جنوری، فروری، 2006، ص41
2. ماہنامہ شگوفہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد، مئی 2006
3. ماہنامہ امکان، سیمانت نگر، لکھنؤ۔ مئی 2003
4. سلیمان اطہر جاوید، کالم ادبی ڈائری، روزنامہ سیاست (ویب سائٹ)، حیدرآباد
5. ایضاً
6. ادبی سہ ماہی یہ صبح، جوہری فارم، جامعہ نگر، نئی دہلی، شمارہ ایک، جنوری تا مارچ 1998، ص8
7. سہ ماہی اردو دنیا، نئی دہلی، اپریل مئی جون، 1998 ص88
8. سہ ماہی استعارہ، نئی دہلی، اکتوبر، نومبر، دسمبر، 2000، ص420-419
9. مباحثہ، شمارہ 33 اگست تا دسمبر 2009، پھلواری شریف، پٹنہ، ص 204
10. ماہنامہ سبق اردو، پیغام، شمس الرحمٰن فاروقی، بھدوہی، جولائی 2004، ص4
11. اردو صحافت میں اظہار وابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر صالح عبداللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2006 ص 13
12. ماہنامہ کتاب نما، مہتاب امروہوی، مہمان اداریہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جولائی 2006 ص3
13. آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ۔ ڈاکٹر شعیب رضا وارثی مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی۔ 1997 ص 227
14. پروانہ ردولوی، اردو صحافت کا استغاثہ، حیا پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1994 ص 75
15. اردو صحافت میں اظہار وابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر صالح عبداللہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 2006 ص 153
16. مضمون ادبی صحافت اور ہمارے ادبی رویے، ابوالکلام قاسمی، ماہنامہ اردو دنیا،

نئی دہلی، اکتوبر 2009 ،ص18-17

17. ڈاکٹر محمد انور الدین،حیدر آباد دکن کے علمی و ادبی رسائل، مکتبہ شاداب،ریڈہلز،
حیدرآباد، 1997 ،ص335

مسائل و امکانات

اردو کے رسائل نے آغاز سے ہی ادب اورصحافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شروع سے لے کر آج تک مختلف موضوعات پر مختلف قسم کے رسائل شائع ہوتے رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں رسائل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بہترین مضامین، تحقیقی مقالات اور خالصتاً ادبی نگارشات کو عام کرنے میں رسائل کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ادبی صحافت اوررسائل کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق رہا ہے۔ بڑے بڑے شعرا کو رسائل وجرائد نے ہی مقبولیت عطا کی ہے۔ رسائل کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں ہرطرح کے موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ وقتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ایسی نگارشات شائع کی جاتی ہیں جن کی اہمیت گزرتے وقت کے ساتھ ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ اخبارات میں جہاں وقتی دلچسپی سے متعلق باتیں،خبریں، زیادہ ہوتی ہیں اور سیاست وغیرہ کو زیادہ اہمیت حاصل رہتی ہے وہیں رسائل میں ایسا نہیں ہے۔ کچھ خبری رسائل کو چھوڑ کر باقی رسائل میں ایسی نگارشات شائع کی جاتی ہیں جوادب اور صحافت کےفن پر پوری اترتی ہوں،جنھیں پڑھ کر قاری بھی ادب اورسماج کے رشتے کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اگر ہم صرف ادبی صحافت کی بات کریں تو یہ صاف ظاہر ہے کہ آغاز سے ہی ادبی رسائل نے اپنے مضامین اور اداریوں

سے قاری کو کافی متاثر کیا ہے۔ قران السعدین، فوائد الناظرین، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، اودھ پنچ، اردوئے معلیٰ، الہلال، البلاغ، نگار، زمانہ، ساقی، اردو، شاعر، سب رس، آجکل، نیادور، کتاب نما، شب خون، ایوان اردو وغیرہ ایسے رسائل رہے ہیں جنھوں نے مختلف دور میں اپنے عہد کے مطابق ادب اورصحافت کا پورا حق ادا کیا ہے اور قارئین کی ذہنی تسکین کی ہے۔ ان رسائل نے اپنے اداریوں اور اپنی نگارشات سے اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس کے علاوہ قاری کی پرورش کرنے میں بھی یہ رسائل کچھ کم کوشش نہیں کرتے ہیں۔ رسائل نے ایک تحریک،ایک رجحان کے زیراثر بھی قاری کے ذہن پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ڈاکٹر محمد انورالدین لکھتے ہیں:

> ''ادبی ذوق کی تہذیب وترتیب میں رسائل کا بڑا حصہ ہے رسائل نے ادب کا سنجیدہ اور معیاری ذوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادبی رسائل کی اشاعت کے بعد شاعری کے معیار میں بھی بہتری آئی۔ رسائل کے اجراسے پہلے شعرا اپنا کلام صرف مشاعروں میں سنایا کرتے تھے اوراکثر معمولی اور سطحی اشعار پر محض ترنم اورخوش الحانی کی وجہ سے داد حاصل کرلیتے تھے۔ مگر اب ادبی رسائل کے فروغ کے بعد شاعروں کا کلام ان رسائل میں شائع ہونے لگا اور کلام کے حسن وقبح کو خالص ادبی اورفنی معیاروں پر جانچا جانے لگا جس کی وجہ سے محض اپنی خوش الحانی سے مشاعروں میں داد حاصل کرنے والے شاعروں کا ادب میں مقام نہیں رہا۔'' (1)

ڈاکٹر محمد انورالدین کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ، حسرت موہانی کی تحریک برائے آزادی، مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریکوں کو رسائل کی ہی وجہ سے شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ہر دور کے رسائل میں شاعروں کے کلام پر اصلاح کی جاتی رہی ہے۔ غالب کا کلام بھی پہلے اخباروں میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح علامہ اقبال،فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری جیسے بڑے اور نامور شعرا کو بھی رسائل اور اخبارات نے ہی پہلے پہل شہرت عطا کی تھی۔ مولانا

حسرت موہانی نے اپنے رسالے اردوئے معلّٰی کے ذریعے مکمل آزادی کی مانگ کی تھی جس کے بدلے میں انھیں جیل کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی الہلال اورالبلاغ کے ذریعے حشر برپا کردیا تھا۔ کئی دفعہ ان کے جریدوں کی اشاعت موقوف اور ضمانت ضبط ہوئی۔ رسائل و جرائد نے تحریکوں، رجحانوں کو ایک سمت دینے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''رسائل کے اجراء سے مختلف تحریکات کے فروغ میں بھی مدد ملی۔ اردو میں ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی تحریکوں کو مقبول بنانے میں ان رسائل کا بڑا حصہ ہے جو کسی خاص مسلک کی ترجمانی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں نیاادب، ادب لطیف، شاہراہ،سویرااور صبا جیسے رسائل نے نمایاں حصہ لیا۔ اسی طرح حلقہ ارباب ذوق کے مسلک کو فروغ دینے میں رسالہ ادبی دنیا کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ گزشتہ چند برسوں میں شب خون، سطور، شعرو حکمت اورفنون جیسے رسائل کی وجہ سے ہمارے ادب میں جدیدیت کی تحریک کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ اسی طرح آجکل جو سیکڑوں افسانوں کے مجموعے شائع ہورہے ہیں یہ سب رسائل کی دین ہیں۔ رسائل کی اشاعت سے پہلے ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔'' (2)

اردو رسائل کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ اردو زبان آج جس حالت میں بھی ہے اگر یہ رسائل نہ ہوتے تو اردو کی حالت اور بھی دگرگوں ہوتی۔ آج اردو کو زندہ رکھنے میں سب سے بڑا ہاتھ ان رسائل کا ہی ہے۔ اردو رسائل وجرائد علم وادب کے بیش بہا خزانے سے بھرے پڑے ہیں۔ اردو کا ایک عام قاری بھی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے علمی وادبی مجلّے کی طرف ہی رخ کرتا تھا۔ رسائل کو ان معنوں میں بھی امتیاز حاصل رہا ہے کہ ان میں قوم اورمعاشرے کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ حالات وواقعات کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔روایت وبغاوت سے ابھرنے والا ادب بھی ان کا موضوع رہا ہے اور ایک

عام قاری کو متاثر کرنے والی تحریر بھی شائع ہوتی رہی ہے۔ زبان کے فروغ میں نثر کا اہم کردار رہا ہے اور نثر کو فروغ دینے میں رسائل کا جتنا حصہ رہا ہے اتنا کتابوں کا بھی نہیں ہے۔ نثر نگاروں اور شاعروں کی رسائل کے ذریعے ہوئی مقبولیت اورشہرت کے حوالے سے عابد سہیل لکھتے ہیں:

> ’’مشہور ومعروف ادیبوں اور شاعروں سے لے کر آج کے کم معروف شعرا اور ادبا اور نوواردان بساط ادب تک سب ہی ادبی دنیا میں رسائل کے ذریعے ہی متعارف ہوئے ہیں۔ کرشن، منٹو، فراق، فیض، سردار، قرۃ العین حیدر اور عصمت وغیرہ کی عظمت اپنی جگہ مسلم۔ لیکن ان کی تخلیقات چھاپنے والے ادبی رسائل نہ ہوتے تو نہ انھیں یہ شہرت ملتی اور نہ شاید ان کی بہت سی تخلیقات جنم ہی لے پاتیں شاعری تو ایک حدتک رسائل کے بغیر بھی پروان چڑھ سکتی ہے لیکن نثری اصناف کی ترقی ادبی جرائد کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔ اور اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ زبان کا مستقبل بہرحال نثر سے وابستہ ہے۔‘‘(3)

ادبی صحافت کے ساتھ شروع سے ہی مسائل جڑے رہے ہیں۔ 1837 میں پہلے مجلّے کے آغاز سے ہی ادبی صحافت مسائل کا شکار رہی ہے۔ ہندوستان میں رسائل کی شروعات ایسے دور میں ہوئی تھی جب پورے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ تھا۔ کوئی بھی رسالہ یا اخبار کمپنی کے وضع کردہ صحافتی قوانین کے دائرے میں ہی شائع ہوسکتا تھا۔ آزادی تک اخبارات ورسائل نے ان صحافتی قوانین کا پاس ولحاظ رکھا۔ حکومت کی سرپرستی میں جاری کیے گئے رسائل کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ وسائل کی کمی تھی۔ یہ الگ بحث ہے کہ سرکاری سرپرستی میں شائع کیے گئے رسالوں میں بھی حکومت پر نکتہ چینی اور تنقید کی جاتی رہی ہے۔ بہت سارے رسالوں نے حکومت کے ان صحافتی اصولوں کو درکنار بھی کیا تھا۔

ابتدائی دور کے رسائل میں قاری کی کمی، محدود اشاعتیں، محدود وسائل، متنوع مضامین ونگارشات کا فقدان وغیرہ اہم مسائل تھے۔ اس دور کے رسائل کا ایک بڑا مسئلہ طباعت کا

بھی تھا۔ سر سید احمد خاں کے تہذیب الاخلاق تک لیتھوکی شروعات ہوگئی تھی اور طباعت کا مسئلہ کسی حدتک حل ہوگیا تھا۔ رسائل کا تعلق تعلیم اور علم وادب سے ہے۔ اس دور کے حالات ایسے تھے کہ عوام حکومت کے منصوبوں، ترقیاتی کاموں سے بہرہ ور نہیں تھی۔ بنیادی تعلیم بھی عام نہیں تھی اس لیے رسائل کو بہت کم قاری ملتے تھے۔ صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ انڈیا کمپنی کو بھی اندازہ تھا کہ صحافت کو مکمل آزادی دے دی گئی تو یہ ان کے گلے کی ہڈی بن جائے گی اور اس لیے انھوں نے رسائل شائع کرنے کی اجازت تو دی لیکن بہت ساری پابندیوں کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت ہی عوام کے ساتھ نہ ہو اور عوام کو جب کھانے کے لالے پڑے ہوں تو ایسی دگرگوں حالت میں رسائل کون خریدے گا اور کون پڑھے گا۔ محترمہ روشن آرا راؤ لکھتی ہیں:

> ''عوام بنیادی تعلیمات سے محروم تھے جب کہ قارئین کی معقول تعداد کے بغیر مجلّات کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتے۔ تعلیمی بدحالی کی وجہ برصغیر کے گزشتہ حالات تھے۔ اندورنی خلفشار، بے چینی اور حکمرانوں کی بے توجہی عوام کے قلمی معیار کی بلندی میں رکاوٹ رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی عوام کی تعلیم وتربیت پر معقول توجہ نہ دی چنانچہ تعلیم کے فقدان میں مجلّات کے اجرا اور فروغ کی اہمیت سے عوام بے خبر تھے۔
>
> معاشی اور اقتصادی خوشحالی سے قوت خرید پیدا ہوتی ہے۔ اندرون ملک خلفشار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی پیش قدمی نے برصغیر کو اقتصادی مسائل میں اس طرح جکڑ دیا تھا کہ ہر سطح پر قوت خرید متاثر ہوچکی تھی۔ ان حالات میں مجلّات کی خریداری ممکنات میں سے نہ تھی۔'' (4)

ایسے ناگفتہ بہ حالات میں رسائل کی شروعات ہوئی۔ کچھ برسوں کے بعد آزادی کی پہلی جنگ ہوتی ہے۔ جس کے بعد اردو صحافت پر اور بھی برا اثر پڑا۔ اردو رسائل کے حالات اور بھی خراب ہوگئے اور بغاوت کا سارا الزام مسلمانوں پر لگا دیا گیا۔

بغاوت کے سرد ہونے کے بعد اردو رسائل پر ستم ڈھانے کا ایک نیا سلسلہ شروع

ہوگیا تھا۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس بغاوت نے رسائل کو ایک سمت دی اور نئے حوصلوں اور جذبوں کے ساتھ لوگوں نے رسائل کی شروعات کی۔ بغاوت کے بعد یوں تو بڑی تعداد میں رسائل شروع ہوئے ہیں لیکن سب سے اہم رسالہ سرسید احمد خاں کا 1870 میں شروع کیا گیا تہذیب الاخلاق ہے۔ سرسید احمد خاں نے صحافت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی صورت حال کو بہتر بنانے کی بھی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی صحافت میں ایک تابانی اور ایسا عزم وحوصلہ نظر آتا ہے جس کی نظیر ملنا آج بھی مشکل ہے۔ انھوں نے رسالے کی شروعات سے ہی صحافت کے زریں اصولوں کو پیش نظر رکھا تھا۔ صحافت کی آزادی اور ہر شخص کو اپنی رائے دینے کے اختیار کے اصول پر کار بند رہتے ہوئے صحافت کی شمع روشن کی تھی۔ ان کے سامنے بہت سارے مسائل تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ صحافت کے مسائل کو بھی سامنے رکھا اور ہر ممکن کوشش کی کہ اس میں اصلاح کی جائے۔ سرسید احمد خاں کی صحافتی زندگی کا دور ایسا تھا جب ملک پر انگریز پوری طرح قابض ہوگئے تھے اور کسی بھی طرح کی صحافتی کوشش کو ناکام بنا دینے کی پوری کوشش کررہے تھے۔

پریس ایکٹ اور ادبی صحافت

1878 میں انگریز سرکار نے لارڈلٹن کے دورحکومت میں ورنیکلر پریس ایکٹ کا نفاذ کیا جس کے تحت ملکی صحافت پر بہت ساری پابندیاں لگائی گئیں۔ ان پابندیوں اور خالص نقصان کا سودا ہونے کی وجہ سے بہت سارے رسائل دم توڑ گئے۔ لیکن سرسید احمد کی صحافت میں یہی بات سب سے اہم نظرآتی ہے کہ انھوں نے پابندیوں کے بعد بھی بے پناہ مشکلات کے دور میں صحافت کے ذریعے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ انھوں نے صحافتی قوانین کی پابندی بھی کی اور مختلف مسائل کا سامنا بھی کیا، لیکن انھیں جو لکھنا تھا، جوکرنا تھا وہ بھی کیا اور یہ ثابت کردیا کہ مسلمانوں کی ترقی ممکن ہے اور ایسے ناگفتہ بہ حالات میں بھی صحافت کی آبیاری کی جاسکتی ہے۔ سرسید احمدخاں انگریز حکومت

کے ساتھ مصلحتاً تال میل بنا کر چل رہے تھے۔ اس لیے اس کا بھی انھیں فائدہ ملا اور ان کی تحریروں پر حکومت کو خصوصی توجہ دینی ہی پڑتی تھی۔ حالانکہ ان کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی اورتہذیب الاخلاق کو سماج کے ایک بڑے طبقے کی مخالفت بھی جھیلنی پڑی، لیکن بڑی تعداد میں لوگ اس پرچے کی کفالت بھی کررہے تھے، اس کے باوجود مالی وسائل کے محدود ذرائع، آمدنی کے وسائل کا نہ ہونا، طباعت واشاعت کے اخراجات، سرسید کی اپنی دیگر مصروفیات، محدود اشاعت اور اشتہاروں کی اشاعت کا نہ ہونا، یہ ساری ایسی وجوہات تھیں جن سے منہ نہیں موڑا جاسکتا تھا۔ اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ انھیں عوام کے چند روپیوں سے پورا کرنا نہایت مشکل تھا۔ نتیجتاً سرسید کے اخبار ورسالے کو بھی بند ہوجانا پڑا۔ سرسید احمد خاں کے صحافتی دور کو ہم صحافت کا دور زریں کہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا کیونکہ انھوں نے صحافت کے جس اسکول کی بنیاد ڈالی اس کی پیروی کرکے ہی بعد میں اردو کے نامور صحافی اور ادبا پیدا ہوئے۔

سرسید احمد خاں کے وقت میں ہی لارڈ رپن کے عہد حکومت میں 7 دسمبر 1881 میں ورنیکلر پریس ایکٹ کو منسوخ کردیا گیا۔ جس سے صحافت کی آزادی کی راہ ہموار ہوئی اور اردو کے ساتھ ساتھ دوسری علاقائی زبانوں میں بھی اخبارات ورسائل نکلنے شروع ہوئے۔ جب اخبارات ورسائل زیادہ تعداد میں نکلنے شروع ہوئے تو اس شعبے میں بھی آمدنی کے نئے وسائل وذرائع کو تلاش کیا جانے لگا۔ اشتہارات شائع کرانے کا رجحان بڑھا جس کے بعد اردو رسائل کی صحافت میں کسی قدر سدھار شروع ہوگیا۔ اس وقت کے اہم مسائل تھے، قارئین کی کمی، ادبی مضامین کی بھرمار، ایک ہی قسم کے موضوعات کا شائع ہونا، سرکولیشن کی کمی، اشتہارات کا کم ہونا، ادارتی ذمے داریوں سے ناواقفیت، صحافت کے سخت قوانین، لیتھو طباعت کے مسائل، انگریز حکومت کا خوف، ان مسائل کی وجہ سے اردو مدیران پوری طرح صحافتی خدمات کو انجام دینے میں کامیاب نہیں تھے۔ محترمہ روشن آرا راؤ لکھتی ہیں:

> ''اسی دور میں لارڈ رپن کے عہد حکومت میں ورنیکلر پریس ایکٹ منسوخ
> کردیا گیا۔ صحافت کی آزادی سے دیسی اخبارات وجرائد عوامی احساسات

کے ترجمان بننے لگے اورعوام میں ان کی اہمیت بڑھی۔ نئے اخبارات وجرائد کو سامنے آنے کا موقع ملا تجارت کے اور صنعت کی طرف ترقیاتی اقدامات سے اشتہارات کا فن سامنے آیا۔ کسی حد تک مجلّاتی صحافت مالی اعتبار سے مستحکم ہونے لگی۔ لیکن اب بھی اشاعتیں محدود تھی۔'' (5)

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی یا غدر ایک ایسا سانحہ تھا جس نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہندوستانیوں کو ان کے اپنے ہی وطن عزیز میں الزامات اور سزا کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس بغاوت سے قبل اردو صحافت جو کامیابی کی بلندیوں پر تھی اور ملک کے تمام حصوں سے ڈھیروں اخبارات ورسائل نکل رہے تھے۔ اس پہلی جنگ آزادی کے بعد رینگنے لگی اور بڑی تعداد میں رسائل واخبارات بند ہوگئے۔ جب یہ معاملہ ٹھنڈا ہوگیا تب بھی اخبارات ورسائل کے لیے غیر ضروری پابندیاں عائد کردی گئیں اور اخبار ورسائل نکالنا بہت حوصلے کا کام ہوگیا۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید لکھتے ہیں:

''اردو صحافت کا آغاز غدر سے پہلے ہوا اور غدر کے بعد دہشت انگریزی کا دور شروع ہوا۔ انگریزوں نے اس ملک کو اپنے اقتدار کی آہنی زنجیروں میں جکڑ لیا اور دوسرے طبقات کی طرح اخبار نویس بھی اس زد میں آگئے بہرحال لکھنے والے اظہار خیال کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ نکال ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ غدر کے چند سال بعد اردو صحافیوں نے پرُزے نکالنے شروع کیے۔'' (6)

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے بعد پورے ملک پر انگریز قابض ہوگئے۔ انھیں یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اگر پریس کی آواز کونہیں دبایا گیا تو دوسری بغاوت سر اٹھا سکتی ہے اورانگریزوں کا یہاں رکنا محال ہوجائے گا۔ اس دور میں سرسید احمد خاں کا تہذیب الاخلاق، سائنٹفک سوسائٹی، اودھ اخبار، انجمن پنجاب، آگرہ اخبار وغیرہ اہم اخبارات تھے جو انگریزوں کی مخالفت میں بھی لکھنے سے باز نہیں آتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز کا دور رسائل کی صحافت کے لیے اور بھی پرفتن دور تھا۔

کانگریس کا 1885 میں قیام اور بعد میں مسلمانوں سے کانگریس کی دوری، بنگال کی تقسیم ایسے واقعات تھے جنھوں نے اردو صحافت کو نئے موضوعات دیے اور اردو اخبارات ورسائل میں ان حالات کو بہت زیادہ اچھالا گیا۔ بیسویں صدی کا آغاز صحافت کے ایک نئے اور جدید دور کا آغاز تھا۔ سرسید کے بعد کی نسل نے صحافت کو کامیابی کی نئی منزلوں سے ہم کنار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حسرت موہانی، مولانا ظفرعلی خاں، ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر ایسے صحافی تھے جو صحافت کے فن سے بھی آشنا تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ انھیں صحافت کے اصولوں کے ساتھ ساتھ ملک اور بیرون ملک کے حالات، انگریز حکومت کی پالیسیاں،عوام کا مزاج اور سماج کے مختلف مسائل کا پوری طرح علم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی صحافت میں ایک جدید رجان دیکھنے کو ملتا ہے اور اردو صحافت ایک مشن اور اعلیٰ معیار کے ساتھ آگے بڑھی ہے۔ سرسید کے دور میں مسلمان سیاست سے دور تھے لیکن حسرت موہانی نے مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے کو کہا اورخود بھی عملی طور سے سیاست میں حصہ لینے لگے۔ مسلمانوں کو بھی اس بات کا ادراک ہوا کہ وہ بھی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں اور ان کا بھی اتنا ہی اس ملک پر حق ہے جتنا دوسری قوموں کا ہے۔

اس دور کے حالات ایسے نہ تھے کہ رسائل کو آسانی سے بحسن وخوبی جاری رکھا جاسکے کیونکہ آمدنی کے کم وسائل اور اشتہارات کی کمی جیسے مسائل سے سبھی کو نبرد آزما ہونا پڑرہا تھا۔ اسی دوران 1910 میں نافذ کیے گئے پریس ایکٹ نے ادبی صحافت کے مسائل میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس ایکٹ کو نافذ کرنے کا مقصد ہندوستان کے اخبارات پرانگریز حکومت کی پکڑ مضبوط کرنا تھا۔ یہ قانون برطانوی بلوچستان،سنتھال پرگنہ سمیت پورے برٹش انڈیا میں نافذ ہوا تھا۔ اس ایکٹ کے ذریعے کتاب، دستاویز، اخباروں، چھاپا خانوں کے لیے نئے قانون بنائے گئے اوران کے تحت مختلف شائع شدہ صفحات کوتقسیم کردیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت ضمانت کی رقم بہت زیادہ بڑھادی گئی۔ انھیں جمع نہ کرنے کی صورت میں جرمانہ یا جیل کی سزا دی جاتی تھی۔ کسی خصوصی صورتِ حال میں ضمانت ضبط کرنے کا پورا حق انگریز حکومت کوتھا۔ برطانوی فوج یا کسی سپاہی اور برطانوی حکومت کے خلاف کسی

طرح کا مواد شائع کیا جانا سنگین جرم تھا۔ کسی شخص کو حکومت کے خلاف بھڑکانا، اکسانا، کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حکومت کسی بھی اخبار یا رسالے یا چھاپہ خانے پر جب چاہے تلاشی کی کارروائی انجام دے سکتی ہے۔ ضمانت ہر دفعہ جمع کرانی ہوتی تھی۔ نہ جمع کرانے کی صورت میں اخبار ورسالے کو بند کرادیا جاتا تھا۔ اس طرح کے معاملات کی سنوائی خصوصی عدالت کرتی تھی۔ ڈاک سے بھیجی جارہی اشاعتوں کو روک دینے کا حکومت کو حق حاصل تھا۔

اتنے سخت قوانین کی وجہ سے ادبی صحافت کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی تعداد میں اخبارات ورسائل بند ہونے لگے۔ جے نٹراجن لکھتے ہیں:

> ’’1910 کے پریس ایکٹ کولاگو کیے جانے سے کئی اخبار ضمانت کی رقم جمع کروانے میں ناکام رہے اور 1913 تک کئی اخبار بند ہوگئے۔ 173 سے زیادہ نئے پریس اور 129 نئے اخبارات ضمانت کی زیادہ رقم مانگے جانے کی وجہ سے آغاز کے وقت ہی ختم ہوگئے۔ کیونکہ اتنی بڑی رقم وہ نہیں دے سکتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ مختلف پریس اور اخبارات زیادہ رقم کی مانگ کی وجہ سے قائم نہیں ہوسکے۔ اس قانون کی وجہ سے ہی انھیں ضمانت سے چھٹکارا نہیں مل سکا۔ قانونی طور پر ضمانت سے چھٹکارے کی مانگ کی جارہی تھی۔ پرانے پریس پر اس ایکٹ کا اور بھی برا اثر پڑا۔‘‘ (7)

ادبی صحافت کی صورت حال بہت ہی زیادہ دگرگوں ہوچکی تھی۔ رسائل کے لیے نہ تو کوئی واضح رہنما خطوط تھے اور نہ ہی ان کا کوئی پرسان حال تھا۔ جہاں لوگوں کو کھانے کے لیے نہیں مل رہا تھا وہاں رسائل پڑھنے کا وقت کس کے پاس تھا۔ رسائل کی صحافت اس وقت صرف اور صرف نقصان کا سودا تھی۔ جو تھوڑے بہت رسائل نکل رہے تھے وہ قرضوں کے بوجھ تلے دبے تھے یا ضمانت کی رقم دینے کے قابل نہیں تھے۔ اس دور میں نکلنے والے تمام بڑے رسائل پر اس ایکٹ کا برا اثر پڑا۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ اردو مجلّات بھی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے:

> 1910 کے پریس ایکٹ نے مجلّاتی صحافت کو مزید نقصان پہنچایا جس کے خلاف ملک بھر میں صحافیوں نے احتجاج کیا اور ہڑتالیں ہوئیں اس قانون کی رو سے ہر نئے اخبار یا رسالے کے اجرا سے پہلے ہی ضمانت طلب کی جاسکتی تھی۔ حسرت موہانی کے اردوئے معلیٰ کے خلاف پریس ایکٹ کے تحت کارروائی کی گئی۔ جنگ عظیم اول کے دوران محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، ظفر علی خاں سب کو نظر بند کردیا گیا۔ الہلال، ہمدرد، کامریڈ اور زمیندار کی اشاعتیں منسوخ ہوئیں۔ سیاست پر پابندی کے ان دنوں میں مولانا ظفر علی خاں نے خصوصی اجازت کے تحت کرم آباد سے ہفتہ وار 'ستارہ صبح' جاری کیا۔ جو غیر سیاسی، اور علمی، ادبی مجلّہ تھا۔ اس کا بھی ہر مضمون چھپنے سے پہلے سنسر ہوتا، محدود موضوعات اور سنسر کی پابندیوں میں یہ مجلّہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔"(8)

ایسے حالات میں بھی اردو کے رسائل نے ہار نہیں مانی اور لگاتار شائع ہوتے رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالوں کو کئی دفعہ پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ متعدد بار ضمانت ضبط ہوئی لیکن اس کے باوجود مولانا نے حوصلہ نہیں ہارا اور انگریز حکومت کے سامنے سینہ سپر رہے۔

پریس ایکٹ کے نافذ ہونے کے باوجود ادبی صحافت ترقی کی راہ پر بڑھتی رہی۔ اردو مجلّات نے انگریزوں کے ظلم وزیادتی کے خلاف تو آواز اٹھائی لیکن اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی خراب صورتِ حال، تعلیم کی کمی، سیاسی نظریات کے فروغ دینے میں مجلّات نے اہم کردار ادا کیا۔ مختلف سیاسی وسماجی حالات پر مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو مذہب کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کی جانب راغب کرنے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے بھی رسائل نے کوششیں شروع کیں۔ غیر ملکی ادب کو اردو میں ترجمہ کرکے پیش کیا گیا۔ مختلف ممالک کی عوام کی صورتِ حال اور حکومت کی پالیسیوں کو ہندوستانی عوام کے سامنے لایا گیا تاکہ وہ ترقی یافتہ قوم کی صف میں شامل ہوسکیں۔ رسائل نے عوام سے

ہرسطح پر رشتے استوار کیے اور انھیں ایک ایسا پلیٹ فارم دیا جہاں سے وہ اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کرسکتے تھے۔ اس دور میں رسائل کو عوام کا بھرپور تعاون حاصل ہوا۔ رسائل کو پڑھنے کا عوام میں نیا شوق جاگزیں ہوا اور رسائل بھی قارئین کی پسند و ناپسند کو دھیان میں رکھنے لگے۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں اشتہارات دینے کی شروعات بھی ہوئی۔ اردو کی ادبی صحافت کو ایک مقصد کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ لوگوں میں سیاسی وتعلیمی شعور کی بیداری، انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو متحد کرنا، ملک کو انگریزی حکومت کے قبضے سے آزاد کرانا، اعلیٰ قسم کی فکر کو عام کرنا، کچھ ایسے مقاصد تھے جنھیں سامنے رکھ کر رسائل نے اردو صحافت کے آگے بڑھنے کی راہ ہموار کی۔ ان مقاصد کی تکمیل اور عوام میں ایک بہتر سماجی واخلاقی شعور بیدار کرنے کی کوشش کے نتیجے کے طور پر کئی اہم رسائل کی شروعات ہوتی ہے۔ جن میں دلگداز،مخزن، نقاد، اردو، ساقی، ہزارداستان، ستارہ صبح، فانوس خیال، زمانہ، معارف، جامعہ، رومان، ادیب، ادب لطیف، نیا ادب، نیرنگ خیال، سویرا جیسے رسائل کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں رسائل نے نت نئے تجربے بھی شروع کیے اور مختلف قسم کے مجلّے نکلنے شروع ہوئے۔ بچوں و خواتین کے خالص ادبی وتصویری رسالے شروع کیے گئے۔ رومان پسند تحریک اور ترقی پسند تحریک کی شروعات نے رسائل کی رفتار کو اور بھی جلا بخشی۔ اب مجلّات کے ایڈیٹروں کو نہایت عزت واحترام سے دیکھا جانے لگا۔ بڑی تعداد میں عوام رسائل کی جانب راغب ہوئے۔ لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پروان چڑھا اور ہندوستانی عوام احساس کمتری سے نکل کر باہر آئے۔ اشاعتیں بڑھنے لگیں، قاری کی تعداد بڑھی، سرکولیشن بڑھا، اس کے علاوہ عوام سے رابطے کے لیے رسائل کا سہارا لیا جانے لگا۔ مضمون نگاروں کو ان کے مضامین کی اشاعت پر معاوضہ دیا جانے لگا۔ جس سے لوگوں میں لکھنے پڑھنے کا حوصلہ بڑھا اور مالی وسائل بھی فراہم ہوئے۔ ظاہر ہے کہ قاری کی تعداد کے ساتھ ساتھ اشاعت بھی بڑھنے لگی تو اشاعت و طباعت، کتابت اور مضامین و ادارت پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس دور میں ادبی صحافت کو مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا، لیکن اس وقت کے مسائل کم تھے۔ کیونکہ 1921 میں

پریس ایکٹ میں ترمیم کی گئی تھی، جس کے بعد صحافت کو کسی حد تک راحت ملی۔ اس ایکٹ کو ختم کروانے میں سرتیج بہادر سپرو کی کوششیں شامل تھیں۔ اس دور کی مجلّاتی صحافت کی حالت کو روشن آرا یوں بیان کرتی ہیں:

> ''اس دور میں بھی مجلّاتی صحافت کو مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن میں اہم مسئلہ صحافتی قوانین کا تھا، جن کے خلاف مجلّاتی صحافت کو جہاد کرنا پڑا۔ اشاعتیں منسوخ ومعطل ہوئیں۔ اس کے باوجود مجلّات عوامی تائید میں جاری وساری رہے یہ دور متنوع موضوعات پر مضامین کی اشاعت میں تزئین وآرائش اورتصویری صحافت کی دنیا میں انقلاب کادور تھا۔ الہلال پہلاہفت روزہ تھا جس میں تصاویر کی اہمیت نمایاں ہوئی اور تصاویر پیش کی جانے لگیں۔ اسی دور میں طباعت کے نت نئے تجربات بھی ہوئے۔ ہفت روزہ 'الہلال' نے ٹائپ نسخ اختیار کیا مولانا محمد علی جوہر نے ہمدرد کی پہلی اشاعت کاآغاز ہی نسخ ٹائپ سے کیا۔ کتابت میں جدت اورتنوع کے انداز اختیار کیے گئے۔ اشتہارات کی کمی، چندے کی ادائیگی میں تساہل اور سرمایے کی کمی کے باوجود مجلّاتی صحافت کا یہ دور نہایت اہم ہے۔ اس دور میں جاری ہونے والے مجلّات خاص مقصدیت اورمشن رکھتے تھے جو اس دور کے عوام کی آواز تھی۔ پھر ان مجلّات کوعوامی تائید بھی حاصل رہی کیونکہ یہ مجلّات عوام کی تربیت اورنمائندگی کافریضہ جس خلوص سے انجام دے رہے تھے، انسانوں کی دنیا میں اس خلوص کی حرمت کی حفاظت کی جاتی ہے۔علم وادب اور سیاسی افق پر جگمگاتے ستاروں کی طرح ان صحافیوں اور ایڈیٹروں نے اپنے مقام کوتسلیم کروایا۔'' (9)

تقسیم ہند اورملک کی آزادی سے قبل کا دور ادبی صحافت کا زریں دور تھا۔آج جتنے بھی رسالے شائع ہورہے ہیں یہ سارے رسالے بیسویں صدی کی ادبی صحافت کے رجحانات سے متاثر ہیں۔ اس دور میں ساقی، زمانہ، بیسویں صدی، شاعر،اردو، آجکل، ندیم

جیسے رسالے ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچنے لگے تھے اور اردو شعروشاعری کو فروغ دینے میں ان رسائل نے اہم کردار ادا کیا۔ کاروباری اعتبار سے بھلے ہی یہ دوراد بی صحافت کے لیے سود مند نہیں تھا لیکن عوامی سطح پر قاری کا رسائل سے رشتہ استوار کرنے میں ان مجلّات نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ ان مجلّات کا مقصد ہی اعلیٰ سطح کے ادب کا فروغ اور ملکی وغیرملکی حالات وواقعات سے لوگوں کو واقف کرانا تھا۔ اپنے ان مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے مجلّات نے کبھی بھی مالی وسائل کی کمی اور مالی نقصان کی پرواہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے قبل کی ادبی صحافت نے کامیابی کی نئی منزلیں طے کیں اوراسے ادبی صحافت کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔ آزادی کے بعد ملک کے حالات بہت زیادہ خراب ہوگئے اوراخبارات ورسائل کا بڑی تعداد میں ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان تبادلہ ہوا۔ آزادی سے قبل اردو زبان وادب کی ترقی کی ایک نئی تاریخ لکھی جارہی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد اردو کومسلمانوں کی زبان بتا کر اسے الگ تھلگ کردیا گیا۔ اردو رسائل واخبارات کے پاس مالی وسائل اورقارئین کی بہت زیادہ کمی ہوگئی۔ تقسیم ہند کا سانحہ اتنادرد ناک اوراذیت ناک تھا کہ لوگ اپنوں کو ڈھونڈنے میں ایسے مصروف تھے کہ مجلّات واخبارات کو کہاں خاطر میں لاتے۔ حکومت کے سرد رویے نے اردوصحافت واردو زبان کو نقصان پہنچایا اورآزادی کی تاریخ رقم کرنے والی زبان ایک محدود طبقے کی زبان بن کر رہ گئی۔ ہندوستان میں بڑی تعداد میں اخبارات ورسائل کو مالی مشکلات ومختلف مسائل کی وجہ سے بندکردیا گیا۔ کچھ برسوں کے بعد حالات جب درست ہوئے تو لوگوں نے رسائل واخبارات کی نئے سرے سے شروعات کی لیکن اب مالی وسائل اورمشینری کے علاوہ کاغذ کی فراہمی، مہنگائی، اشتہارات کی کمی، قاریوں کی کمی ایسے مسائل سامنے تھے جن سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔ رسائل واخبار جاری کرنے کے لیے مدیران کے پاس سرمایہ بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ صحافتی قوانین بھی سخت کردیے گئے تھے۔ معاشرتی وسماجی مسائل بڑھ گئے تھے۔ مسلمانوں میں عجیب کسمپرسی کی حالت پیدا ہوگئی تھی۔ آزادی کے بعد کے حالات پر معروف صحافی پروانہ ردولوی لکھتے ہیں:

''اردو کے صحافیوں کو آزادی سے قبل جن حوصلہ شکن، سخت اور اذیت ناک مرحلوں سے گزرنا پڑا، آزادی کے بعد ان سے بھی برے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ آج بھی ماقبل آزادی کے زمانے ہی کی طرح ان پر مقدمات قائم کیے جاتے ہیں۔ ان سے ضمانتیں طلب کی جاتی ہیں انھیں طرح طرح کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ قیدوبند کے مرحلوں سے انھیں گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے اخبارات کو سرکاری اشتہارات نہیں دیے جاتے ہیں انھیں ایکری ٹیشن نہیں دیا جاتا اوران کو سرکاری دوروں اور قومی تقریبات تک سے دور رکھا جاتا ہے۔'' (10)

پروانہ ردولوی کی مذکورہ بالا عزیزوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آزادی کے بعد تقریباً 30-20 برسوں تک صورتِ حال کافی خراب رہی۔ اردو صحافیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا لیکن بعد کے حالات کچھ بہتر ہوئے ہیں اور بڑی تعداد میں اچھے اردو صحافی منظر عام پر آئے۔

ادبی صحافت کے امکانات

رسائل کی صحافت کے یوں تو بہت سارے مسائل رہے ہیں لیکن بنیادی طور پر سب سے بڑا مسئلہ حکومت کی طرف سے عدم تعاون کا رہا ہے۔ اردو اخبارات ورسائل کو حکومت کی سرپرستی کبھی حاصل نہیں رہی ہے۔ حکومت کے غیر جانب دارانہ رویے سے نہ تو انھیں اشتہارات ملتے تھے اور نہ ہی مالی امداد جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں رسائل واخبارات دم توڑ دیتے ہیں۔ اردو اکادمیوں کا قیام اس لیے ہی کیا گیا تھا کہ وہ اردو کے فروغ اور مسائل کے لیے کام کریں لیکن ارد و اکادمیاں کانفرنس اور سیمینار کرا کر واہ واہی لوٹ رہی ہیں۔ اردو صحافت کا کوئی پرسان حال نہیں رہا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو رسائل کے ساتھ جو مسائل رہے ان میں صحافتی مہارت کی کمی، حکومت کا عدم تعاون، اشتہارات کا کم ہوجانا، گیٹ اپ اورآرائش کی کمی، قارئین کی کمی، طباعت کا خراب معیار، موضوعات

میں تنوع کی کمی، کاغذ اور مہنگائی کا مسئلہ، تعداد اشاعت، سرکولیشن کا نہ ہونا جیسے مسائل قابل ذکر ہیں۔

اردو کے ادبی رسائل کے قاری کی تعداد میں کافی کمی آگئی جس کی وجہ سے مجلّات بہت کم تعداد میں شائع ہونے لگے۔ مشینوں کا دور شروع ہونے سے بھی رسائل پر برا اثر پڑا ہے۔ لوگ ٹی وی اور انٹرنیٹ کی دنیا میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ مجلّات خرید کر پڑھ سکیں۔ 70 کی دہائی میں ڈائجسٹوں اور پاپولر ادب کی شروعات ہوتی ہے۔ انھوں نے ادبی رسائل کی مقبولیت کو اور بھی دھچکا پہنچایا۔ کم قیمت پر رنگ برنگی تصاویر سے مزین رسالوں کو ہر کوئی پڑھنا چاہتا تھا۔ پاپولر ادب کے کچھ رسائل کافی مقبول ہوئے اور کچھ تو آج بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ اردو زبان کی ترقی میں ان ڈائجسٹوں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن ادبی رسائل کی ناکامی میں بھی ان کا ہاتھ رہا ہے۔ روشن آرا راؤ لکھتی ہیں:

> ''مجلّات کا یہ زوال اخبارات کے خصوصی نمبروں، میگزین، سوسائٹی میگزین اور ڈائجسٹ رسالوں کی وجہ سے بھی ہوا اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ علمی وادبی جرائد جدید معیار اور تقاضوں کے مطابق مرتب نہیں کیے جاتے۔ اخبارات کے مخصوص موضوعات سے متعلق صفحات سے مقابلہ جاری ہے۔ جن کے پاس وافر اشتہارات ہوتے ہیں اور اشاعتیں زیادہ ہونے کی وجہ سے قیمت کم متعین کی جاتی ہے۔ مواد کی کثرت اور موضوعات کا تنوع اخبارات کی اہمیت بڑھادیتا ہے۔ عام قاری زیادہ قیمت کی ادائیگی سے گھبرا کر کم قیمت پر اخبار کو اہمیت دینے پر مجبور ہوتا ہے۔'' (11)

روشن آرا راؤ کی باتیں بالکل درست ہیں کیونکہ ادبی رسائل مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے مختلف مشکلات سے دوچار ہوجاتے ہیں۔ محدود موضوعات اور قاری کی کمی کے باعث بھی طباعت واشاعت میں مشکلات آتی ہیں اور نتیجتاً ادبی رسائل کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسری جانب پاپولر ادب انسان کی اپنی زندگی، اپنے معاشرے کے منظرنامے کو پیش

کرتا ہے۔ سطحی قسم کا ادب ہوتے ہوئے بھی اس میں ایک عام انسان کی اپنی داستان ہوتی ہے۔ آج کا قاری ڈائجسٹوں سے اس لیے قریب تر ہوگیا ہے کیونکہ اسے جدیدیت، مابعد جدیدت، ساختیات اوردوسری تحریکوں سے متاثرہ ادب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اسے ایک ایسا تفریحی ادب چاہیے جو اسے تھوڑے وقت کے لیے آسودگی فراہم کرے جس میں اسے ایسا چین وسکون نصیب ہو جس سے اس کی دن بھر کی تھکن دور ہو۔ عام قاری کو مغرب کی تحریکوں اوررجحانات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ادب میں آئے دن نت نئے تجربے ہوتے ہیں۔ علامت، انداز بیان، ادبی پیچ وخم کے ذریعے ادب کے نام نہاد قلمکاروں نے ادب کو اتنا زیادہ مشکل بنا دیا ہے کہ ایک عام قاری اس سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اچھا ادب وہی کہلاتا ہے جو خالصتاً ادب ہو اورانسان کی، معاشرے کی، سماج کی عکاسی کرے۔ ادب کی پیدائش ہی انسانی معاشرے کی سچائی پر ہوئی تھی لیکن آج ادب تو ہے لیکن اس میں سے انسان نکل چکا ہے۔ اس میں اس قدر پیچیدگی پیدا کردی گئی ہے کہ ایک عام قاری کو پڑھنے سے پہلے مختلف رجحانات وتحریکوں میں الجھنا پڑتا ہے۔ ادب کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو عام قاری کے لیے ہو۔ ترقی پسند تحریک ابھی تک کی سب سے کامیاب تحریک اس لیے ہے کیونکہ اس میں ایک عام انسان کی بات کی گئی ہے۔ اس میں زندگی کو زندگی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس تحریک کی کامیابی کی دلیل یہی ہے کہ آج کوئی دوسرا پریم چند،منٹو،عصمت، بیدی، کرشن چندرنہیں پیدا ہوسکا۔

اردو کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے قلمکار ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ انھوں نے ایک عام قاری کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہی لکھا جو حقیقت تھی۔ تحریروں کے ذریعے اسے سامنے لانے کی کوشش کی جو معاشرے وسماج میں وقوع پذیر ہورہاتھا۔ رسائل کوکسی تحریک یارجحان سے بالاتر ہوکر ایک عام قاری کو ذہن میں رکھنا چاہیے اور ایسی تخلیقات پیش کرنی چاہئیں جن سے سماج و معاشرے میں اچھا تاثر جائے۔ رسائل کو آمدنی کا ذریعہ نہ سمجھا جائے، جانب داری نہ برتی جائے، پوری کوشش کی جائے کہ رسائل سے نیا طبقہ، نئے قاری جڑیں، ہر ماہ مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں

وشاعروں کی تخلیقات پیش کی جائیں۔ اس کے علاوہ قاری کی ذہنی تربیت کو بنیادی مقصد بنانا چاہیے۔ جیسا کہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''جب تک ادبی رسائل کے لیے شاعری، فکشن اور مضامین کا انتخاب پیش نظر تحریروں کی قدر وقیمت کی صحیح تعین اور اپنے آپ کو فی الامکان معروضی بنا کر نہ کیا جائے گا اس وقت تک رسائل کے معیار میں کوئی نمایاں تبدیلی ممکن نہ ہوگی۔ ہم انتخاب کی معروضیت کو اکثر معمولی مادی مفادات پر قربان کردیتے ہیں جس کا کوئی باضمیر آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مشاعروں میں بلائے جانے کی خواہش، سیمینار میں مدعو ہونے کی توقع یا کسی کمیٹی کا ممبر بننے کی تمنا اگر تحریروں کے انتخاب میں حائل نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اچھی تخلیقات اور اچھے مضامین پر بعض اوقات ادنیٰ درجے اور عموماً ادنیٰ درجے کی چیزوں کو ترجیح دی جائے۔ اسی سے ہم نئے لب ولہجے اور تازہ واردان ادب کو کہیں متعارف نہیں کرا پاتے۔

ادب میں ایک ساتھ کئی دھارے چلتے ہیں اور ان دھاروں میں اگر زندگی کی رمق ہے تو یہ ادب کی روایت کا حصہ بن جاتے ہیں تو پھر ہم کیوں کسی رسالے کے مزاج اور اس کی پالیسی کے مسئلے کو اتنا متشدد اور سخت کردیں کہ دوسرے مکتب فکر اور طرز اظہار کو اپنانے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ میں ادبی جرائد کے مدیروں کی ان تین ذمہ داریوں پر اصرار کرنا چاہتا ہوں کہ جنھیں ہر صنف ادب میں فکری اختلافات اور فنی تجربوں کا احترام کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے رسالے کے ہر شمارے میں ایک یا دو نئے اور TALENTED ادیب ضرور متعارف کرائے جائیں (یہاں یہ بات واضح رہے کہ نئے کے مقابلے میں TALENTED) کے لفظ پر زیادہ زور دے رہا ہوں، تیسری بات جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ ہمیں ادبی رسائل کے ذریعہ بالغ نظر ادیبوں

اور تسلیم شدہ فن کاروں کے ذوق احساس کی تسکین کے سامان کی فراہمی

کے ساتھ اپنے قاری کی ذہنی تربیت کو بنیادی مقصد بنانا چاہیے۔'' (12)

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی مذکورہ بالا باتوں سے کسی حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے انھوں نے Talented کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ایسے قابل اور لائق قلم کاروں کو جگہ ملنی چاہیے لیکن لائق قلم کار کو پرکھنے اور ناپنے کا کیا معیار ہوگا۔ اسے بھی واضح کردینا ضروری ہے۔ کوئی قلم کار جب لکھتا ہے اور اس کی تحریر شامل اشاعت کی جاتی ہے تو اسے ایک نیا حوصلہ ملتا ہے اور وہ دوبارہ اور بہتر انداز میں لکھتا ہے۔ تحریر میں نکھار تبھی آتا ہے جب لگاتار کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی قلم کار نے کچھ لکھا اور رسالے کے مدیر نے اسے شائع نہیں کیا یا وہ مضمون یا افسانہ رسائل کی پالیسی پر پورا نہیں اترتا تو اس بیچارے قلم کار کے دل پر کیا گزرے گی۔ کوئی بھی قلم کار بڑا تبھی بنتا ہے جب اس کی تحریریں مقبول عام ہوتی ہیں اور مقبول عام ہونے کے لیے اس کا شائع ہونا ضروری ہے۔ ابوالکلام قاسمی کی یہ بات واقعی قابل ذکر ہے کہ قاری کی ذہنی تربیت کو بنیادی مقصد بنانا چاہیے۔ رسائل کے مدیروں کو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے۔ قاری کی تربیت کرنا ہی سب سے بڑا مقصد ہونا چاہیے۔ قاری کو ایک دم سے ادب کی پیچیدہ تحریروں میں نہ الجھا کر اسے دھیرے دھیرے ادب خوانی کی تربیت دینی چاہیے۔ تبھی ایک عام قاری رسالے کے قریب آئے گا۔ مخصوص اسلوب، لفظیات اور ایک ڈگر سے ہٹ کر کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش رسالے کی ترقی میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اشاعت میں اضافہ کرنے کے لیے علمی وادبی موضوعات میں تنوع کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ادب میں عام انسان کی زندگی کی عکاسی سے ادب کو پرکشش بنایا جاسکتا ہے۔

ادبی رسائل میں ادب وزبان سے متعلق سرگرمیوں کا تذکرہ کیا جائے۔ کوشش ہو کہ بہتر اور مثبت رخ کو پیش کیا جائے۔ ہمیشہ اردو کی بے بسی کا رونا رونے سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہونے والا ہے۔ ادب کو عام انسان تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ ادب میں مادہ پرستی کی تشہیر کم سے کم کی جائے۔ مغرب کی تقلید کرنے کی بجائے اپنے

قاری پر توجہ مرکوز کر کے اپنے مسائل وحالات کو موضوع بنایا جائے تو یقیناً ادبی رسائل کے مسائل کم کیے جاسکتے ہیں۔ ادبی رسائل کو کاروبار،تجارت یاصنعت سے دور رکھا جائے۔ ادب کبھی بھی تجارت کا ذریعہ نہیں رہا ہے ادب کو ذہنی آسودگی کا سامان سمجھا جائے اور ذہنی تربیت کا ایک ذریعہ بھی۔ ادب برائے زندگی کے مقولے پر عمل کر کے ادب کو سنوارا جاسکتا ہے اور ادبی رسائل کی اشاعت میں بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔تحریروں، زبان، انداز بیان، اسلوب اور پیش کش کو بہتر بنایا جائے تا کہ عام قاری ادب کی طرف متوجہ ہو۔

اس بات سے قطعی انکار ممکن نہیں کہ خالص ادب اورشاعری کی ترسیل وترقی میں ادبی رسائل کا کلیدی رول رہا ہے۔ اردوئے معلٰی، الہلال والبلاغ، اردو، دلگداز، ساقی، ادب لطیف،مخزن، زمانہ، ہمایوں، ادبی دنیا، شاعر، شب خون، کتاب نما، سب رس، آہنگ،ندیم، کتاب، سوغات جیسے رسالوں نے اپنے مختلف ادوار میں جو بیش بہا نگارشات وتخلیقات پیش کی ہیں، ان کی مثال نہیں ملتی۔ ان رسائل نے بڑی تعدا د میں ادیب، نقاد،محقق، شاعر پیدا کیے۔نئی تحریکوں اور رجحانات کی ترقی میں قدم سے قدم ملا کر ساتھ دیا۔

آزادی کی لڑائی میں اردو رسائل نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مختلف رسالوں نے انگریزوں کے ظلم وبربریت کی کہانیوں کو عام کیا۔ آزادی کے بعد کے حالات ایسے نہیں تھے کہ اردو رسائل بحسن وخوبی پہلے کی طرح شائع ہوتے رہتے۔ آزادی کے بعد سے لے کر آج تک یہ بہت بڑا سوال ہے کہ اردو کا مستقبل کیا ہوگا۔ آنے والے وقتوں میں اردو زندہ رہے گی یاقصہٴ پارینہ بن جائے گی۔ آج جب اردو کی تعلیم وتربیت کے وسائل کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں، اردو اخبارات ورسائل بند ہورہے ہیں، اردو میں روزگار کی کمی ہے،اب ایسی صورت حال میں اردو کے مستقبل پرسوال اٹھ رہے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اردو کی موجودہ حالت کی بات کریں تو یہ ایک اندازے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ادھر کچھ برسوں سے اردو کی صورت حال بہت حدتک بہتر ہوئی ہے اور روزگار کے مواقع بھی بڑھے ہیں۔ اس خوشگوار تبدیلی کی وجہ نئے نئے روزگار کا پیدا ہونا اور اردو کو جدیدوسائل سے جوڑ دیاجانا ہے۔ اگر آج بھی لوگ اردو کے تئیں سنجیدہ ہوجائیں اور اردو

والے اردو کے لیے ایمانداری سے کوشش کریں تو یقیناً یہ زبان ترقی کرے گی۔ اردو کو مسلمانوں سے جوڑ دیا گیا ہے جو اردو کی ناکامی کا ایک سب سے بڑا سبب ہے۔ اردو کے جاننے والے زیادہ سے زیادہ غیر مسلم حضرات ہونے چاہئیں۔ غیر مسلموں میں اردو کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کرایا جائے۔ اسکول اور کالج کی سطح پر اردو کی تعلیم کو ضروری قرار دیا جائے۔ اردو کے لیے قاری پیدا ہوں گے تو یقیناً اردو میں طباعت اوراشاعت بڑھے گی اورزبان کی ترقی بھی ہوگی، اردو زبان ہندوستان کی دوسری سب سے بڑی زبان ہے۔ اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں میں ہے۔ اس زبان میں نکلنے والے رسائل کی تعداد بھی کم ہے۔ اگر ادبی رسائل کے علاوہ ہم دوسرے رسائل کی بات کریں تو اردو زبان میں بھی ایسے رسائل بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں اوران کے قاری کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ادبی رسائل کی ترتیب وہیئت میں تبدیلی بھی ان کی ترقی میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ یکسانیت اورایک قسم کے انداز پیش کش سے ادبی رسائل اور بھی محدود ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ماہنامہ شاعر کے مدیر افتخار امام صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ادبی پرچوں کے مقابلے میں فلمی اور مذہبی رسائل کی تعداد اشاعت اوران کے قارئین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں تنوع ہے۔ ترتیب وہیئت میں جدت ہے جبکہ ادبی رسائل ان تمام خوبیوں سے تقریباً خالی ہیں۔ یکسانیت اورایک ہی طرح کا انداز پیش کش قارئین کی تعداد میں اضافہ نہیں کرتا۔ کیونکہ ادبی رسائل جتنے بھی شائع ہوتے ہیں وہ اپنا ایک مخصوص حلقہ بنالیتے ہیں اورقارئین اس طرح تقسیم ہوجاتے ہیں اگر ادبی رسائل میں تنوع ہو، کشش ہو، جدت ہو تو قارئین بھی تقسیم نہیں ہوں گے۔'' (13)

افتخار امام صدیقی نے مذکورہ بالا باتیں ایک طویل عرصے تک ادارت کے فرائض انجام دینے کے بعد اپنے تجربے کی بنیاد پر کی ہیں۔ اردو کا سب سے قدیم رسالہ شاعر 81 سال سے نہایت پابندی کے ساتھ کیوں شائع ہورہا ہے۔ کبھی بھی اس کی اشاعت کیوں

موقوف نہیں ہوئی۔اردو کا کوئی بھی رسالہ اتنی طویل عمر نہیں پا سکا۔ ان سوالوں کا جواب افتخار امام صدیقی کی اوپر لکھی سطروں میں موجود ہے۔ شاعر کبھی کسی تحریک یا رجحان کا ترجمان نہیں رہا، صرف اورصرف ادب کی خدمت کو مقصد بناتے ہوئے اردو زبان واردو صحافت کی آبیاری کرتا رہا۔ شاعر نے بدلتے وقت کے ساتھ کافی نئے تجربے کیے اور موجودہ زمانے کی تبدیلیوں کو خوشی خوشی قبول کیا۔ اردو کی نئی بستیاں، شعری عنوان، قارئین سے مکالمہ اور بحث ومباحثہ پر مبنی مختلف نئے کالموں کی شروعات نے شاعر کو کبھی بھی ناکامی کا سامنا نہیں کرنے دیا۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ مختلف شعبوں میں ترقی ہوتی ہے اور اتنی بڑی دنیا اب ایک چھوٹی سی بستی میں تبدیل ہوکر رہ گئی ہے۔ پہلے لوگوں کے پاس وسائل نہیں ہوتے تھے۔ ٹی وی، ٹیلی فون، موبائل،انٹرنیٹ جیسی سہولیات سے لوگ ناآشنا تھے۔ کتاب ورسائل کے پڑھنے کا لوگوں کے پاس وقت ہوتا تھا لیکن آج حالات تبدیل ہوچکے ہیں۔ لوگوں کے پاس نہ تو اتنا وقت ہے کہ وہ رسائل پڑھیں اورنہ ہی رسائل کے پاس اتنے وسائل کہ وہ قاری کو خود سے جوڑ سکیں۔ رسائل مخصوص موضوعات سے باہر نہیں آپاتے۔ وہی ایک جیسے افسانے، غزلیں، نظمیں اور سبھی نگارشات میں یکسانیت کے ہونے سے بھی رسائل کافی محدود ہوکر رہ جاتے ہیں۔آج لوگوں کی پسند تبدیل ہوچکی ہے۔ اس کی دلچسپی رنگ بدلتی دنیا میں ہے۔ اس کی دلچسپی دنیا کے مختلف علوم وفنون سے بہرہ ور ہونے کی ہے، لیکن ادبی رسائل قارئین کے اس ذوق پر پورے نہیں اترتے ہیں۔

ادبی رسائل کا ایک بڑا مسئلہ سرکولیشن کا بھی ہے۔اردو اخبارات ورسائل کی نہ تو مارکیٹنگ کی جاتی ہے اور نہ ہی نئے قاری پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اردو کے بڑے بڑے رسالے ہندوستان کے اہم شہروں تک نہیں پہنچ پاتے۔ بہت سارے لوگ صرف اس لیے اردو رسائل سے دور ہوگئے کہ انھیں وقت پر رسائل ملتے ہی نہیں ہیں۔ دوسری زبان کے رسائل واخبارات جب اتنی بڑی تعداد میں شائع ہورہے ہیں تو پھر اردو کے ساتھ کیوں مسئلہ ہے۔ اردو کا قاری کیوں اردو کا رسالہ یا اخبار نہیں پڑھنا چاہتا ہے۔ کیوں وہ انگریزی اخبارات ورسائل کو ترجیح دیتا ہے۔ اردو اخبارات ورسائل کے قارئین کے تعلق سے ایک

بڑا جائزہ لیا جائے جسے اردو اکادمیاں بخوبی انجام دے سکتی ہیں اور اس سروے کی بنیاد پر لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ اردو جاننے والے تمام لوگوں کو اردو رسائل واخبار خرید کر پڑھنے کی تربیت دی جائے۔ یونیورسٹی، اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کو اردو اخبار ورسائل خرید کر پڑھنے کو لازمی بنا دینا چاہیے۔ قاری بڑھیں گے تو اشاعت بھی بڑھے گی اور جب اشاعت بڑھے گی تو اشتہارات، اخراجات، وسائل یہ سارے مسائل خود بخود دور ہو جائیں گے۔ اردو کے ادبی رسائل کے لیے مالی تعاون کے بارے میں نہ اردو اکادمیاں سوچتی ہیں اور نہ ہی اردو کے تعلق سے کام کرنے والے ادارے، یونیورسٹی کے پروفیسر اور اساتذہ چاہیں تو ادبی رسائل کو اپنے طلبا کے لیے، اپنے لیے، لائبریریوں کے لیے جاری کروا کر مالی تعاون دے سکتے ہیں۔ اردو اکادمیاں اردو رسائل کو ہر سال مالی امداد فراہم کریں۔ رسائل کی مارکیٹنگ کرائیں۔ نمائش اور فروخت کا مناسب انتظام کروایا جائے۔ اردو رسائل کی ایک خصوصی نمائش منعقد کرائی جائے اور یہ سارے کام ایک بار نہیں بلکہ لگاتار ہر ماہ، دو ماہ یا چھ ماہ پر کرائے جائیں تو یقیناً بہت سارے مسائل دور کیے جا سکتے ہیں۔ رسائل کو بھی اپنی کمیوں کی سمت دھیان دینا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ کن نکات کو بہتر بنا کر رسائل کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر رسالے کو ترتیب دیا جائے۔ زبان وبیان، اسلوب وانداز پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اردو کے تمام ادبی رسائل کی اپنی ایک تنظیم ہونی چاہیے۔ وقفے وقفے سے ان کی میٹنگ کرائی جائے۔ ایک دوسرے کی پریشانیوں اور مسائل کو سنا جائے اور ان پر غور کیا جائے۔ اگر ان کی انجمن کی کارکردگی بہتر رہی تو مستقبل میں وہ اپنے حق کے لیے بہتر اور منظّم طریقے سے لڑ سکتے ہیں۔ مشترکہ طور پر تمام رسائل کو ایک پلیٹ فارم پر آ کر ہی ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ جرائد ورسائل میں جدید تقاضوں کے پیش نظر تبدیلی کی جائے۔ پرانے اور فرسودہ گیٹ اپ اور اشاعت کو چھوڑ کر نئے طریقوں کو اپنانا چاہیے۔ اردو رسائل کے تعلق سے اگر صرف اردو اکادمیاں اور اردو والے سنجیدگی سے کوشش کریں تو اردو کی ادبی صحافت ملک کی سب سے ترقی یافتہ زبان کی صحافت بن سکتی ہے۔

اردو ہندوستان کی ایک مقبول عام زبان ہے، فلموں سے لے کر سماج کے ہر طبقے میں اس زبان کا بول بالا ہے اور بہت سارے لوگ اردو زبان کا استعمال کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ اردو کے لیے آواز تو بہت زیادہ بلند کی جاتی ہے لیکن حقیقت میں اس زبان کی ترقی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ اردو کے نام پر جو ادارے قائم ہیں وہ بھی محدود وسائل اور دیگر مشکلات کی وجہ سے اردو کو اس کا جائز حق دلانے میں ناکام رہے ہیں۔ اردو زبان اپنے محدود وسائل اور بے پناہ پریشانیوں کے باوجود دنیا کی بے حد ترقی یافتہ زبانوں میں شمار کی جاتی ہے، اس زبان کا ادب بے انتہا قیمتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان میں دنیا کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور موجود ہیں۔ اردو کے ساتھ بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا سرکولیشن بہت کم ہے اور فروخت بھی بہت محدود ہے۔ فروخت کم ہونے کی وجہ سے اردو کتابوں کو بہت کم تعداد میں شائع کیا جاتا ہے اور بہت کم لوگ اردو کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اردو زبان بلا مذہب وعقیدہ وفرقہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور آئینی طور پر بھی یہ زبان ایک بڑی اور اہم زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس زبان پر دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد اس زبان پر یہ الزام لگا کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے لیکن یہ بات سراسر غلط ہے۔ اگر یہ مسلمانوں کی زبان ہوتی تو ہندوستان کا 20 کروڑ مسلمان اس عظیم زبان کو ایسی کسمپرسی کی حالت میں نہیں چھوڑتا۔ اتنی بڑی مسلمانوں کی آبادی کے رہتے ہوئے اگر اردو زبان کی یہ خراب صورت حال ہے تو یقیناً یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کی نہیں ہے بلکہ یہ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی ملاپ، پرتاپ، ہند سماچار، نرالا جوگی، مستانہ جوگی، ہمارا مقصد جیسے اخبارات ورسائل غیر مسلم اردو داں حضرات شائع کرتے آرہے ہیں اور یہ ان کی اردو سے محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

آزادی کی جنگ میں انقلاب زندہ باد، سارے جہاں سے اچھا جیسے نعروں کو پیدا کرنے والی زبان ہمیشہ سے ہی قومی یکجہتی کی نمائندہ رہی ہے۔ آزادی سے قبل جہاں یہ زبان دفاتر اور تمام مقامات پر عام زبان تھی، آزادی کے بعد اس کا استعمال کم سے کم ہوتا

گیا اورآج یہ زبان صرف ایک خاص فرقے تک محدود ہوکر رہ گئی ہے جبکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ یہ خاص فرقہ بھی اس زبان کی پرورش کرنے اور قائم رکھنے میں ناکام رہا ہے اورخود بھی اس زبان سے دور ہوتا جارہا ہے۔ روزگار زندگی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ روزگار کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوسکتی ہے۔ جب اس زبان کو روزگار سے الگ کردیا گیا تو ظاہر ہے کہ اس زبان کے جاننے والوں کی تعداد کم ہوجائے گی۔ اردو جاننے والے دھیرے دھیرے کم ہوتے جارہے ہیں۔ اردو کے تئیں لوگوں کی یہ عام سوچ بن چکی ہے کہ اردو پڑھ کر روزگار حاصل کرنا بہت مشکل ہے یا روزگار کا حصول ممکن ہی نہیں۔ جب اس طرح کی سوچ عام ہوگی تو اردو کون پڑھنا چاہے گا۔کسی زبان کی ترقی تب ہی ممکن ہوسکتی ہے جب اس زبان میں زیادہ سے زیادہ روزگار فراہم کرایا جائے۔ ایک دوسری تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ اردو زبان جس خاص طبقے کی زبان کہلاتی ہے وہ طبقہ بہت زیادہ پچھڑا ہوا ہے۔ بچوں کی تعلیم وتربیت کا بہتر نظم ونسق نہ ہونے کی وجہ سے اس طبقے کی اورزیادہ بری حالت ہے۔ ایک عام سوچ یہ ہے کہ پڑھنے لکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ہے، اس لیے بچوں کو جلدی سے جلدی کام پرلگادینا چاہیے۔کم عمر میں ہی بچے اسکول کالج جانے کی بجائے چھوٹا موٹا کام کرنے لگتے ہیں۔ کچھ گھروں میں واقعی صورت حال خراب ہوتی ہے۔ اخراجات پورا کرنے کے لیے بچوں کو کام پرلگانا ان کی مجبوری بھی ہوسکتی ہے لیکن بنیادی تعلیم تو خیر بچوں کو دی ہی جاسکتی ہے۔ جب یہ بچے بڑے ہوکر کاروباری دنیا میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو ان کی سوچ بھی وہی پرانی ہوتی ہے کہ ہم کس طرح آگے بڑھے ہیں اور ہم نے کیسے یہ سب حاصل کیا ہے۔ یہ لوگ عام طور سے تعلیم یافتہ تو ہوتے نہیں اس لیے کتابوں سے دلچسپی نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ اردو مطبوعات کی نہ تو صحیح تقسیم ہو پاتی ہے اور نہ ہی فروخت، کیوں کہ اس کے خریدنے اور پڑھنے والے کم ہوتے ہیں۔ ان مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایس اے رحمٰن لکھتے ہیں:

''دوسرے محدود وسائل اورکم آمدنی ہونے کی وجہ سے اردو بولنے والوں کو زندگی کے دوسرے مسائل اس قدر الجھائے رکھتے ہیں کہ علم وتعلیم سے

دلچسپی ہونے کے باوجود وہ کتابیں خریدنے پر زیادہ رقم خرچ نہیں کر سکتے اور ویسے بھی زندگی کی دوسری ضروریات کی طرح کتابیں بھی مسلسل مہنگی ہوتی جارہی ہیں۔ لیتھو سے آفسیٹ کی جانب بڑھتے قدم بھی اردو کتابوں کی فروخت پراثر ڈال رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر صنعت کی طرح اردو کی کتابی صنعت کی بنیاد بھی ڈیمانڈ اور سپلائی پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اردو میں کتابوں کی بھرپور ڈیمانڈ ہی نہیں ہے تو سپلائی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو مطبوعات (ان میں اخبارات ورسائل وغیرہ بھی شامل ہیں) کے کم بکنے یا تیزی سے نہ بکنے کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں۔ (1) اردو والوں میں پڑھنے لکھنے کا زیادہ شوق نہ ہونا (2) اردو والوں کا معاشی طور پر کمزور ہونا (3) اردو کتابوں کا عموماً جاذب نظر نہ ہونا (4) اردومطبوعات کی بھرپور پبلسٹی نہ ہونا (5) ناشر اور کتب فروشوں میں تعاون کا نہ ہونا۔'' (14)

ایس اے رحمٰن کی مذکورہ بالا باتوں سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ آج جو صورت حال ہے اس کی وجوہات یقیناً وہی ہیں جو انھوں نے بیان کی ہیں۔ اردو والوں میں شوق وذوق کی کمی ہے۔ معاشی طور پر وہ اتنے کمزور ہیں کہ ڈھنگ کی زندگی گزارنا محال ہے ایسے میں کتابیں کہاں سے خرید سکیں گے۔ اردومطبوعات کی بہتر پبلسٹی بھی نہیں کی جاتی ہے۔ بہت ساری کتابیں اچھی ہونے کے باوجود لوگوں تک صرف اس لیے نہیں پہنچ پاتی ہیں کیوں کہ لوگوں کو ان کتابوں کا پتہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ مطبوعات کے سرکولیشن اور اشتہاروں پر بہت کم دھیان دیا جاتا ہے۔ نہ ہی کوئی بہتر ذریعہ میسر ہے جن کے توسط سے کتابوں کی بڑے پیمانے پر پبلسٹی کی جاسکے اور زیادہ سے زیادہ اردو داں افراد کتابوں کو خرید کر پڑھ سکیں اور اس سے مستفید ہوسکیں۔ ایک مسئلہ خراب چھپائی اور گیٹ اپ کا بھی ہوسکتا ہے۔ معمولی کتابت یا ناقص چھپائی والی کتابیں بھی خریداروں کو راغب نہیں کرتی ہیں اس لیے ایسی کتابیں اسٹاک میں پڑی رہ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کتابوں کی قیمتیں بھی خریداری پر اثر انداز ہوتی

ہیں۔ شاہد ماہلی طباعت وتقسیم کے مسئلے پر لکھتے ہیں:

''اردو کی طباعت اوراشاعت میں آج بھی صدیوں پرانا طریقۂ کار اپنایا جارہا ہے جو موجودہ دور کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔ بیسویں صدی کی تیز رفتار زندگی میں کتابت کے ذریعہ طباعت بالکل اسی طرح ہے جیسے دہلی کے کناٹ پلیس میں کوئی بیل گاڑی سے سفر کررہا ہو۔مگر اردو ہے کہ اب بھی بیل گاڑی سے سفر کیے جارہی ہے۔ اردو اکیڈمیاں، ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، این سی ای آر ٹی، مکتبہ جامعہ، انجمن ترقی اردو، غالب انسٹی ٹیوٹ وغیرہ ایسے ادارے ہیں جو اردو کی اشاعت وطباعت کو جدید اوروقت کے تقاضوں کے تحت ڈھالنے میں نمایاں کردار ادا کرسکتے ہیں۔تقسیم کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ بیچارہ ناشر کسی طرح کتابت وطباعت،کاغذی اور جلد سازی کے تمام مراحل سے گذر کر پرچہ شائع کردیتا ہے۔اس کے بعد اسے فروخت کے سلسلے میں جس ذلت اور بے چارگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ قابل رحم ہے۔ چھوٹے موٹے ایجنٹ تو کبھی پیسے واپس ہی نہیں کرتے اور دوچار بڑے تقسیم کار صرف اپنے یہاں رکھنے کے لیے 40اور 50فیصدی کمیشن لے کر بھی ناشروں پر احسان کرتے ہیں۔مگر شرط یہ ہے کہ پیسہ جلد نہ مانگیں۔ اشتہارات تو خیر اردو کے ادبی پرچوں کو کون دے گا اس کے لیے جس بھاگ دوڑ،تعلقات اور سفارشوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ شاید ادبی جرائد کے ناشروں اور مدیروں کے لیے ممکن نہیں ہے۔'' (15)

شاہد ماہلی نے یہ باتیں اپنے تجربات کی بنیاد پر کہی ہیں۔ انھیں اپنے رسالے کے معیار کو باقی رکھنے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ وہی جانتے ہیں۔ اردو جرائد کے ساتھ طباعت واشاعت سے لے کر سرکولیشن اورفروخت تک بے انتہا مسائل ہیں۔ اردو اخبارات کی حالت قدرے بہتر بھی ہے لیکن رسائل کی صورت حال بہت ہی خستہ ہے۔

اردو اخبارات کو اشتہارات بھی مل جاتے ہیں۔ جن سے اس کے تمام اخراجات آسانی سے پورے ہوجاتے ہیں لیکن پرچوں کو نہ تو اشتہارات ملتے ہیں اور نہ خریدار۔ ایسی حالت میں اردو کے رسائل کچھ مہینوں تک شائع ہونے کے بعد بند ہوجاتے ہیں۔ بہت کم ایسے رسائل ہیں جو ایسی صورتِ حال میں بھی اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ اردو رسائل کی تعداد دھیرے دھیرے کم ہوتی جارہی ہے۔ ادبی رسالے وہی نکالتا ہے جس کے پاس خسارے کا سودا کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ نفع ونقصان سے اوپر اٹھ کر جو صرف اردو کی خدمت کرنے کی خواہش رکھتا ہے وہی اس میدان پر خار میں قدم رکھنے کی جسارت کرتا ہے۔ اردو کے ادبی رسائل کے ان مسائل کو دیکھتے ہوئے اس سمت میں بہت زیادہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف اردو زبان کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا مسئلہ ہے صدیوں پرانی وراثت کا مسئلہ ہے۔ اگر اردو کی بقا کے لیے سنجیدہ کوششیں نہ کی گئیں تو اردو زبان اوراس کا سرمایہ قصہ ماضی بن کررہ جائیں گے۔ اردو رسائل کی بدحالی کے لیے اردو حلقے کے علاوہ لکھنے والے بھی کسی حد تک ذمے دار ہیں:

> ''اردو کے ادبی رسائل کی بدحالی کے لیے صرف پڑھنے والے ہی ذمے دار نہیں ہیں۔ لکھنے والوں کا رویہ بھی کسی حدتک ذمے دار ہے۔ لکھنے والے مفت کا رسالہ قبول کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اعزازی پرچہ ان کے لیے اعزاز کی بات ہے۔ اگر ہمارے شعراء ادباء صرف ایک ادبی رسالہ خریدنا شروع کردیں تو اس سے رسائل کی مالی حالت کسی حدتک سدھر سکتی ہے۔ اس ملک میں لکھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ اگر پڑھنے والے کروڑوں ہیں تو لکھنے والے لاکھوں ہیں۔ ہم اردو کو بحیثیت زبان سوچتے ہیں۔ بحیثیت کلچر نہیں۔ اردو ایک تہذیب ہے۔ اس زبان سے ہمارا پورا تہذیبی ورثہ وابستہ ہے۔ اس کے ذخائر میں ہمارے اجداد کی فکر، رہن سہن، معیار، لباس، غذائی عادات، حویلیاں اور ان کا ماحول سبھی کچھ محفوظ ہے۔ اس کلچر کی حفاظت ہم سب پر فرض ہے۔'' (16)

اردو کے چاہنے والے اردو کی خدمت ومحبت کے دعوے تو ضرور کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اس زبان کی صورتِ حال تبدیل کرنے کے لیے کوئی سعی نہیں کرتے۔ اردو زبان کی زبوں حالی اوراس دگرگوں حالت میں اردو والوں کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ ہندوستان کے اتنے بڑے طبقے کی مادری زبان ہوتے ہوئے بھی یہ زبان محض شعروشاعری اورمشاعرے کی زبان بن کر رہ گئی ہے جبکہ اس زبان میں ہزاروں کی تعداد میں مختلف موضوعات پر اخبارات ورسائل شائع ہوتے ہیں لیکن ان کا سرکولیشن اتنا کم ہے کہ یہ ایک محدود دائرے میں ہی سمٹ کررہ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں میں یہاں مدیر نیادور جناب وضاحت حسین رضوی کی باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ان سے بات چیت کے دوران اس تلخ حقیقت سے آشنا ہوا کہ تاریخی اور ادبی لکھنؤ کے رسالے نیا دور کی محض کچھ کاپیاں دلی ایسے اردو کے عظیم شہر میں جاتی ہیں اور یہ تعداد کبھی دو ہندسوں تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔ میروغالب جیسے شعرا اور اردو کے جیالے قلم کاروں کی دلی میں اردو کے اس عظیم رسالے کی محض کچھ کاپیاں فروخت ہوتی ہوں۔ یہ صورت حال یقیناً تشویش ناک ہے۔ جب نیادور جیسے بڑے رسالے کے ساتھ یہ سلوک ہے تو دوسرے چھوٹے رسائل کی کیا حالت ہوگی۔ ارد و رسائل واخبارات وغیرہ کم فروخت ہونے کی وجہ سے ایسے برے دور سے گزررہے ہیں۔ اردوداں حضرات کو لائبریری میں اردو اخبارات ورسائل مفت میں مطالعے کے لیے مل جاتے ہیں۔ وہ انگریزی روزناموں ٹائمس آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز، دی ہندو وغیرہ پر پیسے صرف کرنا باعث عزت وافتخار سمجھتے ہیں لیکن اردو اخبارات ورسائل پر وہ پیسے خرچ کرنا بربادی اورزیاں سمجھتے ہیں۔ جس دن اس سوچ سے اردو والے باہر آجائیں گے اردو کی حالت یقیناً بہتر ہوجائے گی۔ اردو کے اساتذہ اور طالب علموں کو چاہیے کہ وہ اردو کا اخبار ورسالہ خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ اردو پڑھنا احساس کمتری نہ سمجھیں بلکہ فخر کے ساتھ اردو کو اپنائیں۔ اپنے حق کا مطالبہ کریں اورزیادہ سے زیادہ لوگوں کو اردو زبان وادب سے جوڑنے کی کوشش کریں۔ یقیناً اس کے نتائج بہتر ہوں گے۔ ادبی رسائل کے مسائل کوحل کرنے کی ابھی تک کوئی ایسی عملی کوششیں نہیں کی گئی ہیں۔ آزادی کے بعد سے

جتنی بڑی تعداد میں رسائل نکلنا شروع ہوئے ہیں اتنی ہی زیادہ مشکلات بھی پیدا ہوئی ہیں۔ کسی شاعر یا نثر نگار کو دو چار قلم کاروں کا تعاون حاصل ہوگیا اور انھوں نے نئے رسالے کی شروعات کردی۔ جب کہ ادب کی خدمت بغیر رسالہ نکالے بھی کی جاسکتی ہے۔ جو پہلے سے جاری رسائل ہیں انھیں تعاون دے کر، ان کے مسائل کو حل کر کے، رسالے کے معیار کو بہتر بنا کر بھی ادب کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ نیا رسالہ نکال کر وہ اردو زبان و ادب کی ترقی میں ایک نیا باب رقم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ادب کی اس خدمت سے مجھے نہیں لگتا کہ کچھ خاص فائدہ ہوتا ہے۔ رسائل کی تعداد میں اضافہ اور ایک نئے نام کے جڑ جانے سے ادب کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ ہمیں سب سے پہلے رسائل کو زیادہ سے زیادہ اردو داں افراد تک پہنچانے کی ضرورت ہے، قاری کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک تفصیلی جائزے کی ضرورت ہے کہ ہمارا آج کا قاری کیا چاہتا ہے۔ رسائل کے ساتھ یہ بھی مسئلہ ہے کہ پانچ سات ادب نواز افراد نے رسالہ نکالنا شروع کردیا لیکن انھوں نے اپنی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں مضامین اور اشعار شائع کیے۔ اس پسند کو خود ہی قاری کی پسند تصور کرلیا۔ مغرب زدہ تحریکوں سے متاثر رسالوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے کہ وہ عام قاری تک نہیں پہنچ پاتے کیوں کہ ان رسائل میں ایک عام قاری کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک عام قاری خالصتاً ادب پڑھنا چاہتا ہے۔ اردو زبان وادب سے جڑا رہنا چاہتا ہے۔ ایسے قاری کو ان رسائل سے مایوسی ہی حاصل ہوتی ہے۔ رونق جہاں زیدی لکھتی ہیں:

> ''ہمارے یہاں ایک ترقی پسند مکتب فکر ہے جو ادیب سے قاری کی سطح تک آجانے اور اپنے معیار کو پست کردینے کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسری طرف جدیدیت پسند حضرات کا حلقہ ہے جو قاری کو کسی بھی طرح قابل اعتنا نہیں گردانتا۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ دونوں رویے انتہا پسندانہ ہیں۔ اور ہم فی نفسہٖ ادب کے مسئلے پر غور کرنے کے بجائے ادیبوں سے ردعمل اور دوسرے مصالح کو پیش نظر رکھ کر ادب کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب بنیاد ہی اتنی ٹیڑھی ہو تو اس پر کوئی فلک بوس عمارت کیسے تعمیر ہوسکتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جب تک اس سلسلے میں ایک متوازن اورمعتدل افہام وتفہیم کے رویہ کو عام نہیں کیا جائے گا اس وقت تک قاری ایک سرے پر کھڑا نظر آئے گا اور ادیب دوسرے سرے پر اوران کے درمیان مدت تک کسی قدر مشترک کی تلاش بے سود ہوگی۔'' (17)

رونق جہاں زیدی نے بالکل درست لکھا ہے کہ جب تک قاری کو ادیب سے نہیں جوڑا جائے گا تب تک دونوں اپنے اپنے سرے پر کھڑے رہیں گے اور ان کے درمیان کوئی رشتہ استوار نہیں ہوسکتا۔ ادبی رسالے نکلتے ہیں اور بند ہوجاتے ہیں۔ مالی وسائل، قاری کی کمی، مواد کی کمی یا وجہ جو بھی ہو لیکن اس کی گہرائی میں جاکر کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی گئی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ رسالہ مقبول عام نہیں ہوا اور اتنی جلدی بند ہوگیا۔ رسائل نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ قاری سے رشتے بنائے، رابطہ بنائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ آج کا قاری کیا چاہتا ہے۔ وہ رسالہ اس کی پسند پر کسی قدر پورا اتر رہا ہے۔ آج حقیقت یہ ہے کہ رسائل خود ہی قاری کو خود سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادبی رسائل اپنے معیار کے تحفظ کے لیے عام قاری کی پسند کو جب تک ذہن میں نہیں رکھیں گے اردو کے ادبی رسائل کے ساتھ اس طرح کے مسائل ہمیشہ رہیں گے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے رسالے میں ایک عام قاری کی پسند کے مطابق بھی مضامین شائع کریں۔ خالصتاً ادب سے ہٹ کر روز مرہ سے متعلق کچھ مضامین، کچھ دلچسپ باتیں، کہانیاں وغیرہ بھی شائع کریں تو شاید قاری کو جوڑنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ آزادی کے بعد برصغیر میں ایک نئی لہر پاپولر لٹریچر یا مقبول عام ادب کی شروع ہوئی تھی جس کے تحت سیکڑوں کی تعداد میں ماہنامے اور ڈائجسٹ نکلنا شروع ہوئے جو آج بھی جاری ہیں۔ ان کی تعداد اشاعت بھی اچھی خاصی ہوتی ہے اور اس میں اشتہارات بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان کے قاری بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ عبدالسلام خورشید اس مسئلے پر تبصرہ کرتے ہیں:

مجلّاتی صحافت کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ادبی اورعلمی مجلّات صحافت کی جگہ ڈائجسٹوں نے لے لی ہے اوراتنی عظیم اشاعتیں بنالی ہیں جن کا اس ملک

کی مجلّاتی، ادبی صحافت نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے مجلّاتی صحافت کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی کاوشوں نے معاشرتی اعتبار سے سسک سسک کرجان ہاردی اور اب ماہنامہ ادبی رسالے ملک میں ڈاواں ڈول نظر آتے ہیں اور ان کی حالت بھی قابل رشک نہیں ہے۔ ان کی جگہ بعض لوگوں نے سہ ماہی یا ششماہی یا کبھی کبھی نکلنے والے ضخیم رسالے شروع کرر کھے ہیں۔لیکن وہ ماہنامہ صحافت کا نعم البدل نہیں ہیں کیونکہ ادیب اور دانشور چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو۔'' (18)

یہ صحیح ہے کہ ادبی صحافت کو سرکاری سطح پر ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ نہ تو کبھی تعاون دیا گیا اور نہ ہی اردو کے رسائل کی ستائش کی گئی ہے۔ ادبی صحافت ہمیشہ اخباری صحافت سے الگ تھلگ اپنی راہ بناتی رہی، گرتی رہی، سنبھلتی رہی اور اپنے سفر پر گامزن رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بھی ادبی صحافت زندہ ہے اور ادبی حلقے کی تشنگی دور کررہی ہے۔ سلطان سبحانی ادبی رسائل کی موجودہ صورتِ حال پر کچھ اس انداز سے رقم طراز ہیں:

''رسائل صرف ادب پیش کرتے ہیں۔ کلاسیکی ادب، ترقی پسند ادب، جدید ادب اور اس جرم کی وجہ سے ان کا حلقہ اشاعت انتہائی محدود ہے۔ امرا وزرا یا دوسرے کرم فرماؤں کو ان سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے کیونکہ ان میں ان کے مصرف کی کوئی بھی چیز نہیں ہوتی۔ ان رسائل کی تعداد اشاعت دن بہ دن محدود ہوتی جاری ہے۔ کیونکہ اب حسن کا انداز بدل گیا ہے ایک طرف گرانی ہے اور دوسری طرف زیادہ ترقی یافتہ ادب، اب معیاری رسالہ ہر کسی کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔ اب ادب گلیوں، بازاروں، کارخانوں، آزمائش گاہوں یہاں تک کہ مشاعروں تک سے نکل چکا ہے اور اب ادب کے قارئین صرف ادیب ہی رہ گئے ہیں۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ معیاری رسائل صرف لکھنے والوں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ وہی لکھتے

ہیں اور وہی خریدتے ہیں۔ جو نہیں لکھتے وہ لکھنے کے چکر میں ہوتے ہیں
اس لیے خریدتے ہیں لہٰذا جس رسالے کو پانچ ہزار کی تعداد میں چھپنا
چاہیے وہ صرف چند سو کی اشاعت میں بھی دیمک ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ اگر
غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ محدود تعداد اشاعت نے معیاری رسائل سے
بہت ساری سہولتیں اور ترقیاں چھین لی ہیں۔''(19)

سلطان سبحانی کی باتیں واقعی درست ہیں۔ ادبی رسائل کے ساتھ کچھ ایسی پابندیاں بھی ہیں جن پر عمل کرنا ادبی رسائل کی مجبوری ہوتا ہے۔ ادبی رسائل عام سطحی قسم کی چیزیں شائع نہیں کر سکتے۔ ملکی و غیر ملکی خبریں نہیں چھاپ سکتے۔ خبروں پر تبصرے نہیں دے سکتے۔ ان کے علاوہ ضرورت رشتہ، مرنے، نام تبدیل کرنے کے اشتہارات نہیں شائع کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں اخباروں اور عام رسالوں میں زیادہ شائع ہوتی ہیں۔ادبی رسائل میں انھیں شائع کرنے سے ادبی رسائل کا معیار خطرناک حد تک گر جائے گا جو کہ ادبی صحافت کے لیے اور بھی نقصان دہ ہے۔ ان سب سے قطع نظر کچھ رسالوں میں اس طرح کے تجربے بھی کیے گئے۔ ریڈیو، ٹی وی اور فلموں سے متعلق خبریں شائع کی گئیں۔ دوسری تفریحات پر مبنی مضامین پیش کیے گئے لیکن ان سے رسائل کے معیار پر سوال اٹھنے لگے۔ نتیجتاً ان تجربات کو بند کر دینا پڑا لیکن ان تجربات سے ایک بات تو یہ سامنے آئی کہ ایسے مواد شائع ہونے کے بعد رسائل کی تعداد اشاعت اور فروخت میں اضافہ ہوا۔ اردو رسائل کے مسائل تبھی ختم ہو سکتے ہیں جب یہ رسائل ادب کے ساتھ ساتھ علمی، معلومات مضامین بھی شائع کرنے شروع کر دیں۔ رسائل صرف ادبی نہ ہو کر عام معلوماتی بھی ہوں، سماجیات، سیاست، معاشیات، فنون لطیفہ اور دوسری تفریحات پر مبنی مضامین بھی ایک بہتر ادبی رسالے میں شائع ہونے ضروری ہیں۔ ان سے یہ فائدہ ہوگا کہ قاری کا دائرہ وسیع ہوگا، زیادہ سے زیادہ افراد رسالے کی سمت متوجہ ہوں گے۔ یہاں زبیر رضوی کے رسالے ذہن جدید کا ذکر کرنا بے معنی نہ ہوگا۔انھوں نے رسائل کی دنیا میں ایک نیا تجربہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ادب صرف ادب نہ ہو کر آرٹ، کلچر اور تہذیب کا سچا ترجمان بھی ہے۔ ان

کے رسالے میں فنون لطیفہ، فلم، تھیٹر، موسیقی، رقص، کلچر، مختلف مذاہب، مختلف رجحانات اور ادب کے مختلف مکتب فکر سے وابستہ لوگوں کی دلچسپی سے متعلق تحریریں شائع کی جاتی ہیں اور یہ رسالہ گزشتہ 20 برسوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ آج یہ رسالہ اردو کا بین الاقوامی رسالہ بن چکا ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ رسالہ کسی بھی دوسری زبان کے رسالے کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔ رسالے میں اگر عام قاری سے متعلق، اس کی دلچسپی اور اس کی پسند و ناپسند کو خیال میں رکھتے ہوئے مضامین اور نگارشات شائع کی جائیں گی تو یقیناً اس کے دوررس اثرات سامنے آئیں گے اور ادب کی حقیقی معنوں میں ترقی ہوگی۔ اشتہارات بھی ملنے شروع ہوجائیں گے اور قاری کا حلقہ بھی بڑھے گا۔ ایک دوسری بات یہ ہے کہ کچھ اہم ادبا وقلمکار اپنا قلمی تعاون دے کر یہ سوچتے ہیں کہ وہ رسالے کی اعزازی کاپی حاصل کرنے کے حقدار ہوگئے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا تعاون بہت قیمتی ہے اور رسالے میں ان کی نگارشات شائع ہورہی ہیں لیکن انھیں رسالے کے حالات کا بھی اندازہ ہونا چاہیے۔ ان کے لیے یہی معاوضہ بہت بڑا ہے کہ ان کی نگارشات قاری کی ایک بڑی تعداد تک پہنچ رہی ہیں۔ اگر واقعی کوئی ایسا ادیب ہے جو نہایت کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے تو اسے اعزازی کاپیاں یقیناً ملنی چاہئیں لیکن ایسے ادیب جو سال میں کئی دفعہ لندن، امریکہ، دبئی اور دوسرے ممالک کا دورہ کرتے ہیں، معیاری زندگی جیتے ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ انھیں اعزازی کاپیاں دینے کی ضرورت ہے۔ بلکہ انھیں اردو کے لیے خصوصی تعاون کرنا چاہیے۔ اگر ایسے حضرات چاہیں تو اردو رسائل کی حالت یقیناً بہتر ہوسکتی ہے۔ ان کا تعاون رسائل کو زندہ رکھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

اردو کے رسائل وجرائد نے آغاز سے ہی اپنا ایک معیار برقرار رکھا ہے۔ آزادی سے قبل جہاں رسائل وجرائد کو ڈھیروں سہولیات مہیا تھیں۔ قاری کی بڑی تعداد تھی۔ کاتب اور مضمون نگار حضرات آسانی سے دستیاب تھے۔ وہیں آزادی کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ رسائل جو قوم کو ملکی وغیر ملکی حالات اور مختلف خبروں کا پس منظر بتاتے ہیں۔ قارئین کو بہتر تفریح مہیا کراتے ہیں۔ مختلف معلومات سے آگاہ کرتے ہیں۔ لیکن خود

رسائل کے مسائل اتنے زیادہ ہیں کہ یہ رسالے شروع ہونے کے بعد ہی آخری سانسیں لینے لگتے ہیں۔ ادبی رسائل کے قاری کا حلقہ اور بھی محدود رہتا ہے۔ ان رسالوں کو وہی افراد پڑھتے ہیں جو ادب سے وابستہ ہوتے ہیں۔

ادبی رسالوں کے مسائل بہت زیادہ ہیں ان پر کافی غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ سرکولیشن کا ہے۔ اگر رسالوں کا سرکولیشن اچھا ہوتو نئے قاری رسالے سے جڑیں گے اور رسالہ نئے لوگوں تک پہنچے گا۔ رسالے میں اشتہارات شائع کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔ اشتہارات شائع ہوں گے تو رسالے کے مالی مسائل دور ہوں گے۔ ایسے حضرات جو ادب کا ذوق رکھتے ہوں، اشتہارات کے پیشے سے منسلک ہوں یا اپنی کوئی کمپنی چلاتے ہوں، انھیں چاہیے کہ وہ رسالے میں اپنے پروڈکٹ کا اپنی کمپنی کا اشتہا ر شائع کروائیں جس سے رسالے کو فائدہ بھی ہوگا اور ان کی کمپنی کا اشتہار بھی مختلف ادب نواز افراد تک پہنچ سکے گا۔

ایک خاص مسئلہ یہ بھی ہے کہ کچھ رسائل میں ادبی شوق وذوق رکھنے والے عملے کی کمی ہوتی ہے۔ وہ ادب کا رسالہ تو شائع کرتے ہیں لیکن انھیں ادب کی غرض وغایت اورمفہوم کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ ایسے افراد رسالے کے لیے خود ہی نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ قارئین سے صحیح طور پر رشتہ استوار کیا جائے کہ وہ کیسی تخلیقات پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ رسالے میں کیا تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ اردو کے رسائل کے ساتھ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ کسی منظّم طریقے سے کبھی رسالہ نہیں شروع کیا جاتا۔ بس اپنے احباب کو خبر کردی کہ مضامین بھیج دیں۔ ایک دو رسالے میں یا اخبار میں اشتہار دے دیا کہ نیا رسالہ شائع ہورہا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد رسالہ منظرعام پر آ گیا۔ کچھ جاننے والوں نے ازراہ ہمدردی، یا ذاتی رشتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے خریدلیا۔ کچھ کاپیاں مضمون نگاروں کو بھیج دی گئیں۔ کچھ اعزازی طور پر بڑے ادیبوں وشعرا کو بھیج دی گئیں کہ رسالے کے تعلق سے اظہار خیال کریں۔ دوسرے شمارے میں رسالے کی تعریف وتوصیف سے متعلق درجنوں خطوط اور تبصرے شائع کردیے گئے اور ایسے ہی یہ رسالہ تین چار شمارے تک شائع

ہوتا ہے اس کے بعد مشترکہ شماروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پہلے دو ماہ پر پھر تین ماہ پھر چھ ماہ اور آخر میں افسوس اور دکھ کے ساتھ رسالہ بند کردیا جاتا ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ رسالہ نکالنے سے پہلے نہ تو اس کی غرض وغایت پر دھیان دیا گیا۔ نہ تو اس بات پر غور کیا گیا کہ آیا اس رسالے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ اس کے علاوہ اثاثہ، مواد، موضوعات، تنظیمی پہلوؤں، ادبی صحافت کے کچھ اصول وغیرہ کے حوالے سے بھی کوئی بات نہیں دھیان میں رکھی گئی۔ سب سے بڑھ کر اس پہلو پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ یہ رسالہ کس کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔ اس رسالے کو پڑھنے والے کون ہوں گے۔ کس طرح اس کی فروخت ہوگی۔ کیسے اس کا سرکولیشن بڑھے گا۔ اب جہاں اس طرح کی صورتِ حال ہوگی تو ظاہر ہے کہ رسالے کا انجام تو پہلے سے متوقع ہے۔ عبدالصمد نے بھی اپنے مضمون میں ان باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

> ''پہلی بات تو یہ ہے کہ آج ملک کے کونے کونے سے اردو رسائل (جن میں ہفتہ وار، ماہنامے اور سہ ماہی سبھی شامل ہیں) نکل رہے ہیں۔ ہر شہر سے دوچار رسائل نکل رہے ہیں یا پھر ان کے اعلانات ہو رہے ہیں کہ یہ اس زبان کے لیے جس میں یہ رسائل نکل رہے ہیں کیا کوئی خوش آئند بات ہے؟ کیونکہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ دوچار دوست بیٹھے، کسی ایک کے ذہن میں کوئی رسالہ نکالنے کی بات آگئی۔ دوستوں سے چندے کرلیے گئے کچھ اپنی جیبوں سے حساب کتاب کرلیا۔ اور دو چار سو روپیوں سے ایک رسالہ نکال دیا گیا پہلا شمارہ تو بہت دھوم دھام سے نکلا، خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔ تبصرے اور خطوط لکھوائے گئے لیکن دوسرے شمارے کی کوئی خبر نہیں۔ کیوں کہ اس کی جتنی کاپیاں بکنی چاہیے تھیں وہ بکیں نہیں۔ ظاہر ہے کہ رسالہ نکالتے وقت یہ بات سوچی ہی نہیں گئی تھی۔ یہ تو ایک بالکل ہی نئی بات ہوگئی۔ اب کون ان باتوں میں سر کھپاتا پھرے۔ چنانچہ اس عزم کے ساتھ کہ دوسرا شمارہ بھی ضرور نکلے گا۔ رسالہ بند ہوجاتا ہے۔

اس طرح اردو رسائل کی دنیا میں ایک افراتفری کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔
یہ صورتِ حال ان رسالوں کو بھی نقصان پہنچا رہی ہے جو پہلے سے جمے
ہوئے ہیں کیونکہ ان کے خریدار ایک نیا رسالہ دیکھ کر اپنا رخ ادھر ہی
کر لیتے ہیں۔'' (20)

اردو رسائل کے ساتھ نہ تو پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے صحافی ہیں اور نہ ہی اتنا سرمایہ کہ رسائل کا گیٹ اپ اور چھپائی اچھی اور جاذب نظر ہو۔ نہ تو رنگین تصاویر شائع کرنے کے وسائل ہیں اور نہ ہی دیدہ زیب طباعت کے لیے کمپیوٹر پریس۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد جس طرح سے مشینوں وٹکنالوجی کی ترقی ہوئی ہے اس نے بھی رسائل کی صحافت کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اب لوگوں کے پاس وقت گزارنے کے لیے اتنے وسائل موجود ہیں کہ لوگ شاذو نادر ہی رسائل اورطباعت شدہ صفحات کی طرف نظر کرتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ کی دنیا اب انسانوں پر اس قدر حاوی ہوچکی ہے کہ لوگ ان تفریحات میں ہی کھو کررہ گئے ہیں۔ پہلے جہاں افسانوں، غزلوں اور سلسلہ وارناولوں کا لوگ شدت سے انتظار کرتے تھے وہیں اب لوگ سیریلوں، فلموں، ای میل کا انتظار کرتے ہیں۔ آج کا انسان فیس بک اوردوسری ویب سائٹ کے ذریعے دوستوں اوردنیا سے رابطے میں رہتا ہے۔ اسے اس بات کی کوئی خبرنہیں کہ ادب بھی کوئی چیز ہے اورآج کے لوگوں کی دلچسپیاں، پسند و ناپسند تبدیل ہوچکی ہیں۔ چھپے ہوئے الفاظ، کتابیں پرانی ہوگئی ہیں۔ ایسے حالات میں کہاں سے رسائل واخبارات شائع ہوں گے اوران کے پڑھنے والے کون لوگ ہوں گے۔ معروف ادیب آلون ٹافلر نے 1980 میں اپنی کتاب دی تھرڈ ویو میں لکھا تھا:

''ہماری زندگی میں ایک نئی تہذیب کا طلوع ہورہا ہے۔ نابینا لوگ ہرجگہ
اس کی آمد کو روکنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ نئی تہذیب اپنے ساتھ نئے
خاندانی رشتے، کام کاج کے نئے طورطریقے، پیار اور جینے کے نئے انداز،
نیا سائنسی نظام، نئے سیاسی تصادم اوران سب سے زیادہ ایک بدلا ہوا شعور

لارہی ہے۔اس نئی تہذیب کے عناصر آج بھی موجود ہیں۔لاکھوں لوگ مستقبل
کی سرتال سے اپنے کوٹیون کررہے ہیں۔ دیگر مستقبل سے خوف زدہ اور
مایوسی کا شکار ہوکر ماضی میں بے معنی فرار کررہے ہیں۔ایک مرتی ہوئی دنیا جس
نے انہیں جنم دیا ہے۔ پھر سے زندہ کرنے کے کوشش کررہے ہیں۔نئی تہذیب
کا طلوع ہماری زندگی کی سب سے اہم دھماکہ خیز صداقت ہے۔'' (21)

آلون ٹافلر کی 1980 میں کی گئی یہ پیشن گوئی آج حرف بہ حرف درست ثابت ہورہی ہے۔ آج کا دور بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔لوگوں میں کتاب اور مطبوعہ صفحات کے تیئں ایک بے حسی گھر کرچکی ہے۔ آج لوگ کتابوں سے دور ہوتے جارہے ہیں۔مشینوں اورٹکنالوجی نے ان پر قبضہ جمالیا ہے۔موبائل فون، انٹرنیٹ،کمپیوٹر گیم، ٹی وی،فلموں جیسے مختلف تفریحی متبادل نے انھیں روزمرہ کی زندگی میں اتنا محو کردیا ہے کہ وہ اپنے گرد وپیش کی دنیا سے بے گانہ ہوگئے ہیں۔ ان تفریحات اور مشاغل نے انھیں تنہا کردیا ہے۔آج کا انسان اتنا مصروف ومشغول ہو چکا ہے کہ اس کے پاس اپنے لیے بھی سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بلند پایہ ادبی تخلیقات، اعلیٰ درجے کی ادبی نگارشات وجود میں نہیں آتیں۔ کیونکہ ان کے لیے معاشی استحکام، ذہنی سکون، فرصت کے لمحات اورآسودگی چاہیے جو آج ناپید ہوچکی ہے۔ آج اردو سے جڑے ادیبوں، صحافیوں کے علاوہ دوسرے شعبہ زندگی سے وابستہ حضرات بھی محدود وسائل روزگار، خراب اقتصادی ومعاشی صورتِ حال سے نبردآزما ہیں۔ آج خلوص لگن اور محبت، جستجو کے فقدان نے اعلیٰ درجے کے ادب کو سطحیت تک پہنچا دیا ہے۔

علمی وادبی رسائل سے جڑے حضرات مایوسیوں، محرومیوں کا شکار رہتے ہیں۔ انھیں ان کی محنت کا نہ تو خاطر خواہ معاوضہ ملتا ہے اور نہ ہی کوئی مالی صلہ۔ اب ایسی صورتِ حال میں نہ تو اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیقات منظر عام پرآپاتی ہیں اور نہ ہی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام انجام دیا جارہا ہے۔ میں یہاں ایک عام منظر نامے کی بات کررہا ہوں۔ میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آج ایسی تحریریں یا تحقیق بالکل ہی ناپید ہوچکی ہے۔ ایسے حالات

میں بھی کچھ ادب نواز ایسے ہیں جو ادب کے تئیں سنجیدہ ہیں۔ آج بھی ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ آج بھی وہ ادب کی ترقی میں ایک کامیاب رول ادا کر رہے ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایسے پرآشوب دور میں بھی لکھے ہوئے الفاظ اور مطبوعہ صفحات کو کس طرح برقرار رکھا جائے،لوگوں میں ادب سے دلچسپی کس طرح پیدا کی جائے۔ اس سمت میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس صورتِ حال میں یہ بہتر ہوگا کہ ہم ہونے والی تبدیلیوں کے مطابق خود کو تیار کریں، ترسیل وابلاغ کی ترقی وتبدیلی کو سمجھنا ہوگا، خود کو اس کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ اگرآج زمانہ کمپیوٹر وانٹرنیٹ کا ہے تو ہمیں بھی ان سے استفادہ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ کتابیں و جریدے ہماری تاریخ وتہذیب کا سرمایہ ہیں۔تحریر اگرختم ہوگی تو تاریخ اورتہذیب پر بھی اثر پڑے گا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ منظر نامے کے مطابق اس تحریر کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں ہم پر فخر کرسکیں۔ جہاں تک مطبوعہ رسائل کی بات ہے تو ان کے لیے کچھ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں میں خصوصاً ادب کے طالب علموں میں ادب کے تئیں دلچسپی پیدا کی جائے۔ انھیں بہتر ماحول فراہم کیا جائے۔ تاکہ وہ ادب کے سچے سپہ سالار بن سکیں اور بہتر ادبی تخلیق وتحقیق کو منظر عام پر لاسکیں۔ تمام یونیورسٹیوں، کالجوں میں رسائل کی خریداری ضروری قرار دی جائے۔ طلبا کو تھوڑی رعایت پر رسالے پابندی سے مہیا کرائے جائیں۔

تمام اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے ایک رسالے کی خریداری منظور کریں۔ اردو کے صحافیوں کو عملی تربیت دی جائے۔ اردو جرائد سے جڑے صحافیوں، کارکنوں کو جدید ٹکنالوجی اورفن صحافت کی باریکیوں کی تعلیم دی جائے۔ ادبی جرائد کی ایک اپنی ادبی تنظیم بنائی جائے۔مختلف رسالوں کے صحافی اپنے مسائل اورصورتِ حال پر غور وخوض کے لیے ہرماہ سیمینار، میٹنگیں کریں۔ ادبی جریدوں کوتحریک یا رجحان سے اوپر اٹھ کر صرف اردو زبان اورصحافت کی ترقی کو اپنا مقصد بنانا ہوگا۔ اختلافات کو دور کر کے سبھی ادبا وقلم کاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ہوگا۔حکومت اور اردو اکادمیوں کو رسائل کے لیے خصوصی امداد

مہیا کرانی ہوگی۔ اردو کے سرکاری اساتذہ کو ہر ماہ ایک ادبی رسالہ خریدنا لازمی ہونا چاہیے۔ ان کے علاوہ اگر وسائل موجود ہوں تو رسائل کو انفارمیشن ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ سے جوڑا جائے تاکہ غیر ممالک میں اور دوردراز کے افراد تک رسالے انٹرنیٹ کے ذریعے پہنچ سکیں اور وہ بھی رسالے کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ اگر ان سبھی باتوں پر توجہ دی گئی تو یقیناً اردو مجلّات ورسائل کی صورتِ حال بہتر ہوگی اوراردو زبان اورادبی صحافت کا معیار بھی بلند ہوگا۔ موجودہ منظر نامہ بھلے ہی مشینی ہو لیکن آج بھی اردوصحافت اور اردو زبان ترقی کررہی ہے، نئے اخبارات ورسائل نکل رہے ہیں، لوگ اردو کی جانب راغب ہورہے ہیں، بس ذرا کوشش کرنے کی ضرورت ہے کہ اس ترقی کو کس طرح رفتار مہیا کرائی جائے۔ اگر آج اس سمت میں کوشش کی گئی تو آئندہ نسلیں اردو سے نابلد نہیں ہوں گی۔

حواشی

1. ڈاکٹر محمد انورالدین، ذرائع ابلاغ میں رسائل کی اہمیت، ماہنامہ فکر و نظر علی گڑھ، 1995 ص 99
2. ایضاً، ص 99,100
3. عابد سہیل، اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1981 ص 106
4. روشن آرا راؤ مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1989 ص 160
5. روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1989 ص 167
6. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، کاروان صحافت، انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان، 1989 ص 75
7. جے نٹراجن، بھارتیہ پتر کار پتا کا اتہاس، پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی 2002 ص 274
8. مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، روشن آرا راؤ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1989 ص 171
9. روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ص 177
10. پروانہ ردولوی، اردو صحافت کا استغاثہ، حیا پبلشنگ ہاؤس، پی او باکس نمبر 4093، نئی دہلی 17 اپریل 1994 ص 27
11. روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان 1989 ص 203
12. ابوالکلام قاسمی، مضمون معیار کا مسئلہ، اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، مرتبہ عابد سہیل،

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1981 ص 17

13. ادبی رسائل اوران کے مسائل، افتخار امام صدیقی، اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، مرتبہ عابد سہیل اتر پردیش ادو اکادمی لکھنؤ ص23

14. ایس اے رحمٰن روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی اردو بک سیلرز وپبلشرز نمبر، اردو مطبوعات کی تقسیم وفروخت کے بنیادی مسائل، ایس اے رحمٰن 1982 ص 124

15. شاہد ماہلی، ادبی جریدوں کا مستقبل، اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل مرتبہ عابد سہیل، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1981 ص 53-52

16. شمیم انصاری، مضمون، ادبی رسائل اور قارئین کی ذہنی پستی، ماہنامہ کتاب نما، مارچ 2005 نئی دہلی، ص61

17. رونق جہاں زیدی، مضمون، شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات، اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، مرتبہ عابد سہیل، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ1981 ص 41

18. بحوالہ عبدالسلام خورشید، روشن آرا راؤ مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان 1989 ص222

19. سلطان سبحانی، ایک موت کا دھندہ باقی ہے، اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، مرتبہ عابد سہیل، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1981، ص 45-44

20. عبدالصمد مضمون چند باتیں، اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، مرتبہ، عابد سہیل اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1987 ص 74-73

21. بحوالہ آلون ٹافلر، تھرڈ ویو، عالمی اردو ادب نئی دہلی، دیوندر اسر نمبر 1995 ص 216

حاصل مطالعہ

آزادی کے بعد کی ادبی صحافت ان معنوں میں کافی اہمیت رکھتی ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود عصری ضروریات اورادبی محرکات سے ہم آہنگ ہوکر ترقی کی راہ پر گامزن رہی ہے۔ آزادی کے بعد کے حالات اردو زبان وادب، خاص طور سے اردو مجلّات کے لیے کسی طور سازگار نہیں تھے۔لیکن رسائل نے صبر واستقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ مالی مشکلات، سرمایے کی کمی اورقانونی حدبندیوں کے باوجود ان رسائل نے عوام کے دل ودماغ پر واضح اورجامع اثرات مرتب کیے ہیں۔آزادی سےقبل جہاں ملک کے تمام حصوں میں اردو کا دور دورہ تھا وہیں آزادی کے بعدصورت حال تبدیل ہوگئی اور ڈھیر سارے رسائل پاکستان چلے گئے۔ کچھ رسائل لاہور سے دہلی یا دوسرے شہروں میں منتقل ہوئے۔آزادی کے بعد کے حالات جب کچھ بہتر ہوئے تب مجلّات نے نئے سرے سے شروعات کی۔آزادی سےقبل شائع ہونے والے رسائل میں سب رس،شاعر،اورآجکل اہم تھے۔ ان کے علاوہ بیسویں صدی،ساقی اور جامعہ بھی شائع ہورہے تھے۔آزادی کے بعد اردو ادب، نیادور اور سوغات کی شروعات ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد رسائل کے موضوعات میں کافی تنوع آجاتا ہے۔ جہاں پہلے اردو زبان کی صورت حال،تعمیر وتربیت،

تعلیم وترقی وغیرہ کو اہمیت دی جاتی تھی وہیں آزادی کے بعد برصغیر کی تقسیم اوراس کے بعد رونما ہونے والے اثرات نے رسائل کے موضوعات میں کافی جگہ پائی۔ افسانوں، غزلوں اور مضامین میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے مسائل کو بھی جگہ دی گئی۔

آزادی سے قبل ترقی پسندی اوررومان پسندی سے متاثرہ ادب تخلیق کیا جارہا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد ترقی پسندی کا زورکم ہوگیا اورسوغات، کتاب اورشب خون کی اشاعت نے جدیدیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد میں اس تحریک کو زبیر رضوی کے رسالے ذہن جدید نے اوربھی دوام بخشا۔ محمد حسن نے عصری ادب کے ذریعے ترقی پسندی کے رجحان کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ قمر رئیس نے بھی نیا سفر اور نئی آگہی کے ذریعے ادب وصحافت میں روشنی بکھیری، ترقی پسند تحریک اورجدیدیت سے متاثرہ رسائل کے علاوہ کچھ رسالے ایسے تھے جو خالصتاً ادب کی خدمت کو بہتر تصور کرتے تھے۔ ان میں سرکاری رسائل، نیادور، آجکل، ایوان اردو اور کتاب نما وشاعر قابل ذکر ہیں۔ اردو کے ادبی رسائل نے مختلف موضوعات کو موضوع سخن بناتے ہوئے ادب کے فروغ میں اہم کردارادا کیا ہے۔ رسائل ذرائع ترسیل وابلاغ کا بہتر وسیلہ ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین کو ایک صحت مند تفریح مہیا کرانے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔

کسی زبان کے فروغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس زبان میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اخبارات اوررسائل شائع ہوں اوراپنے معیاری مضامین اوراعلیٰ درجے کی تخلیقات کے ذریعہ ادب اورصحافت دونوں کا فروغ کریں۔ رسائل نے جہاں صحافت کی ترویج وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا وہیں ان رسائل نے زبان وادب کے نمایاں فروغ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ رسائل وجرائد بھی اخبارات کی طرح ہی معاشرے کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ اخبارات میں جہاں سیاست اور روز مرہ کی خبروں کو موضوع بنایا جاتا ہے وہیں رسائل میں ان خبروں پر تجزیے، عصری حالات وصورتِ حال سے متاثرہ ادب پیش کیا جاتا ہے اور قاری کی فکر کو کارآمد بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قران السعدین اور فوائد الناظرین جیسے اردو کے دوراول کے رسائل وجرائد میں بھی سائنس، ادب اور

سیاست سے متعلق تخلیقات شائع کی جاتی تھیں۔ آغاز سے ہی صحافت کا مقصد محض خبروں کی ترسیل نہ رہ کر خبروں کے اثرات اور متعلقہ صورتِ حال سے قاری کو واقف کرانا رہا ہے۔ اس کے علاوہ صحافت نے تحریکات، رجحانات اور نظریات کو بھی عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ادبی صحافت نے عوام میں بیداری لانے، قاری میں ادب کی دلچسپی پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اردو کی ادبی صحافت بہت سارے مسائل ومصائب اور پریشانیوں سے نبردآزما ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ متوازن، درست اور صحافت کے زریں اصولوں کی پاسداری کرتی نظر آتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج اردو صحافت خصوصاً ادبی صحافت مستحکم اور منظم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ادبی صحافت کم وسائل، مالی پریشانیوں اور کم سرمایے کے باوجود جس طرح آزاد ہندوستان میں علم وادب کی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے وہ ادبی صحافت کی قناعت، رواداری اور جہد مسلسل کا ثبوت ہے۔

آزادی کے بعد اردو صحافت اور اردو زبان کو محض اقلیتوں تک محدود کردیا گیا۔ ہندوستان کے اقلیتی طبقے کی حالت آج اکیسویں صدی میں بھی بہتر نہیں ہے۔ اس طبقے کی زبان اور صحافت پھر کس طرح کامیاب کہی جاسکتی ہے۔ آج ترقی اور کامیابی نے ہندوستان کو ایک عظیم ملک میں تبدیل کردیا ہے لیکن اردو آبادی آج بھی ترقی اور کامیابی سے دور ہے۔ اردو کے ساتھ جس طرح کا سوتیلا برتاؤ کیا گیا ہے اس سے نہ صرف اردو زبان بلکہ اردو پڑھنے والے بھی متاثر ہوئے ہیں اور اردو صحافت بھی ایسی ناگفتہ بہ صورتِ حال میں مختلف نشیب وفراز سے گزرتی رہی ہے۔

گزشتہ 60 برسوں میں مختلف علوم وفنون نے ترقی کی بے شمار منزلیں طے کی ہیں۔ تاریخ، اقتصادیات، رقص وموسیقی، سیاست، سماجیات، سائنس کے دائرے بڑھ گئے ہیں اور ان موضوعات اور شعبوں میں لگاتار فروغ ہورہا ہے۔ نئی نئی ایجادات اور نئی تحقیقات نے ترقی اور کامیابی کے نئے دریچے کھولے ہیں۔ دنیا کی ہر لمحہ تبدیل ہوتی ہوئی صورتِ حال، طاقت اور ترقی کی جنگ، حکومت اور عوام کے درمیان اختلافات اور سارے جہاں میں ہر لحظہ تغیر ہوتے ڈھیروں حادثات وواقعات نے لوگوں کی سوچ کا دائرہ تبدیل کردیا ہے۔

فنون لطیفہ کے معنی تبدیل ہوگئے ہیں۔ اب جدید ٹکنالوجی نے ان کی حقیقی پہچان کوختم کردیا ہے۔ آج فن اور فنکار لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور لوگوں کا نظریہ یکسر بدل چکا ہے۔ آرٹ، رقص، موسیقی، فلم،تھیٹر اور دوسری تفریحات کی سمت لوگ زیادہ سے زیادہ متوجہ ہورہے ہیں۔ ان سارے تغیرات کے پس منظر میں اگر ہم ادبی صحافت کا مطالعہ کریں تو ہمیں افسوس ہوگا کہ ہم بہت پیچھے ہیں۔ آج طباعت اور اشاعت میں بھلے ہی آسانیاں ہوگئی ہوں لیکن ہم آج سے 50 سال پہلے جہاں تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ نئی ضروریات اور نئے وسائل کو ہم نے بہت زیادہ قبول نہیں کیا ہے۔ ہم آج بھی روایتی اور پرانی روش پر عمل پیرا ہیں جبکہ ہمیں نئی روشنی کو اپنانا چاہیے۔ ہمیں زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہیے۔ رسائل کے معیار میں تبدیلی کرکے اس میں موجودہ حالات کی مناسبت سے چیزیں شائع کرنی چاہئیں۔ موضوعات کی یکسانیت اور بوریت کوختم کرنا چاہیے۔ جن رسائل نے ان باتوں پرتوجہ دی ہے، اس دگرگوں صورتِ حال میں بھی وہ کسی حدتک کامیاب ہیں۔ رسائل کے ذریعے قارئین کی فکر تبھی متاثر ہوسکے گی جب رسائل قاری کی پسند اور ناپسند کو دھیان میں رکھیں گے۔

آزادی کے بعد کی ادبی صحافت نے جس طرح کی جرأت وہمت کا مظاہر کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ادبی صحافت نے ادب کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبوں پر بھی یکساں نقوش مرتب کیے ہیں۔ گزشتہ ساٹھ برسوں کی مدت میں ان رسائل نے مختلف موضوعات پر مبنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ آج اردو میں بھی مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہورہے ہیں۔ اردو زبان میں خواتین، بچوں، اور طلبا کے لیے علاحدہ علاحدہ رسائل شائع ہورہے ہیں۔ ان کے علاوہ حالات حاضرہ، سماجی مسائل، تعلیم وتربیت، فلم اور ٹی وی۔ اسلامی ادب اور خالصتاً ادبی نگارشات پر مبنی رسائل بھی موجود ہیں۔ آزادی کے بعد کے اردو رسائل میں جہاں آجکل، نیا دوراور ایوان اردو جیسے سرکاری رسالوں نے اردو سرکاری اسکیموں، مختلف ترقیاتی پروگراموں کی تشہیر کرتے ہوئے ادب اور زبان کی ہرممکن خدمت کی ہے اور ادب کے ساتھ دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے جڑی عظیم شخصیتوں اور دیگر سماجی موضوعات پر مبنی

خصوصی نمبرات شائع کیے۔ وہیں سب رس نے دکنی ادب کے فروغ اور اعلیٰ درجے کی تحقیق وتنقید کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ممبئی سے شائع ہونے والا شاعر اس معاملے میں قابل ذکر ہے کہ اس رسالے نے اپنی دلکش، اچھوتی تحریروں کے ذریعے اردو کی نئی بستیوں اور غیر مما لک میں اردو کی صورتِ حال کو بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ابھی شائع ہورہے ادبی رسائل میں اردو کا یہ سب سے عمر دراز رسالہ ہے۔ ماہنامہ اردو ادب نے بھی صحت مند ادب کے فروغ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی مخصوص روش پر قائم رہتے ہوئے اسلم پرویز کی ادارت میں کامیابی وکامرانی کی منزلیں طے کررہا ہے۔ کتاب نما نے مہمان مدیر کا کالم شروع کیا اور ادب میں کسی بحث اوراختلاف سے بچتے ہوئے خالصتاً اردو ادب کی خدمت کو اپنا مقصد اور نصب العین بنایا۔ یہ رسالہ آج بھی جاری ہے۔ اپنے چھوٹے سے خوبصورت گٹ اَپ میں یہ رسالہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے دریا کوزے میں بند ہوگیا ہو۔ اردو ادب کے عظیم نمبروں اور بہترین تحقیقی اور دستاویزی نمبروں کے لیے یہ رسالہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا شب خون جدیدیت کے عہد کی شروعات تھا اور 40 برسوں کے ایک طویل عرصے میں اس رسالے کی خدمات کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اپنی طرز کا یہ واحد رسالہ تھا جس نے کوئی خاص نمبر بھی شائع نہیں کیا اور نہ ہی اداریہ شائع ہوا لیکن اس کے باوجود نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے شب خون سے اصلاح پائی اور شب خون ہی کے ذریعے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ زبیر رضوی کا ذہن جدید سب سے نیا رسالہ ہوتے ہوئے بھی آج تمام رسائل میں منفرد ہے۔ ادب، آرٹ اور کلچر کے ترجمان اس رسالے میں آج وہ سب کچھ شائع ہوتا ہے جو ایک کامیاب رسالے کے لیے ضروری ہے۔ زبیر رضوی کو صحافت کا ایک طویل تجربہ ہے اور وہ خود بھی ایک بہترین شاعر ہیں۔ اس لیے انھوں نے اردو کی ادبی صحافت میں ذہن جدید کے ذریعے صرف ایک رسالہ نہ پیش کرتے ہوئے اردوزبان میں ایسی تخلیقات پیش کرنے کی کوشش کی جو ذہن جدید سے قبل اردو میں شاذ ونادر ہی شائع ہوتی تھیں۔ ذہن جدید میں تھیٹر، فلم وموسیقی، رقص کے ساتھ ساتھ غیر ملکی ادب اورعالمی

منظرنامے پر مبنی نگارشات شائع ہوتی ہیں جو اس رسالے کی شناخت ہے۔

گزشتہ 60 برسوں کی ادبی صحافت کے مطالعے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے اردو کے رسائل آج بھی کامیاب ہیں۔ اردو کی ادبی صحافت کامیابی کی منزل طے کر رہی ہے لیکن اردو اداروں اوراردو سے جڑے احباب کو ایک ساتھ مل کر اسے اور بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے اور جدید تقاضوں اور نئے رجحانات کو اپناتے ہوئے اردو رسائل کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی سعی کرنی چاہیے۔

ضمیمہ

(اردو کے اہم رسائل و جرائد : آغاز سے موجودہ دور تک)

نام رسالہ		مقام اشاعت	سنہ اجرا	مدیر/مالک/مہتمم
خیرخواہ ہند		مرزا پور	1837	آرسی ماتھر
قران السعدین	ہفتہ وار	دہلی	1845	پنڈت دھرم نارائن
فوائد الناظرین	پندرہ روزہ	دہلی	1845	ماسٹر رام چندر
کریم الاخبار	ہفتہ وار	دہلی	1845	مولوی کریم الدین
گل رعنا	ماہانہ	دہلی	1845	مولوی کریم الدین
محبّ ہند	ماہانہ	دہلی	ستمبر 1847	ماسٹر رام چندر
مفید ہند	پندرہ روزہ	دہلی	اپریل 1848	منشی حسینی، پنڈت اجودھیا پرشاد
معیار الشعرا		آگرہ	نومبر 1848	مولوی ابوالحسن
ہمائے بے بہا	پندرہ روزہ	لاہور	جنوری 1853	منشی دیوان چند
معلم العملہ			جنوری 1855	منشی لالہ سکھ لال، نور ابصار
خورشید پنجاب		لاہور	جنوری 1856	ہرسکھ رائے

نورعلیٰ نور		سیالکوٹ	جنوری 1856	منشی دیوان چند
مفید خلائق			دسمبر 1856	منشی شیونارائن
معدن القرنین		آگرہ	1856	سید حسین علوی
چشمہ خورشید	پندرہ روزہ	سیالکوٹ	1857	منشی دیوان چند
تاریخ بغاوت ہند	ماہانہ	آگرہ	جولائی 1859	سرجن مکند لال
انجمن پنجاب		لاہور	1865	
سائنٹفک سوسائٹی	ہفتہ وار	علی گڑھ،	مارچ 1866	سرسید احمد خان
انجمن فیض عام	ماہانہ	گوجرانوالہ	جون 1866	منشی دیوان چند
کوہ طور		گوجرانوالہ	دسمبر 1866	منشی دیوان چند
تہذیب الاخلاق		علی گڑھ	دسمبر 1870	سرسید احمد خاں
انجمن مناظرہ			مئی 1871	نذیر علی/ میر نصیر علی
مراسلہ کشمیر	ماہانہ		1872	مطبع نول کشور
مرقع تہذیب		لکھنؤ	اکتوبر 1873	مطبع نول کشور، تہذیب لکھنؤ
انجمن رفاہ عام راجپوتانہ	سہ ماہی	اجمیر	1873	پنڈت بھاگ رام
غزل الفوائد	ماہانہ	حیدرآباد دکن	مئی 1874	سید حسین بلگرامی/ مسیح الزماں
گنجینہ قانون	ماہانہ	لاہور	جولائی 1874	
گلدستہ بدایوں	ماہانہ	بدایوں	دسمبر 1874	
گلدستہ شعرا	ماہانہ	لکھنؤ	1874	مولوی فتح محمد
ہندو بندھو	ماہانہ	لاہور	اپریل 1875	پنڈت شیونارائن اگنی ہوتری
محافظ	پندرہ روزہ	بنگلور	اپریل 1875	عبدالمجیب
انجمن اسلام	ماہانہ	لکھنؤ	1875	انجمن اسلام لکھنؤ
انجمن تہذیب	سہ ماہی	کانپور	اکتوبر 1875	حافظ عبداللہ بلگرامی/مطبع نظامی

مراۃ الہند	ماہانہ	لکھنؤ	اکتوبر 1875	پنڈت کشن نارائن/مطبع بہار کشمیر
اودھ پنچ	ماہانہ	لکھنؤ	1877	منشی سجاد حسین
خدابخش لائبریری	سہ ماہی	پٹنہ	1877	عابد رضا بیدار
حافظ صحت		لاہور	فروری 1878	
تیرھویں صدی	ماہانہ	آگرہ	اکتوبر1878	میر ناصر علی/ رحیم اللہ صابری
اشاعت السنہ	ماہانہ	لاہور	1978	
آئینہ ریاضی	ماہانہ	شاہجہاں پور	جنوری 1879	
تیرھویں صدی	ماہانہ	آگرہ	اکتوبر 1879	میر ناصر علی/ رحیم اللہ صابری
ترغیب	ماہانہ	بنگلور	1881	
دلسوز	ماہانہ	بنگلور	1881	قادر شریف صابر
زمانہ	ماہانہ	آگرہ	نومبر 1983	خواجہ یوسف علی
فلاسفر	ماہانہ	آگرہ	جنوری 1884	
مرقع نگار	ماہانہ	لکھنؤ	فروری 1884	عاشق حسین عاشق/مرتضیٰ عاشق
معلم ہند	ماہانہ	لاہور	جولائی 1884	محمد حسن احسن
چمنستان سخن	ماہانہ	کانپور	اکتوبر 1884	
پنجاب لوکل سلف گزٹ		گوجرانوالہ	نومبر 1884	
انتخاب	ماہانہ	لکھنؤ	نومبر 1884	
انجمن حمایت الاسلام	ماہانہ	لاہور	1884	
شمع سخن		بنگلور	1884	
دلگداز	ماہانہ	لکھنؤ	جنوری 1887	عبدالحلیم شرر
محشر		لکھنؤ		عبدالحلیم شرر
مہذب		لکھنؤ	1890	عبدالحلیم شرر
عروج بہار	ماہانہ	بمبئی	1894	سید اسحاق حسن شرر مارہروی

گلدستہ سخن	ماہانہ	لدھیانہ	مئی 1895	
مخبر دکنی	ماہانہ		جون 1895	
گلدستہ مداح النبی	ماہانہ	روہتک	1895	
انتخاب لاجواب		لاہور	1895	
گل رعنا	ماہانہ	بھوپال	1895	
خدنگ نظر	ماہانہ	لکھنؤ	ستمبر 1896	
پروانہ	ماہانہ	میرٹھ	اکتوبر 1896	
دبدبہ آصفی	ماہانہ	حیدرآباد	1898	رتن ناتھ سرشار
معارف	ماہانہ	علی گڑھ	جولائی 1898	وحیدالدین سلیم
تذکرہ القرآن	ماہانہ	پٹیالہ	دسمبر 1898	
تہذیب نسواں	ہفت روزہ	لاہور	1898	سید ممتاز علی
ادیب	ماہانہ	فیروزآباد	جنوری 1899	سید اکبر علی اکبرآبادی
شرارہ	پندرہ روزہ	مرادآباد	جنوری 1899	
آریہ مسافر	ماہانہ	جالندھر	اکتوبر 1899	
افسر	ماہانہ	حیدرآباد	1899	مولوی عبدالحق
خادم الاسلام	ماہانہ	کلکتہ	ستمبر 1900	نظامی پریس کلکتہ
گلدستہ نسیم	ماہانہ	دہلی	1900	محمد عبدالستار اختر/ مفتی قربان علی بسمل
مخزن	ماہانہ	لاہور	اپریل 1901	شیخ عبدالقادر
زمانہ	ماہانہ	کانپور/ بریلی	فروری 1903	منشی دیانرائن نگم
اردوئے معلیٰ	ماہانہ	علی گڑھ	جولائی 1903	حسرت موہانی/مطبع فیض عام
عصر جدید	ماہانہ	لکھنؤ/ میرٹھ	1903	خواجہ غلام الثقلین
علی گڑھ منتھلی	ماہانہ	علی گڑھ	1903	چودھری خوشی محمد ناظر

عصمت	ماہانہ	دہلی	جون 1908	شیخ محمد اکرام، علامہ راشد الخیری
الناظر	ماہانہ	لکھنؤ	1909	ظفر الملک علوی، وصی الحسن علوی
ادیب	ماہانہ	الہ آباد	جنوری 1910	نوبت رائے نظر
آفتاب اردو	ماہانہ	لدھیانہ	1911	مولانا تاجور نجیب آبادی
نقاد	ماہانہ	آگرہ	1912	شاہ نظام الدین دلگیر
فانوس خیال	ماہانہ	پٹھان کوٹ	جون 1914	ابوالرشید عبدالمجید سالک بٹالوی
عبرت	ماہانہ	نجیب آباد	جنوری 1916	
آبِ حیات	ماہانہ	میرٹھ	جنوری 1916	
معارف	ماہانہ	اعظم گڑھ	جولائی 1916	علامہ سید سلیمان ندوی
کہکشاں	ماہانہ	لاہور	ستمبر 1918	
اردو	سہ ماہی	دہلی/ اورنگ آباد/ کراچی	جنوری 1921	مولوی عبدالحق (علی گڑھ)
ہمایوں	ماہانہ	لاہور	جنوری 1922	میاں بشیر احمد
ہزار داستان	ماہانہ	لاہور	1922	
نگار	ماہانہ	لکھنؤ	1922	نیاز فتح پوری
جامعہ	ماہانہ	دہلی/ علی گڑھ	جنوری 1923	جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سوسائٹی/ نور الرحمٰن
بہارستان	ماہانہ	لاہور	مئی 1924	اختر شیرانی
نیرنگ خیال	ماہانہ	لاہور	جولائی 1924	محمد یوسف حسن
عالمگیر	ماہانہ	لاہور	1924	حافظ محمد عالم
نقاد	ماہانہ	لاہور	1925	کوثر لکھنوی
شمع	ماہانہ	آگرہ	جنوری 1925	

اورینٹل کالج میگزین	ماہانہ	لاہور	فروری 1925	
پیام تعلیم	ماہانہ	دہلی	1926	
اقتباس	ماہانہ	ممبئی	1926	شبر بدایونی
بیسویں صدی	ماہانہ	دہلی	1926	خوشتر گرامی
شیرازہ	ماہانہ	سری نگر	1926	محمد یوسف ٹینگ
ادبی دنیا	ماہانہ	لاہور	مئی 1929	تاجور نجیب آبادی
ساقی	ماہانہ	دہلی	جنوری 1930	شاہد احمد دہلوی
ادیب	ماہانہ	پشاور	جنوری 1930	مرزا اشرف بیگ
شاعر	پندرہ روزہ/ ماہانہ	آگرہ/ممبئی	فروری 1930/ جنوری 1932	سیماب اکبرآبادی
خیالستان	ماہانہ	لاہور	1930	اختر شیرانی
ندیم	ماہانہ	گیا	1931	انجم مانپوری
کارواں	سالانہ	لاہور	1933	پروفیسر تاثیر
رومان	ماہانہ	لاہور	1933	اختر شیرانی
برہان		دہلی	1933	
ادب لطیف	ماہانہ	لاہور	1935	چودھری برکت علی
سب رس	ماہانہ	حیدرآباد	جنوری 1938	محی الدین زور کشمیری
نیا ادب	ماہانہ	ممبئی	1939	کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، کیفی اعظمی
ادیب	ماہانہ	دہلی	1941	سید محمد ارتضٰی وحیدی
نن پرون آجکل	ماہانہ/ پندرہ روزہ	دہلی	مئی جون 1941	آغا محمد یعقوب دواشی
افکار	ماہانہ	بھوپال	اپریل 1945	صہبا لکھنوی/ رشدی بھوپالی

سویرا	ماہانہ	لاہور	1946	فکرتونسوی، احمد ندیم قاسمی، چودھری نذیر احمد
الحسنات	ماہانہ	رامپور	جنوری 1947	
شاہراہ	ماہانہ	دہلی	1949	ساحر، رام پرکاش اشک
نوائے ادب	سہ ماہی	ممبئی	جنوری 1950	ظہیرالدین مدنی
ہماری زبان	پندرہ روزہ	علی گڑھ/دہلی	جنوری 1950	آل احمد سرور
اردو ادب	سہ ماہی	علی گڑھ/دہلی	جولائی 1950	آل احمد سرور
تحریک	ماہانہ	دہلی	مارچ 1953	گوپال متل
سہیل	ماہانہ	گیا/کولکاتہ	1939/1954	بسمل سنسہاروی/ادریس سنسہاروی
نیادور/اطلاعات (ہماری آواز)	ماہانہ	لکھنؤ	اپریل 1955	علی جواد زیدی
پاسبان	ماہانہ	چنڈی گڑھ	1956	رنبیر سنگھ
سوغات	سہ ماہی	بنگلور	جنوری 1959	محمود ایاز
کتاب نما	ماہانہ	دہلی	جون 1960	ریحان احمد عباسی/ غلام ربانی تاباں
اردوئے معلیٰ	ماہانہ	دہلی	1960	خواجہ احمد فاروقی
کتاب	ماہانہ	لکھنؤ	دسمبر 1962	عابد سہیل
آہنگ	ماہانہ	گیا	1963	کلام حیدر
شب خون	ماہانہ	الٰہ آباد	جون 1966	جمیلہ فاروقی/سید اعجاز حسین
شگوفہ	ماہانہ	حیدرآباد	1968	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
ہندوستانی زبان	سہ ماہی	ممبئی	اکتوبر 1969	عبدالستار دلوی
عصری ادب	سہ ماہی	دہلی	جنوری 1970	محمد حسن/سید بہاء الدین
شعر وحکمت	سہ ماہی	حیدرآباد	1970	اختر جہاں/مغنی تبسم/شہریار

گونج	ماہانہ	نظام آباد	1973	جمیل نظام آبادی
پروانہ دکن	ماہانہ	حیدرآباد	1973	شفیع اقبال
عصری آگہی	ماہانہ	دہلی		قمر رئیس
فن اور شخصیت	ششماہی	بمبئی	1975	صابردت/ظہیر علی
ادبی چوپال	سہ ماہی	لکھنؤ	جولائی 1976	انور ندیم
معیار	سہ ماہی	دہلی	1977	شاہد ماہلی/نشاط شاہد
تناظر	سہ ماہی	دہلی	ستمبر 1977	بلراج ورما
اسباق	ماہانہ	پونے	1980	نذیر فتح پوری
اکادمی	دو ماہی	لکھنؤ	1980	
یوجنا (اردو)	ماہانہ	دہلی	اپریل 1981	
تحقیقات اسلامی	سہ ماہی	علی گڑھ	جنوری 1982	جلال الدین عمری
بازیافت	سہ ماہی	سری نگر	1983	
انشاء	دوماہی/ ماہانہ	کلکتہ	1985	ف س اعجاز
عالمی اردو ادب	سالانہ	دہلی	1985	نند کشور وکرم
گلبن	دو ماہی	احمد آباد/لکھنؤ	1986	ثریاہاشمی/سید ظفر ہاشمی
ایوان اردو	ماہانہ	دہلی	مئی 1987	مخمور سعیدی/شریف الحسن نقوی
امنگ	ماہانہ	دہلی	1987	مخمور سعیدی/شریف الحسن نقوی
اخبار نوجواں	ماہانہ	دہلی	1987	سید عابد انیس
تکمیل	سہ ماہی	بھیونڈی	جنوری 1988	اصغر حسین قریشی/مظہر سلیم
پیش رو	سہ ماہی	دہلی	جون 1988	انور پاشا/ ابرار رحمانی/ مظہر مہدی/ توحید اختر
فکر و تحقیق	شش ماہی/ سہ ماہی	دہلی	جنوری 1989	فہمیدہ بیگم/ حمیداللہ بھٹ جنوری (1997)، خواجہ اکرام الدین (2012)

ذہن جدید	سہ ماہی	دہلی	ستمبر 1990	زبیر رضوی/ جمشید جہاں
نقوش عالم	ماہانہ	بنگلور	1990	ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی/ ڈاکٹر محمد فاروق اعظم قاسمی
نیا سفر		دہلی/ الہ آباد	جنوری 1993	قمر رئیس
اچھا ساتھی	ماہانہ	بجنور	نومبر 1993	سراج الدین ندوی
رنگ و بو	ماہانہ	حیدر آباد	1994	مجتبیٰ فہیم
اردو بک ریویو	ماہانہ/ سہ ماہی	دہلی	1995	محمد عارف اقبال
رنگ	سہ ماہی	دھنباد	1996	شان بھارتی
گل بوٹے	ماہانہ	ممبئی	1996	فاروق سید
خوشبو کا سفر	ماہانہ	حیدرآباد	دسمبر 1996	صلاح الدین نیر
اردو دنیا	سہ ماہی/ ماہانہ	دہلی	جولائی 1997	حمیداللہ بھٹ، خواجہ محمد اکرام الدین (2012)
بزم ادب	ماہانہ	علی گڑھ	1997	
اردو چینل	سہ ماہی	ممبئی	1997	قمر صدیقی، عبید اعظم
عاکف کی محفل	ماہانہ	دہلی	1997	ایس ایم ظفر علی
یہ صبح	سہ ماہی	دہلی	جنوری 1998	سید نوشاد علی/ ارتضیٰ کریم
جہات	سہ ماہی	سری نگر	1998	حامدی کاشمیری
مژگاں	سہ ماہی	کلکتہ	1999	محمد نوشاد مومن
مجلّہ اردو کونسل	سالانہ	چنچوڑ	1999	قاسم زبیری
استعارہ	سہ ماہی	دہلی	جولائی 2000	صلاح الدین پرویز/ حقانی القاسمی
تمثیلِ نو	سہ ماہی	دربھنگہ	2000	ڈاکٹر امام اعظم
طوبیٰ	ماہانہ	چمپارن	2001	محمد راشد المدنی

مباحثہ	دو ماہی	پٹنہ	2001	وہاب اشرفی
کل اور آج کے فنکار	ماہانہ	گوالیار	2002	قمرالدین برتر
امکان	ماہانہ	لکھنؤ	نومبر 2002	ملک زادہ منظور
ترکش	سہ ماہی	کلکتہ	2003	فراغ روہوی
جہان کتب	ماہانہ	دہلی	جولائی 2004	محمد عارف اقبال
سبق اردو	ماہانہ	گوپی گنج / بھدوہی	جولائی 2004	دانش الٰہ آبادی
اعتراف	سہ ماہی	بمبئی	اپریل 2005	وقار قادری
ظرافت	دو ماہی	بنگلور	2005	عظیم الدین عظیم
رنگ و بو	ماہانہ	حیدرآباد		مجتبیٰ فہیم
ادب ساز	سہ ماہی	دہلی	اپریل 2006	نصرت ظہیر
جہانِ غالب	شش ماہی	دہلی	مئی 2006	
نئی کتاب	سہ ماہی	دہلی	مارچ 2007	شاہد علی خاں
تحریرِ نو	ماہانہ	ممبئی	2007	ظہیر انصاری
اثبات	سہ ماہی	ممبئی	2008	اشعر نجمی
جہان اردو	سہ ماہی	دربھنگہ	2011	ڈاکٹر مشتاق احمد
آمد	سہ ماہی	پٹنہ	2011	خورشید اکبر، اسرار دانش
ادیب انٹرنیشنل		لدھیانہ	2011	ڈاکٹر کیول دھیر

کتابیات

1. ابرار رحمانی: جنگ آزادی کا درخشاں باب 1857 (مرتب) پبلی کیشن ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، نئی دہلی 2007
2. اردو اکادمی کا پچیس سالہ سفر، دہلی اردو اکادمی، سی پی او بلڈنگ، کشمیری گیٹ دہلی
3. احتشام حسین سید: ادب اور سماج، کتب پبلشرز، بمبئی 1948
4. احتشام حسین سید: اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1983
5. اصغر عباس: سرسید کی صحافت، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی 1975
6. امداد صابری: تاریخ صحافت اردو (پانچ جلدیں)، جدید پرنٹنگ پریس، چوڑی والان دہلی 1953
7. افتخار کھوکھر محمد: تاریخ صحافت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2007
8. افتخار کھوکھر محمد: تاریخ صحافت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2007
9. امداد صابری: روح صحافت، مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی 1968
10. امداد صابری: اردو کے اخبار نویس... صابر اکیڈمی چوڑی والان، دہلی 1973
11. امیر حسن نورانی سید: سوانح منشی نول کشور، خدا بخش اورینٹل پبلک، لائبریری، پٹنہ 1995

12. انوار احمد: مولانا آزاد کی ادبی صحافت (الہلال اور البلاغ کے خصوصی حوالے سے)، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 2006
13. انور دہلوی: (مرتبہ) اردو صحافت، دہلی اردو اکادمی، دہلی 1987
14. انور صدیقی: (مرتبہ) انتخاب مضامین سرسید، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1972
15. انیس صدیقی: کرناٹک میں اردو صحافت، افلاک پبلی کیشنز، بلال آباد، گلبرگہ، کرناٹک، 2003
16. الہاشمی چودھری رحم علی: فن صحافت، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی
17. انوارالدین محمد: حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل، مکتبہ شاداب، ریڈ ہلز، حیدرآباد، 1997
18. بیدار عابد رضا: اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار، رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، 1949
19. پرولکرا ے کے: ہندوستان میں چھاپہ خانہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2002
20. پروانہ ردولوی: اردو صحافت کا استغاثہ، حیا پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1994
21. جوشی پی سی: (مرتبہ) انقلاب 1857، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1983
22. جاوید حیات: مبادیات صحافت، مکتبہ آزاد پٹنہ
23. جمیل اختر، اشاریہ آجکل (جلد اول)، اردو اکادمی، دہلی 1988
24. جمیل اختر، اشاریہ آجکل، انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن، دہلی 2002
25. حالی الطاف حسین: حیات جاوید، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1990
26. حجازی مسکین علی، اداریہ نویسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، 1991
27. حجازی مسکین علی: صحافتی زبان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1990
28. خاں اطہر مسعود، اشاریہ ماہنامہ نیادور، رامپور رضا لائبریری، رامپور 2010
29. خاں نادر علی: اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1987
30. خورشید الاسلام، اردو ادب آزادی کے بعد، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1973

31. دیوندر اسر: ادب کی آبرو، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دہلی1999
32. راؤایم چلاپتی:صحافت،نیشنل بک ٹرسٹ،انڈیا1987
33. راؤروشن آرا: مجلّاتی صحافت کے اداراتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان،1989
34. سکسینہ رام بابو: تاریخ ادب اردو، راجا رام کمار پریس لکھنؤ، 1952
35. سہیل وحید:صحافتی زبان، اعلیٰ پریس،دہلی1996
36. سلطان محمود حسین سید: اردو نثر کی تاریخ میں سرسید کا مقام،نعمانی پریس، دہلی1977
37. سید ضیاء اللہ: اردو صحافت، ترجمہ وادارت،کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور1994
38. سیدعبدالباری: آزادی کے بعد اردو زبان و ادب،انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی 1998
39. شاہد حسین محمد: ابلاغیات،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی2003
40. شاہد حسین محمد، اظہار عثمانی: (مرتب) اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ،اردو اکادمی دہلی2007
41. شریف الدین: اردو صحافت اور حسرت موہانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2005
42. صالح عبداللہ: اردو صحافت میں اظہار وابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی2006
43. صدیقی حامد اقبال: سیماب اکبرآبادی،ساہتیہ اکیڈمی دہلی 2009
44. صدیقی طارق اقبال،الیکٹرانک میڈیا میں ابھرتے رجحانات، گولڈن پرنٹرس،نئی دہلی 2003
45. ضیاء اللہ کھوکھر:(مرتب)ماہانہ رسائل کے خصوصی شمارے، عبدالمجید کھوکھر یادگار لائبریری، گوجرانوالہ، پاکستان2006
46. عابد سہیل: اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1981
47. عابد صدیقی: ادب اور صحافت، نیرنگ اکیڈمی، حیدرآباد1974
48. عابدہ سمیع الدین: قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان صحافی،انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز،نئی دہلی 2007

49. عبدالسلام خورشید: داستان صحافت، مجلس ترقی ادب لاہور 1963

50. عبدالسلام خورشید: صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور 1963

51. عبدالسلام خورشید: کاروان صحافت، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان 1989

52. عتیق صدیقی محمد: ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ 195

53. عتیق صدیقی محمد: گل کرسٹ اور اس کا عہد، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ 1960

54. عتیق صدیقی محمد: اٹھارہ سو ستاون کے اخبار اور دستاویزیں، مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی 1966

55. عثمانی معین الدین: ادبی معاصرین کا مطالعہ، اقصیٰ آفسیٹ پرنٹرس، مالیگاؤں 2009

56. غضنفر اقبال: اردو بک ریویو کے اداریے اور تجزیے، کاغذ پبلشرز، گلبرگہ، 2006

57. غضنفر اقبال: معنی مضمون، کاغذ پبلشرز، زبیر کالونی، رنگ روڈ، گلبرگہ 2010

58. غلام حیدر: اخبار کی کہانی، ترقی اردو بیورو، دہلی 1980

59. فاروق انصاری، اشاریہ ماہنامہ ایوان اردو، شاہین ایڈورٹائزرس، 423 مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی، 1993

60. فاروقی محبوب الرحمٰن، محمد کاظم، آجکل اور اردو صحافت، پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند 2000

61. فرزانہ خلیل: رسالہ جامعہ کا تنقیدی اشاریہ 1947-1923، تخلیق کار پبلشرز، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی

62. فضل الرحمٰن: اردو انسائیکلوپیڈیا، جلد سوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1997

63. قادری حامد حسین: داستان تاریخ اردو، عزیزی پریس آگرہ 1957

64. قادری سید احمد: اردو صحافت بہار میں، مکتبہ غوثیہ نیو کریم گنج گیا بہار

65. قادری سید اقبال: رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 2000

66. قاضی عبدالودود: چند اہم اخبارات و رسائل، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، لبرٹی آرٹ پریس، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1993

67. قطب اللہ: مولانا آزاد کا نظریہ صحافت، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1979

68. قیصر شمیم: اردو ادب پر ذرائع ترسیل عامہ کے اثرات، فیمس آفسیٹ پریس، فراش خانہ، دہلی 1989

69. نوشاد عالم محمد: ادبی شناخت، چندو نگر، کراول نگر روڈ، دہلی

70. محمد یونس: انجمن ترقی اردو ہند کی تاریخ و خدمات 1947 تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2008

71. مشتاق احمد: سرسید کی نثری خدمات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2005

72. مشتاق صدف: اردو صحافت (زبان، تکنیک، تناظر)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2010

73. مظہر حسین: علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1993

74. مظہر حسین: مسلم معاشرے کی تشکیل نو (سرسید، نذیر، حالی، اور شبلی کے افکار کا مطالعہ)، فیمس آفسیٹ پریس، دہلی 1996

75. معصوم مراد آبادی: اردو صحافت اور جنگ آزادی، خبردار پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی

76. منظر اعظمی: اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1996

77. نشیط سید یحییٰ: ف س اعجاز، ہشت پہلو فنکار، ثنا پرنٹرس، کلکتہ 2004

78. نفیس بانو: تہذیب الاخلاق تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، آرٹ ایکسپریس وارانسی 2004

79. ندوی نذر الحفیظ: مغربی میڈیا اور اس کے اثرات... دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ 2001

80. نظامی خلیق احمد: سید احمد خاں، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی جون 1971

81. نظامی خلیق احمد: سرسید اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1983

82. نظامی خلیق احمد: سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1993

83. وارثی شعیب رضا: آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1997

84. ہمایوں اشرف (مرتب) اردو صحافت مسائل اور امکانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2006

رسائل

(آغاز سے 2010 تک کی مختلف فائلیں)

ماہنامہ شاعر، ممبئی | ماہنامہ سب رس، حیدرآباد
ماہنامہ آجکل، دہلی | ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ
سہ ماہی اردوادب، دہلی | ماہنامہ کتاب نما، دہلی
ماہنامہ شب خون، الہ آباد | ماہنامہ ایوان اردو، دہلی
سہ ماہی ذہن جدید، دہلی

دیگر رسائل و اخبارات

1. آجکل، پندرہ روزہ، دہلی، یکم جون 1943
2. ادبی چوپال، سہ ماہی، لکھنؤ، جولائی تا دسمبر، 1976
3. اردو بک ریویو، ماہانہ، نئی دہلی، جنوری، فروری، 2006
4. اردو دنیا، سہ ماہی، نئی دہلی، اپریل مئی جون، 1998
5. اردو دنیا، ماہانہ، نئی دہلی، اکتوبر 2009
6. اردوئے معلیٰ، ماہانہ، علی گڑھ، جولائی 1907
7. استعارہ، سہ ماہی، نئی دہلی، اکتوبر، نومبر، دسمبر، 2000
8. امکان، ماہانہ، لکھنؤ، مئی 2003
9. امکان، ماہانہ، لکھنو، دسمبر، جنوری۔ 2009
10. پیش رو، سہ ماہی، نئی دہلی، جون 1988 سے اگست 1988
11. تکمیل، سہ ماہی، بھیونڈی، جنوری۔ 1990
12. تناظر، سہ ماہی، دہلی، مئی 1990 تا جون 1991
13. راشٹریہ سہارا، روزنامہ، نوئیڈا، 30 ستمبر 2008

14. زمانہ، ماہانہ، کانپور، فروری 1938

15. زمانہ، ماہانہ، کانپور، مارچ 1938

16. جامعہ، ماہانہ، دہلی، ستمبر 1992

17. ساقی، ماہانہ، دہلی، جنوری 1937

18. سبق اردو، ماہانہ، بھدوہی، اتر پردیش، جولائی 2004

19. سوغات، سہ ماہی، بنگلور، جولائی1959

20. سیاست(ویب سائٹ)، روزنامہ، حیدرآباد

21. شب خون، ماہانہ، الہ آباد، جون تا دسمبر 2005 آخری شمارہ

22. شگوفہ، ماہانہ، حیدرآباد، مئی 2006

23. عالمی اردو ادب، سالانہ، نئی دہلی، دیوندر اسر نمبر، 1995

24. عصری ادب، سہ ماہی، دہلی، جولائی تا ستمبر1972

25. کتاب، ماہانہ، لکھنؤ، جنوری 1973

26. کتاب، ماہانہ، لکھنؤ، جون1973

27. قومی آواز، روزنامہ، دہلی، اردو بک سیلر و پبلشرز نمبر 1982

28. مباحثہ، پٹنہ، اگست تا دسمبر 2009 ،شمارہ 33

29. معیار، سہ ماہی، نئی دہلی، دسمبر1977

30. نوائے ادب، ماہانہ، بمبئی، جنوری 1950

31. نوائے ادب، ماہانہ، بمبئی، اکتوبر 1950

32. نن پرون اردو ایڈیشن، پندرہ روزہ، دہلی، 10 جون 1942

33. ہما، ماہانہ ،نئی دہلی، اے ایم یو نمبر اگست 1972

34. ہما، ماہانہ، نئی دہلی، تحریک اردو نمبر جنوری 1986

35. یہ صبح، سہ ماہی، نئی دہلی، جنوری تا مارچ 1998 ،شمارہ ایک

ہندی کتابیں

1. این سی پنت، منوج کمار جوشی۔ ہندی پترکاریتا کی روپ ریکھا (حصہ دوم) کنشکا پبلشرز ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی
2. بنسی لال یادو، کہانی آوشکاروں کی، میناکشی پرکاش، اجمیر1992
3. جے کے نٹراجن: بھارتیہ پترکاریتا کا اتہاس، پبلی کیشنز ڈویژن حکومت ہند 2002
4. ڈاکٹر شیو گوپال مشر: وگیان پترکاریتا کے مول سدھانت۔ تکچھ شیلا پرکاش، دریا گنج نئی دہلی2001
5. ڈاکٹر وید پرتاپ ویدک، مرتبہ ہندی پترکاریتا ویویدھ آیام (حصہ اوّل)، ہندی سنٹر، نئی دہلی 1992
6. سدھیش پچوری۔ میڈیا اور ساہتیہ، راج سوریہ پرکاش نئی دہلی
7. شیاما چرن دوبے۔ سنچار اور وکاس۔ پرکاشن وبھاگ بھارت سرکار۔1980

English Book s

1. Joseph R. Dominick,The Dynamix of Mass communication, McGrawhill, New York, 1992.
2. David Wain Wright Journalism Made Simple, Rupa. Paper Back, Darya Ganj, New Delhi
3. M. V. Kamath, M. K. Rustomji, what Journalism is all about, India Book House, Pvt. Ltd. Bombay, 1986.
4. G.S.Bhargava.The Press in India An overview. National Book Trust,India.2005

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اُردو میڈیا

ترتیب : پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات: 350

قیمت : -/118 روپے

منظر نامہ۔ ہوتو تو

مصنف : گلزار

صفحات: 152

قیمت : -/60 روپے

منظر نامہ۔ میرے اپنے

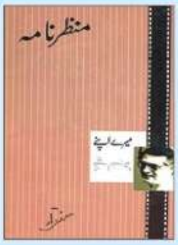

مصنف : گلزار

صفحات: 141

قیمت : -/63 روپے

منظر نامہ۔ خوشبو

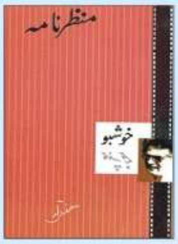

مصنف : گلزار

صفحات: 138

قیمت : -/69 روپے

رہبر اخبار نویسی

مصنف : سیّد اقبال قادری

صفحات: 751

قیمت : -/172 روپے

عوامی ذرایع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف : دیویندر اسّر

صفحات: 172

قیمت : -/56 روپے

₹ 185/-

ISBN: 978-93-5160-068-8

9 789351 600688

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025